علی سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی نظموں میں مزاحمتی اور احتجاجی آہنگ۔ایک تقابلی جائزہ

(تحقیقی مقالہ برائے ڈی۔فل)

نگراں
پروفیسر علی احمد فاطمی
سابق صدر شعبۂ اردو
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

مقالہ نگار
عرشیہ سرفراز
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

شعبۂ اردو

الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

2020

ALI SARDAR JAFRI AUR MAKHDUM MUHIUDDIN KI NAZMO MEIN MUZAHAMATI AUR EHTEJAJI AAHANG: EK TAQUABLI JAIZA

A THESIS SUBMITTED FOR THE DEGREE OF DOCTOR OF PHILOSOPHY (D.Phil) IN THE FACULTY OF ARTS

UNIVERSITY OF ALLAHABAD
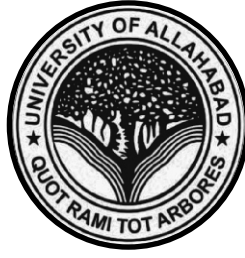
Under the Supervision of :

Prof.ALI AHMAD FATMI

Department of Urdu
University of Allahabad

Submitted By:

ARSHIYA SARFARAZ

RESERCH SCHOLAR

Department of Urdu

University of Allahabad

DEPARTMENT OF URDU

UNIVERSITY OF ALLAHABAD

2020

تلخیص

اس بوالعجب آفاق ورنگ و بو میں متعدد نوعیت کی جاندار شے مثلاً جانور، انسان، پرندے، کیڑے مکوڑے، پیڑ پودے، جراثیم۔ وغیرہ قیام پذیر ہیں۔جس میں سب سے افضل انسان کہا جاتا ہے جس کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا ہے۔انسان کو یہ حیثیت یوں ہی نہیں ملی بلکہ اس کے پیچھے اس کے دیکھنے، سننے، بولنے، سوچنے اور محسوس کرنے کی قوت کارفرما ہے۔ یہی احساس ہی تو ہے جو اسے اس کائنات کی دوسری جاندار قوتوں سے منفرد کرتا ہے۔کسی بھی عام شے کو دیکھ کر اس کے ذہن میں ایسے خیالات ابھرتے ہیں جو مثبت بھی ہوسکتے ہیں اور منفی بھیبی احساس کے سبب اس کے اپنے دلی جذبات بھی رونما ہوتے ہیں۔ یہ جذبات ہی ہیں جو اسے حسّاس بناتے ہیں۔ اسی جذبات واحساسات کے سبب کچھ اضطراب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو بے اطمنانی اور ناآسودگی کے ماحول کی تشکیل کرتی ہے۔اس ماحول سے بہ یک وقت انحراف بھی ہوتا ہے جو اختلاف کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔اور یہی اختلاف آہستہ آہستہ احتجاج کی شکل میں اپنی منزل کی جانب گامزن ہوتا ہے۔اس طرح سے احساس، اضطراب، انحراف، اختلاف اور احتجاج اپنے ارتقائی سفر کو پہنچتے ہیں۔جس کے پس پردہ مزاحمت کارفرما ہوتی ہے۔

’مزاحمت‘ کا ماخذ عربی زبان کا لفظ ’زحمہ‘ ہے جس کے لغوی معنی حریف سے ٹکرانے، یا ’مدافعت‘ کرنے کے ہیں۔انگریزی میں اس کا مابدل Resistance ہے۔مثلاً کسی ناموافق صورت حال سے مطمئن نہ ہونا یا ایک طرح سے اسے Forbid کرنا ہے۔ یہاں مختلف مستند و معتبر لغات کے ذریعے مزاحمت کے مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی جارہی ہے:۔

فرہنگ عامرہ میں مزاحمت کے معنی ’’کسی پر تنگی کرنے کے ہیں‘‘[1] اور فرہنگ آصفیہ میں اس سے مراد ’’تعرض‘ اٹکاؤ‘ ممانعت اور روک ٹوک‘‘ [2] ہے۔

مذکورہ بالا لغات کے ذریعہ مزاحمت کے معنی کافی حد تک واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔مثال کے طور پر جیسے کوئی ایک ملک دوسرے ملک کے معاشی معاملے میں دخل اندازی کرتا ہے جس کے باعث وہاں کے مفاد متاثر ہوتے ہیں تو ان کی دخل اندازی کو منفیانہ طور پر اختیار کرنا مزاحمتی طرز عمل کہلائے گا۔

دوسری جانب ’مزاحمت‘ سے قریب کا لفظ ’احتجاج‘ ہے جس کے لغوی معنی اعتراض‘ یا حجت کرنے کے ہیں۔انگریزی میں اس کا مابدل Protest ہے۔مثلاً(to express One's dissent

---

[1] (فرہنگ عامرہ۔محمد عبداللہ خاں خویشگی ,2011, کتابی دنیا، دہلی۔ص:572)

strongly) کسی نہ موافق صورت حال کے خلاف نا آسودگی کا اظہار کرنا یا اس پر معترض ہونا ہے۔لفظ احتجاج کی وضاحت کے لئے مختلف لغات کے حوالے مندرجہ ذیل ہیں۔فرہنگ عامرہ میں ’احتجاج‘ کے معنی ’’حجت‘‘ [1] کرنے کے ہیں۔

مزاحمت محض انکار یا ممانعت تک محدود نہیں ہے نہ ہی اس کا عنصر نفی تک محدود ہے یہ کیفیت وقت کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔جب مزاحمت نا قابل برداشت ہو جاتی ہے تو یہ دوسری شکل اختیار کر لیتی ہے جس کا دارو مدار احتجاج پر مبنی ہوتا ہے۔یہی احتجاج آگے چل کر انقلاب کا ابتدائیہ بنتا ہے۔پھر یہ صورتیں مسلسل آگے بڑھتی جاتی ہیں۔ان تینوں کے درمیان یہی فرق ہے کہ مزاحمت سے لے کر احتجاج اور پھر احتجاج سے لے کر انقلاب تک ارتقاء کی صورت بنتی جاتی ہے۔ان کے ارتقائی سفر میں آہستہ آہستہ شدت پسندی رونما ہوتی جاتی ہے اور یہ صورتیں اس وقت نشونما پاتی ہیں جب ٹکراؤ کی جرات اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ویسے تو انقلاب کے معنی تبدیلی کے ہیں خواہ وہ سماجی، سیاسی، معاشی و معاشرتی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں مگر یہاں اسے ردعمل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور اسی انحراف کے ساتھ ساتھ تبدیلی کے اثرات بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔انقلاب اور احتجاج میں نمایاں فرق یہ ہے کہ انقلاب کے لئے عمل پیہم ضروری ہے اور انقلاب کا تعلق باقاعدہ کسی تحریک سے ہوتا ہے جس کے اغراض و مقاصد پہلے سے ہی طے ہوتے ہیں وہ باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت موجودہ سماج کی برائیوں کو مکمل طور پر ختم کر کے سماج کی تشکیل نو کرتا ہے جب کہ احتجاج کسی بھی سماجی نظام یا تحریک سے نا آسودگی کا اظہار ہوسکتا ہے جس میں ایک طرح کی ذہنی بغاوت ہوتی ہے۔سیاسی طور پر انقلاب کا تعلق کسی تحریک سے وابستہ ہے۔جیسے انقلاب روس، انقلاب ۱۸۵۷ء جس کے مختلف اسباب تھے۔ہر انقلاب کے پیچھے کچھ نہ کچھ نصب العین ہوتا ہے جبکہ احتجاج صرف اس سے نبرد آزما ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔

ہر دور میں مزاحمت و احتجاج اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد رہے ہیں ہاں اتنا ضرور ہے کہ مزاحمت و احتجاج کی اتنی ہی قسمیں ہیں جتنی معاشرے میں جبر کی۔یہ جبر و استبداد کسی کے بھی خلاف ہوسکتا ہے خواہ وہ سماجی نظام، سیاسی بدعنوانیوں، معاشی بدحالی، مذہبی انتہا پسندی، تہذیبی و ثقافتی رویے، تاریخی و ادبی جبر کیوں نہ ہو۔زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کی نوعیت الگ الگ رہی ہے اور ہر شعبے کی اپنی ایک

---

[1] (فرہنگ عامرہ۔محمد عبداللہ خاں خویشگی۔2011۔کتابی دنیا، دہلی ص۔ 18)

اہمیت ہے۔

ادب معاشرے کا وسیلۂ اظہار ہے۔ ہر دور کے ادب میں اس زمانے اوراس معاشرے کے خدوخال نظر آتے ہیں اوراس کا ایک مقصد بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے خیالات کے ذریعے اس ماحول کو پیش کرنا چاہتا ہے جن سے وہ ناآسودہ ہے اور قارئین کو اس حالات سے واقف کرانے کی کوشش وسعی کرتا ہے۔ ادیب کی ایک حیثیت معاشرے کے ایک فرد اور سماجی کارندے کی بھی ہوتی ہے لہٰذا ان کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ گردوپیش کے سماجی وسیاسی تحریکیں اور غیر مساوی حقوق کی جانب توجہ دیں جس کے باعث جبر واستبداد ظلم واستحصال کے خلاف ادب کو ذریعہ بنا کر مزاحمت واحتجاج کا علم بلند کریں۔ اس دور میں فارسی شعری روایت سے مغلوب ادبی ماحول میں ہم ایک ایسے شاعر کی آواز سنتے ہیں جو فارسی ادب کی سنجیدگی اور لطافتوں کے خلاف احتجاج کرتا ہوا نظر آتا ہے اور وہ ہے جعفر زٹلی جو ہندوستانی اشرافیہ کے لئے اپنی ہجویات کے باعث ایک دہشت بن گیا تھا۔ اس طرح سے اس نے اس زوال پزیر معاشرت کا ایک خاکہ پیش کرنے کی جرات کی جو آئندہ نسلوں کے لئے مشعل ہدایت بنی اور ہجویہ شاعری کا ایک دور شروع ہو گیا جس نے اس وقت کے سماجی، سیاسی پہلوؤں کو شاعری کے ذریعہ پیش کرنے کی ہمت دکھائی۔ آگے چل کر میرؔ اور سوداؔ نے اس روایت کو قائم رکھتے ہوئے شکایت زمانہ کو شہر آشوب کی شکل میں پیش کیا۔ شاکر ناجی، شاہ حاتم، اور دوسرے کئی شعراء نے بھی شہر آشوب کہے جن میں اس دور کی بدحالی اور زوال کی واضح تصویریں نظر آتی ہیں۔ انقلاب ۱۸۵۷ سے پہلے آگرہ میں نظیر اکبرآبادی نے انسانی مساوات اور جمہوری اقدار کو اپنی شاعری کا خاص موضوع بنایا۔ علاوہ ازیں بہادرشاہ ظفر، غالب، مصحفی، اکبر الہ آبادی، حالی، آزاد، چکبست، اقبال، ظفر علی خاں، شبلی، جوش، فیض، مجاز، فراق، جذبی، مخدوم، سردار جعفری، ساحر، کیفی، جاں نثار اختر، وغیرہ نے بھی وقت اور حالات کے زیر اثر مزاحمتی اور احتجاجی شاعری کے نمونے پیش کیے۔

باب دوم میں مزاحمتی اور احتجاجی شاعری کی مختصر تاریخ کا ذکر ہے۔ اس میں سب سے پہلے کلاسکی اردو شاعری میں مزاحمت اور احتجاج کی نوعیت کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ عہد مغلیہ میں پورا ہندوستان تقریباً ایک صدی تک مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کی مسلسل شورشوں اور تباہ کاریوں سے لرزتا رہا۔ اس انتہائی

تکلیف دہ صورت حال میں مجموعی طور پر انسانوں میں بے بسی، کس مپرسی، فنا، عاجزی اور لاچاری کے تصورات پیدا ہونے لگے۔ میر جعفر زٹلی ایک ایسے عبوری دور کے شاعر تھے جب شمالی ہند میں اردو پوری طرح شعروسخن کی زبان نہیں بنی تھی اور ایک ایسے علاقے (ہریانہ) کے رہنے والے تھے جہاں کی زبان نے اردو کی تعمیر میں ان کی پیدائش سے صدیوں پیشتر بہت بڑا حصہ لیا تھا۔ جعفر نے معاشرے سے سمجھوتا نہیں کیا بلکہ طنز و ہجو کی تلوار سے اس معاشرے کے رویوں، اس کی مکاریوں، عیاریوں اور منافقتوں پر گہرا وار کیا۔ ایک ایسے دور میں ہجو، ہزل اور طنز ہی وہ ذریعہ ہے جس سے منافقت کے چہرے سے نقاب اٹھا کر معاشرے کو آئینہ دکھایا جا سکتا ہے۔ جعفر زٹلی کی شاعری اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کا آغاز غزل کی روایت سے نہیں ہوا بلکہ احتجاجی شاعری نے لفظوں کی شکل میں اپنے نقش درست کئے تھے۔ اپنے دور کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے:

گیا اخلاص عالم سے ، عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے ، عجب یہ دور آیا ہے

نہ یاروں میں رہی یاری ، نہ بھائیوں میں وفا داری
محبت اٹھ گئی ساری ، عجب یہ دور آیا ہے

ان کے بعد محمد شاکر ناجی، شاہ حاتم، اشرف علی فغان، مرزا مظہر جان جاناں، میر، سودا، اور قائم وغیرہ نے بھی شہر آشوب تخلیق کئے جس میں اس دور کے نظام کی خرابی، فوجی بدنظمی اور بادشاہ، امیر و رئیس کی ناخوش اندیشی کو پیش کیا گیا ہے۔ ان شعراء نے شہر آشوب کے ساتھ ساتھ ہجویہ شاعری کے بھی بہترین نمونے پیش کئے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں دلی میں تہذیبی، سیاسی اور معاشی زوال کا وقت شروع ہو چکا تھا 1739ء میں نادر شاہ کا حملہ، لوٹ گھسوٹ، قتل و غارت پھر اس کے بعد 1757ء سے 1761ء کے درمیان احمد شاہ ابدالی اور روہیلوں نے دلی حکومت کی مدد کے نام پر اس سے بھی زیادہ وحشیانہ سلوک کیا۔ اس صورت حال میں دلی کے لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے ایسے دور میں انہوں نے اودھ کی زمین پر پناہ لی۔ دلی کے آشوب سے نکلنے کے بعد فیض آباد ایک سکون اور تسکین کی جگہ سمجھی جانے لگی۔ وہ شعراء جنہوں نے ابتدائی دور میں دلی سے اودھ میں ہجرت کی ان میں سرفہرست سراج الدین علی خاں

آرزو ہیں۔ یہ شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔اس کے بعد حسرت ، میر، انشا،رنگین، مصحفی ، میرحسن جرات جیسے شعراءترک وطن کرنے پرمجبور ہو گئے اوران کے یہاں بھی ہجوگوئی اورشہرآشوب کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں ۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ایک ایسے شاعر کا نام آتا ہے جس نے اردو شاعری کی روایت اوراقدار کے بندھنوں کوتوڑ کر ایک الگ شناخت قائم کی اور اردو شاعری کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ نظیراکبرآبادی تھے جنہوں نے اردو شاعری کو امراء کے دیوان خانوں ، اعلیٰ مجلسوں اورادبی خواص کے حلقوں سے نکال کرلوک معاشرت پر لے آئے ، جہاں عام انسان کے جذبات واحساسات اوراس کی عمومی زندگی کی نمائندگی کی گئی تھی ۔

جب کبھی ہندوستان کی تاریخ کا ذکرآتا ہےتو 1857ء کے انقلاب کا نام بے ساختہ آجاتا ہے۔ یوں تو 1857ء کی بغاوت کے بہت سے اسباب ہیں مگر اصلی سبب برطانوی حکومت کے ہاتھوں اہل وطن کی اقتصادی راہزنی تھی ۔ یہ بغاوت بھلے ہی ناکام رہی ہولیکن اس نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف براہ راست پہلی بارآوازاٹھائی اور 1947ء کی جنگ آزادی کے لئے مشعل ہدایت بنی۔اس کے ذریعے آزادی کے مجاہدین کے لئے نئے راستے ہموار ہوئے اوران کے دلوں میں قومی یکجہتی کا جذبہ جاگ اٹھا۔اس موضوع کو غالب، بہادرشاہ ظفر وغیرہ نے اپنی شاعری میں جگہ دی ۔

ہندوستان میں انگریزوں کے قابض ہونے کے بعد اہل وطن کا ان کے خلاف ردعمل شروع ہوگیا تھا اور ہرمحاذ پر ہر شئے جوانگریزوں سے وابستہ تھی یاان کی ایجاد کردہ تھی اسے نفرت کی نظر سے دیکھا گیا اوراس کی مخالفت کی گئی ۔ اب وہ تبدیلی خواہ سیاسی ،سماجی ، مذہبی ،معاشی ،تہذیبی اورثقافتی ہی کیوں نہ ہو ہندوستانی اسے ماننے کو تیار نہ تھے۔اس وقت سرسید احمد خاں اپنی ہمہ گیرشخصیت کے ساتھ منظرعام پر ابھرے سرسید نے ہنگامہ غدر کے بعد اپنے ملک وقوم کے خاطر جو سماجی، سیاسی ، مذہبی ،علمی وادبی خدمات انجام دی ہیں ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔سرسید کی تحریک کے تحت اردوزبان میں اوربھی وسعت پیدا ہوئی جہاں تک نثر کی بات ہے تو جدید نثر کے لئے انہوں نے اپنی تصانیف نمونے کے طور پر پیش کیں جو آئندہ نسلوں کے لئے مشعل ہدایت تھیں لیکن شاعری کا میدان اب بھی محدود تھا اورخاص طور پر غزل کی حالت زیادہ خراب تھی ۔سرسید کی اصلاحی تحریک کے زیراثر غزل کی اصلاح کا رجحان بھی

پیدا ہوا اور اس سلسلے میں پہلا قدم حالی نے اٹھایا۔

حالی نے غزل کو نئے موضوعات اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش وسعی کی۔ اپنی تصنیف، مقدمہ شعروشاعری، میں انہوں نے غزل کے لئے زاویے سے بحث کی اور اس کے روایتی انداز سے انحراف کیا۔ شاعری سے جھوٹ اور مبالغے کو دور کرنے لئے نیچرل شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ اس طرح غزل کے بجائے نظم کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی اور جیسا کہ ہر نیا دور اپنے ساتھ نئ اشیاء، نئے محرکات اور نئے مسائل لاتا ہے جس کا اثر اس دور کے شعروادب پر بھی پڑتا ہے اسی طرح جدید نظم بھی حالات سے متاثر ہوکر وجود میں آئی۔ محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کی رہنمائی اور کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں جدید مشاعرے کی داغ بیل پڑی۔ انجمن پنجاب لاہور کی نظم نگاری کی تحریک کو سرسید کے افادی نقطہ نظر نے اور واضح کیا۔ حالی نے براہ راست انگریزوں کی پالیسیوں سے احتجاج تو نہیں کیا لیکن انہوں نے وطن سے محبت اور اس کے لئے کچھ کرگزرنے کا جذبۂ حریت اہل وطنوں میں ضرور جگایا تھا گویا اس دور میں پڑھے لکھے طبقے کے دل میں حب وطن اور قومیت کی لہریں جوش مارنے لگیں۔ اس طرح سے حالی، آزاد، شبلی نے اس دور میں حب الوطنی کے جذبات سے بھر پور نظمیں کہیں۔

اردو شاعری کی تاریخ میں اکبرالہ آبادی کی شناخت اس شاعر کی حیثیت سے ہے جنہوں نے طنزومزاح کو اپنی تخلیق اور اظہار خیال کا وسیلہ بنایا۔ طنزومزاح کے پیرائے میں انہوں نے زندگی اور سماج کی ایسی تلخ حقیقتوں کو پیش کیا ہے جس سے ہمارا ملک اس وقت دوچار ہورہا تھا۔ اکبر کی شاعری اپنے دور کے حالات کی ترجمان اور اس وقت کے ماحول کی پیداوار تھی۔

اردو شاعری کی تاریخ میں شاعر مشرق کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرنے والے اور شاعری کو قابل رشک بلندی پر پہنچانے والے ڈاکٹر سر محمد اقبال نے بھی اپنی قومی اور وطنی شاعری کے ذریعے ہندوستان میں قومیت کی روح پھونکی۔ ملک میں اس وقت کی سیاسی صورت حال دیکھ کو انہوں نے اہل وطن کو آنے والی مصیبت سے پہلے ہی خبردار کردیا تھا۔ ان کے یہاں قومیت کو پیش کرنے کا بڑا گہرا شعور ہے اور اقبال تو ویسے بھی نئے لب ولہجے کا شاعر ہے ان کے قومی جذبے میں بڑا خلوص ہے ان کی وطن پرستی صداقت پر مبنی ہے اور وہ ملک کے سیاسی حالات کا بہت گہرا شعور رکھتے ہیں۔ ان کی اس روش کو سرور جہاں

آبادی، چکبست وغیرہ نے برقرار رکھا۔اس کے بعد شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے ملکی اور قومی مسائل کی طرف متوجہ ہوئے۔وطن سے محبت اور وطن پرستی کے جذبے نے ان کی شاعری میں ایک نیا رنگ بھر دیا۔وہ جس دور میں شاعری کر رہے تھے وہ ہندوستان کی تاریخ میں فرقہ ورانہ فسادات اور افلاس وغربت کا دور تھا جس کی خاص وجہ انگریزی حکومت کی بے اعتدالی اور ناانصافی تھی۔ظفرعلی خان ،سیماب اکبرآبادی ،تلوک چند محروم محمد علی جوہروغیرہ نے بھی اپنے کلام کے ذریعے ہندوستانیوں کو آزاد فضا میں سانس لینے کا جذبہ فراہم کیا۔

مقالے کا تیسرا باب ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری ہے۔اس میں ان اسباب کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ترقی پسند تحریک وجود میں آئی۔جولائی 1935ء فرانس کے شہر پیرس میں کلچر کے تحفظ کے لئے ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔یہ کانفرنس اب تک کی سبھی کانفرنسوں میں سب سے زیادہ اہم تھی کیونکہ اس میں پہلی بار ادیبوں سے عملی اور انقلابی ادب تخلیق کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ہندوستان سے یورپ گئے ہوئے کچھ نوجوان وہاں کی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم تھے۔اس لئے ان طالب علموں کا وہاں کے ہونے والے حادثات اور سانحات سے بہ خوبی واقف ہونا لازمی تھا۔ان طالب علموں میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند،محمد دین تاثیر، پرمود سین گپتا اور جیوتی گھوش وغیرہ تھے۔یہ سبھی سجاد ظہیر کے کمرے میں ایک چھوٹا سا حلقہ بنا کر بیٹھنے لگے اور ادبی، سیاسی اور سماجی گفتگو کرتے۔اس حلقے نے دھیرے دھیرے انجمن کی شکل اختیار کرلی۔انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ان میں شامل ادیبوں ودانشوروں نے چند مقاصد کے تحت کیا تھا۔ان کا پہلا مقصد تھا کہ ترقی پسند ادب تحریک کا رخ ملک کے عوام، مزدوروں، کسانوں اور درمیانہ طبقے کی جانب ہونا چاہئے۔ان کو لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور، حس وحرکت جوش وعمل اور اتحاد پیدا کرنا اور تمام ان آثار اور رجحانات کی مخالفت کرنا اور جمہور، رجعت، پست ہمتی پیدا کرنا ان کا اولین فرض ٹھہرا۔لندن میں ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں نے اس تحریک کا پہلا مینی فیسٹو تیار کیا جس سے تحریک کے اغراض ومقاصد صاف طور پر ظاہر ہوجائیں۔لندن میں منظور اس اعلان نامے پر سجاد ظہیر، ملک راج آنند، محمد دین تاثیر، پرمود سین گپتا، جیوتی گھوش وغیرہ نے دستخط کئے۔اس انجمن نے پورے ملک کو احاطے میں شامل

کرلیااور ہرطرف ملک میں اس رجحان کی تائید ہونے لگی۔ یہ ہندوستان کی ایسی پہلی ادبی تحریک تھی جس میں نہ صرف اردو کے ادیب شامل تھے بلکہ دوسری زبانوں کے ادیب بھی ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہورہے تھے۔

یہ وہ دور تھا کہ جب اردوشاعری کی سب سے اہم صنف غزل جس میں طبع آزمائی معیاری شاعر ہونے کی دلیل تھی اب اس کی حیثیت ثانوی سی ہوتی جارہی تھی۔اس کی جگہ نظم اپناالگ مقام تیار کررہی تھی۔اکثر و بیشتر ترقی پسند شعراءابتدامیں رومانی شاعری کرتے تھے ان کی رومانی شاعری اس وقت اوردور کے حالات کے مطابق تھی لیکن 1936ء کے درمیان جوحالات تھے رونماہوئے اس میں ایسی شاعری مناسب نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ بدلتے ہوئے حالات اوراس کے پیش نظر مسائل کوشاعری کے موضوعات منتخب کیے گئے۔سب سے پہلے ترقی پسند شعراء نے اپنے رومانی محبوب کی محبت کورخصت کیااب ان کے لئے فقط محبوب ہی توجہ کا مرکز نہیں تھا بلکہ عام انسان کے دکھ درد، کسان اورمزدوروں کی پریشانی، عالمی مشکلات،آزادی کا جذبہ،انقلاب وغیرہ ان کی اہم ذمہ داریاں تھی جس کے لئے انہیں اپنے رومانی محبوب کی محبت کوترک کرناپڑا۔ترقی پسند شاعری میں روایات سے ہٹ کر موضوعات پر شاعری کی گئی ہے۔اس دور کی احتجاجی شاعری میں انقلاب بھی ہے اور بغاوت بھی۔شاعرفرسودہ نظام کوختم کرایک نئی دنیاتعمیر کرنے کا خواہش مند ہے۔اس کے اس انقلاب میں غصےاورانتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔وہ بغاوت کرناچاہتاہے۔یہ انقلاب، یہ بغاوت، یہ غصہ، یہ انتقام ترقی پسندشاعری میں جابجانظرآتاہے۔

اس کے بعدترقی پسندشعرااوران کی مزاحمتی،احتجاجی اورانقلابی شاعری کامختصر جائزہ پیش کیا گیاہے اس میں فراق گورکھپوری،فیض احمد فیض،اسرارالحق مجاز،معین احسن جذبی،مخدوم محی الدین،علی سردارجعفری،کیفی اعظمی،جاں نثاراختر،مجروح سلطانپوری،ساحرلدھیانوی،اختر الایمان،احمد ندیم قاسمی وغیرہ شامل ہیں۔اس میں اکثر و بیشتر شعرا کی شاعری میں رومان اورانقلاب کا خوبصورت امتزاج ہے۔ترقی پسندتحریک نے اردوشاعری کوآسمان سے اتارکرزمین پرکھڑاکردیا۔اب جومسائل زمین پررہنے والے عام انسان کے تھے وہی ترقی پسندادب کے تھے۔اگرموضوع کے اعتبار سے دیکھیں تو تمام ترقی پسندشعراکے یہاں اکثر وہی موضوعات ملتے ہیں جواس وقت کے اہم مسائل میں شامل ہیں۔مثلاًانقلاب روس،جنگ انقلاب،جہدآزادی،مکمل آزادی

کا خواب، برطانوی حکومت سے نجات کی کوشش وسعی، بھوک، افلاس، سرمایہ دار اور جاگیردار کے ظلم، کسانوں اور کمزوروں کا استحصال، لینن، اسٹالن وغیرہ کے کارنامے، قتل وغارت گری، سیاست دانوں کی ناانصافی، عورتوں کے مسائل، سویت یونین، زنداں کی صعوبتیں اور ایک نئی صبح کی امید وغیرہ اس دور کے اہم مسائل ہیں جس کو ہمارے ترقی پسند شعرا نے اپنی تخلیق میں خصوصاً جگہ دی ہے۔ یہاں اکثر شعرا کے موضوعات میں تقریباً یکسانیت ہے لیکن طرز اظہار اور لہجے ایک دوسرے سے کافی حد تک مختلف ہیں۔

باب چہارم میں علی سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی مختصر سوانح عمری، ابتدائی رومانی شاعری اور مزاحمتی، احتجاجی اور انقلابی نظموں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مخدوم کی پیدائش 4/ فروری 1908 کو میدک میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام غوث محی الدین خدری تھا جو تحصیل کے دفتر میں صیغہ دار (کلرک) تھے۔ چار سال کی عمر میں ہی والد کا عالم جوانی میں انتقال ہو گیا۔ والدہ نے دوسری شادی کر لی لیکن وہ مخدوم کو اپنے ساتھ نہ رکھ سکیں لہٰذا مخدوم کے چچا مسمیٰ بشیر الدین نے اپنے مرحوم بھائی کے بیٹے کی پرورش کا ذمہ اپنے سر لے لیا۔

مخدوم کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ قرآن شریف کے ساتھ عربی اور فارسی کی بھی تعلیم حاصل کی۔ بلا کے ذہین تھے، مطالعے کا شوق بچپن سے تھا لیکن غربت وافلاس کے باعث اس میں خلل پڑتا رہا۔ گاؤں کے اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، 1929 میں سنگاریڈی ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اور اسی سال حیدرآباد سے ہی منشی کا امتحان پاس کیا پھر 1929 میں ہی جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔ 1932 میں ایک سال ضائع کرکے انٹرمیڈیٹ کیا، 1934 میں بی۔اے اور 1936 میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ 1933 میں بے روزگاری اور نیم فاقہ کشی کے دور میں مخدوم کی شادی رابعہ مخدوم سے ہوگئی۔ جن سے ان کی پانچ اولادیں ذکیہ اسا ودی، سعید الدین اور رفیعہ مخدوم، نصرت محی الدین اور ظفر محی الدین تھیں۔ یہ سب بچے مخدوم کو ''چچا باوا'' کہا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت مخدوم ''نظام نیز حیدرآباد'' کے شاہی اور مطلق العنانی کے سب سے بڑے دشمن سمجھے جاتے تھے اور اس لئے انہیں روپوش ہونا پڑا، اسی اندیشے سے ان کی اولادوں کو کہیں عتاب شاہی کا شکار نہ ہونا پڑے اس لیے مخدوم ان کے چچا کے حیثیت سے جانے جاتے تھے۔

ترقی پسند شعراء کی شاعری کا آغاز اکثر رومانی انداز میں ہی ہوتا ہے۔ مخدوم کی شاعری کی ابتدا بھی رومانی انداز میں ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں حسن وعشق کے معاملات تو ہیں لیکن وہ کلاسکی شاعری سے قدرے مختلف ہیں۔ ان کا محبوب روایتی محبوب سے تھوڑا منفرد ہے، اس کا انداز جداگانہ ہے۔ ان کی ابتدائی رومانی نظموں میں ''طور''، ''تلنگن''، ''ساگر کے کنارے''، ''آسمانی لوریاں''، ''سجدہ''، ''محبت کی چھاؤں''، ''لمحہ رخصت''، وغیرہ میں رومانیت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے لیکن وقت اور حالات کے مدنظر انہیں اپنے شعری موضوعات میں تبدیلی کرنی پڑی۔ وہ دور ترقی پسند تحریک کا تھا دور تھا جس میں شاعر اور ادیب ایک مقصد کے تحت ادب کی تخلیق کررہے تھے۔ وہ ادب کو ایک سماجی عمل قرار دیتے ہیں جس کا اپنا ایک منفرد نصب العین تھا۔ مخدوم کی شاعری اسی پس منظر میں ابھر کر سامنے آئی۔ جس کا اثر مخدوم کی شاعری پر بھرپور طرح سے پڑا، مخدوم اس تحریک سے وابستہ نہ ہوتے تو شاید وہ کچھ بھی نہ ہوتے، وہ کافی عرصے تک اس تحریک کے روح رواں بنے رہے ان کی وجہ سے ترقی پسند تحریک نہ صرف حیدرآباد میں بلکہ پورے آندھراپردیش میں پھیل گئی۔ انہوں نے سامراجی اور جاگیردارانہ عناصر کی مخالفت کی۔ مخدوم اس دور کے حالات کو بہ خوبی سمجھتے تھے اور انہیں اصولوں کو اپنی زندگی اور شاعری میں بھی برتتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی اور شاعری دونوں کو عوام کے لئے وقف کردیا تھا۔ کسانوں اور مزدوروں کو جواب تک خواب غفلت میں تھے، بیدار کیا۔ سامراجی نظام اور بڑے بڑے زمین داروں کے خلاف انہیں بھڑکایا اور قومی اور سیاسی آزادی کے لیے بھی انہیں استوار کیا۔ ان کی مزاحمتی اور احتجاجی نظموں میں ''جنگ''، ''سپاہی''، ''باغی''، ''مشرق''، ''موت کا گیت''، ''حویلی''، ''زلف چلیپا''، ''اندھیرا''، ''جنگ آزادی''، ''استالن''، ''بنگال''، ''تلنگانہ''، ''چاندتاروں کا بن'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

علی سردار جعفری کی پیدائش 29/ نومبر 1913 قصبہ بلرامپور کے زمیندار گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والدین نے انہیں محض سات یا آٹھ سال کی عمر میں مذہبی تعلیم دینے کے لیے ''سلطان المدارس'' (لکھنؤ) بھیج دیا لیکن انہیں مدرسے کا تنگ اور سختی سے پر ماحول پسند نہیں آیا اس لیے وہ وہاں پر نہ رہے۔ چونکہ بلرامپور میں مرثیہ کا ماحول تھا جس کے زیر اثر سردار بھی مرثیہ گوئی کی جانب مائل ہوئے۔ وہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے اس طرح ان کی ادبی زندگی کی آغاز ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے ابتدائی طالب علمی کے زمانے میں ہوگیا تھا۔ اس طرح سے امام حسین کی حق پرست اور دلیر شخصیت ان کے دل میں جگہ

بنا چکی تھی اوراس سے متاثر ہوکرانہوں نے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اورصداقت کے لیے جان کی بازی لگانے کا سبق حاصل کیا۔اس کے بعد انہوں نے اقبال کامطالعہ کیاجس کے زیراثر زندگی،سلطنت،سرمایہ،محنت پرسنجیدگی سے غوروفکر کرنے کی صلاحیت آگئی۔اقبال کی طرح ان کی شاعری بھی بلندآہنگی کےساتھ انقلابی رویہ اختیارکررہی تھی۔

سردارنے 1933 میں میٹرک کاامتحان پاس کرلیااوراسی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کارخ کیا۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی انہوں نے علی گڑھ میں ایک ہڑتال کے دوران رات کے بارہ بجے برطانوی حکومت کے خلاف زبردست تقریر کی جس کے نتیجے میں وائس چانسلر نے انہیں یونیورسٹی سے نکال دیااس کے بعد وہ اسی سال اینگلوعرکالج (دہلی) میں داخل ہوئے جہاں سے انہوں نے 1938 میں بی۔اے کی تعلیم مکمل کی۔اپنی انقلابی تحریروتقریر کے باعث سردارجعفری کوکئی بارجیل کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑی۔وہ ایک شعلہ بیان مقرر تھےاورجلسےکواپنی طرف متوجہ کرنے کافن بخوبی جانتے تھے۔باغیانہ لہجےاوردل میں آزادی کے جذبات کاخوبصورت امتزاج ان کی شخصیت کوچارچاندلگادیتاہے۔

دیگرترقی پسندشعراء کی طرح سردارجعفری بھی اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دورمیں کافی حدتک رومان پسند تھے پھروقت اورحالات کے ساتھ تبدیلی آئی۔''پرواز''میں ایسی کئی نظمیں ہیں جو خالص رومانی ہیں۔''انگڑائی''،''لکھنؤ کی ایک شام''،''انتظارنہ کر''،''فراموش کردندعشق''،''حسن سوگوار''،''غم کاستارہ''،''ایک خط کا جواب''،''اکیلاستارہ''،''مژدہ''،''خوشی''، ''جھلک''، ''عورت''، ''حسن ناتمام''،''محبت کافسوں'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جوخالص رومانی چاشنی سے لبریز ہیں۔سردارجعفری کی شاعری اپنے باغیانہ تیوراورظلم واستحصال کے خلاف صرف نعرے بازی کی شاعری نہیں ہے۔ان کاشعری احتجاج جزوی یاوقتی احتجاج نہیں ہے بلکہ انہوں نے بغاوت واحتجاج کو ایک شعری استعارہ بنادیاہے۔انہوں نے اردوشاعری کونئی تکنیک اورموضوعات سے آشنا کرایا۔کرداروں کوعلامتوں کاپیراہن عطاکیا۔واقعات سے پیداشدہ احساسات وجذبات اورتاثرات کواپنی شعری کائنات کاجزوبنایا۔''بغاوت''، ''پرواز''،''نئی دنیا کو سلام''،''جنگ اور انقلاب''،''تعمیر نو''، ''استالن کتھا''،''رومان سے انقلاب تک''،''ایشیاءجاگ اٹھا''،''پتھرکی دیوار''وغیرہ ان کی انقلابی نظمیں ہیں۔

پانچویں باب میں علی سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی نظموں کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔علی سردار جعفری اور مخدوم محی الدین ترقی پسند شاعری کے اہم ستون ہیں۔تمام ترقی پسند شعرا کی طرح ان کی شاعری میں بھی یکسانیت ہے۔موضوع کے اعتبار سے تو ان دونوں کی بہت سی نظمیں ایک جیسی ہیں چونکہ ان دونوں کا زمانہ ایک تھا اس لیے اس دور کے مسائل بھی وہی تھے اور دونوں نے بہت سی نظمیں ایک ہی موضوع پر تخلیق کی ہیں۔یہاں تک کہ ان کی بعض نظموں کے عنوان بھی ایک جیسے ہی ہیں مثال کے طور پر ''جوانی''،''استالن''،''بنگال''،''اقبال''،''تلنگانہ''،''شاعر''، ''غالب''، ''نیند''،''نیا سال'' ''جواہر لال نہرو'' وغیرہ۔ان نظموں میں موضوعات کے اعتبار سے یکسانیت ہے۔لیکن ذرا غور سے مطالعہ کرنے اور مزید گہرائی میں جانے پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دونوں شعرا کے یہاں انفرادیت بھی ہے۔ان کی بہت سی نظمیں ایسی بھی ہیں جس کے عنوان تو ایک ہیں لیکن اس میں ان دونوں شعرا کے فکر و خیال الگ الگ ہیں۔

سردار جعفری کا نظم ''تعمیر نو'' اور مخدوم محی الدین کی نظم ''جہان نو'' میں کچھ حد تک مماثلت ہے وہ یہ ہے کہ دونوں شعرا فرسودہ رواج اور نظام سے ہٹ کر ایک نیا جہان قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں نیا نظام بھی ہو۔دونوں کا خیال ایک ہے لیکن نظم کے حوالے سے جو بات کہی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ مخدوم کی نظموں میں نا آسودگی، بغاوت، احتجاج اور انقلاب جگہ جگہ موجود ہے۔مفلسی اور کسمپرسی نے بکھرنے کے بجائے ایک منظّم فکر سے مالا مال کر دیا۔مخدوم نے اپنی شاعری کے ذریعہ صدائے احتجاج بلند کیا۔بھوکوں، ناداروں، مفلسوں اور کمزوروں کے مسائل کو اپنی شعری کائنات میں جگہ دی جو ترقی پسند منشور کے عین مطابق تھا جو ایسے نظام کی طرف داری کرتا ہے جو مساوات اور برابری کی تعلیم پر عمل پیرا ہو۔اس نظام پر عمل پیرا جہان کو مخدوم نے ''جہان نو'' کہا ہے۔اس نظم میں مخدوم کا ''جہان نو'' منعکس نظر آتا ہے۔

نغمے شرر فشاں ہوں اٹھا آتشیں رباب
مفر اب بے خودی سے بجا ساز انقلاب

معمار عہد نو ہو ترا دست پر شباب
باطل کی گردنوں پہ چمک ذوالفقار بن

سردار جعفری بھی اسی خیال سے متاثر ہیں۔نظم ''تعمیر نو'' میں سردار جعفری نے انقلاب روس کی جی کھول کر پذیرائی کی ہے۔سردار نے انقلاب روس میں بکھرے اور ٹھکرائے ہوئے مفلس اور درماندہ عوام کے لیے امید کی کرن کا جلوہ دیکھا۔جس نے زندگی کو نئی تجلی اور نور عطا کیا، جس نے عمل کی راہوں میں حوصلے کی مشعل روشن کی۔جس نے ظلم کے نشیمن پر بجلیاں گرائیں۔اس انقلاب نے ان کے سینوں پر سرد قلم سے ' انقلاب' لکھ دیا۔اس نے پرانی دنیا کے رسم ورواج جس میں ظلم واستبداد کا بول بالا تھا،آن کی آن میں تہہ وبالا کر دیا۔غلاموں کو لذت آزادی سے آشنا کیا اور بتایا کہ وقت کی باگ ڈور محنت کش عوام کے ہاتھوں میں ہے۔اس طرح انقلاب روس میں سردار کو دنیا کے حسین ترین مستقبل کا نور دکھائی دیتا ہے۔

انقلاب روس نے مشرق میں چھیڑا ہے رباب
ایشیاء کی روح میں ہے زندگی کا اضطراب
زندہ باد اے انقلاب
عارض لعل و بدخشاں پر کیسی آب و تاب
سرخ رو خون شہیدان وطن سے ہے گلاب
زندہ باد اے انقلاب

مخدوم کے یہاں بھی انسپریشن کی کمی نہیں ہے اگر چہ وہ رومان اور انقلاب کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں اس لئے ان کی انقلابی شاعری بھی رومانیت کے اثر سے خالی نہیں ہے۔مخدوم ہمیشہ سے ہی انقلاب کے خواہاں تھے وہ پرانے نظام کو درہم برہم کر دینا چاہتے ہیں اور اس کی جگہ نیا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے انقلاب کی ضرورت ہے۔لیکن یہ انقلاب کوئی عام انقلاب نہیں ہے۔مخدوم نے اسے محبوب کے حسین ترین پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔انقلاب کا ایسا رومانی تصور دوسرے شعرا کے یہاں مشکل سے ملے گا۔وہ ایسے انقلاب کی بات کرتے ہیں جس کا سبھی کو شدت سے انتظار ہے۔زمین و آسمان اس انقلاب کے لیے کب سے بے قرار ہیں اور سر راہ گزرنے والوں کا ہجوم اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب ان سے اور انتظار نہیں ہو رہا ہے۔

اے جان نغمہ ، جہاں سوگوار کب سے ہے
تیرے لیے یہ زمین بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سرے رہ گزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

ایک بہت اہم بات جوسردار کومخدوم سے الگ کرتی ہے وہ ہے سردار جعفری کی طویل نظمیں جیسے ’نئی دنیا کوسلام‘‘، ’’ایشیا جاگ اٹھا‘‘ وغیرہ۔نظم ’نئی دنیا کوسلام‘ فرنگی ظلم سے پیدا شدہ تاثرات کا نتیجہ ہے۔اس کے کردار، کردارنہیں بلکہ علامتیں ہیں جن میں ایک باغی مرد جاوید اوراس کی بیوی مریم کی کہانی ہے جو برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔سردار جعفری اس نظم کے ذریعے فرنگی ظلم کے خلاف ہندوستانیوں کی جدو جہد کومنظر عام پرلاتے ہیں اور بے حد خوبصورت علامتوں کے سہارے مجاہدین آزادی کواپنی جدو جہد آزادی کو جاری وساری رکھنے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

نظم ’’ایشیاء جاگ اٹھا‘‘ سردار نے سینٹرل جیل ناسک میں اسیری کے دوران تخلیق کی تھی۔ پوری نظم میں سردار جعفری نے ایشیا کی تاریخی تجزیہ پیش کیا ہے۔سب سے پہلے ’’حرف اول‘‘ میں ہندوستان کوآزادی ملنے کی خوشی کا ذکر کیا ہے۔ پھرایشیا کے مختلف کارناموں کوبھی پیش کیا گیا ہے۔ انگریزوں کی آمد،ان کی حکومت اوراستحصال کا ذکر بھی کیا گیا ہے کہ کس طرح سے برطانوی حکومت کے دور میں ہندوستان بھوک،افلاس،قحط اورسماجی وسیاسی استحصال سے دوچار تھااوراس سے عوام کس طرح متاثر ہوئے اس کا بڑے ہی انقلابی انداز میں ذکر کیا ہے۔اس کے بعد سوویت یونین کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں جوکہ ان کی شاعری کا اہم جز ہے،اسے ساری دنیا کی پریشانی ختم کرنے والا نظام بتاتے ہیں جوانہیں استحصال سے نجات دلا کر ظلم وستم بھی مٹائے گا۔سردار کی دیگر نظمیں ایسی ہیں جن میں بے جا طوالت ہے،ان کے برعکس مخدوم کے یہاں اختصار ہے۔

سردار جعفری اورمخدوم کے یہاں طرز اظہاراور لہجے میں کافی فرق ہے۔سردار کے یہاں لہجے میں سختی زیادہ ہے،ان کی پوری شاعری ہی بلند آہنگی کی ترجمان ہےان کے بہ نسبت مخدوم کے یہاں یہ سخت مزاجی کم پائی جاتی ہے۔مثال کے طور پرسردار کی نظم ’تغیر‘ کو لے لیجئے۔اس نظم میں سردار نے ہرسمت ہورہی

تبدیلی کا ذکر کیا ہے جس کے باعث ہردم، ہروقت ہر چیز میں تبدیلی آ رہی ہے۔ جو چھاؤں ہے وہ ڈھل رہی ہے، جو صبح ہے شام ہو رہی ہے اور ہر رات ختم ہو رہی ہے۔ مثلاً قدرتی تبدیلی کی بات ہو رہی ہے جو کہ فطرتی ہے۔ مخدوم بھی ہمیشہ سے تغیر کے خواہش مند تھے وہ پرانے وہ پرانے نظام کو درہم برہم کر دینا چاہتے ہیں اور اس کی جگہ نیا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے انقلاب کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ انقلاب کوئی عام انقلاب نہیں ہے۔ مخدوم نے اسے محبوب کے حسین ترین پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں سردار اور مخدوم کے انقلاب میں کافی فرق ہے۔ سردار کے یہاں جو انقلاب اور تغیر کی بات کی جارہی ہے وہ فطری انقلاب ہے۔ مخدوم کے یہاں جو انقلاب ہے وہ رومان اور انقلاب کا خوبصورت امتزاج ہے۔

ترقی پسند شعرا کے یہاں عورت کا الگ ہی تصور ہے۔ کلاسکی شاعری میں عورت محض عشق ومحبت کا ایک سامان ہے۔ اس کا وجود عشق وعاشقی تک ہی محدود تھا، کلاسکی شعرا نے ان کی جمالیات، ناز وادا، خوبصورت رویے کو شاحری کا موضوع بنایا تھا لیکن ترقی پسند شعرا کے یہاں پہلی بار عورت کا ایک منفرد تصور ہمارے سامنے نظر آتا ہے۔ اب وہ گھر کی چاردیواری میں قید نہیں رہ گئی بلکہ مرد کے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کی حقدار ہے۔

مخدوم کے یہاں عورت کا تصور کلاسکی شاعری میں عورت کے تصور سے قدرے مختلف ہے۔ ان کے یہاں دو نظمیں ''ساگر کے کنارے'' اور ''تلنگی'' میں انہوں نے بالکل نئے انداز میں عورت کے حسن کی تصویر کچھ اس طرح کھینچی ہے جیسے وہ ایک مصور ہوں۔ نظم ''ساگر کے کنارے'' میں لڑکیوں کا ساگر کے کنارے پانی بھرنا، اور اس ناز و انداز سے گگری کو سر پر لے کر چلنا، ایسا لگتا ہے دنیا کا سارا حسن آج ان میں سمٹ آیا ہے۔ دوسری نظم '' تلنگن'' میں انہوں نے تلنگن لڑکیوں کی ہنسی ٹھٹھولی اور قہقہوں کا ذکر بڑے ہی شاندار انداز میں کیا ہے۔ سردار جعفری کے یہاں بھی عورت کا احتجاجی رویہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' میں جاوید اور مریم کی گفتگو کے ذریعے عورت کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسری تصویر میں جاوید کو حسن ومحبت کے ترانے گاتے ہوئے پیش کیا گیا ہے جس میں جاوید عورت کو محبت کی منزل قرار دیتا ہے۔ اس پر مریم یہ کہتی ہے کہ عورت محبت کی منزل تو ہے لیکن عورت کے اور بھی کئی روپ ہیں جو کہ احتجاج کی شکل میں رونما ہوتے ہیں۔ یہاں سردار جعفری مخدوم سے ایک قدم آگے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں عورت

کا جو تصور ہے وہ مخدوم سے بالکل مختلف ہے۔

سردار جعفری کی شاعری میں ایک بہت بڑی خامی ہے وہ ہے دہراؤ (Repeatation)۔ سردار جعفری کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں ایک ہی موضوع یا ایک ہی فکر کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ جس کو پڑھنے سے بعض اوقات اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ بعض نظمیں اشترا کی نظریات سے بھری پڑی ہیں، بعض نظمیں بغاوت کا نعرہ بلند کر رہی ہیں۔ کہیں یلغار ہے تو کہیں سامراجی لڑائی۔ انہوں نے موضوعات کا انتخاب بہت ہی عمدہ کیا ہے لیکن موضوعات کی تکرار نے ان کی نظموں کی اہمیت کو کم کر دیا۔ ہر بار اسی موضوع کا مطالعہ کرنے سے یہ لگتا ہے کہ اس میں نیا پن نہیں ہے اور یہ روایتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ جب کہ مخدوم کے یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ سردار کی بہ نسبت مخدوم نے بہت کم لکھا ہے۔ ان کا شعری سرمایہ کافی مختصر ہے لیکن مخدوم نے جو بھی لکھا ہے اس میں کہیں دہراؤ نہیں ہے۔ ہر ایک نظم نئے موضوعات اور نئی فکر کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اور یہی نیا پن ان کی نظموں کو خاص بناتا ہے جو سردار کے بالکل مختلف ہے۔

سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی مزاحمتی واحتجاجی نظموں کا مطالعہ اور تقابلی جائزہ لینے کے بعد چند نتائج برامد ہوتے ہیں۔ سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی نظموں میں جس طرح موضوع کے لحاظ سے مماثلت ہے اسی طرح انفرادیت بھی ہے۔ دوسری بات جوان شعرا کے یہاں انفرادیت بخشی ہے وہ ہے طویل نظمیں سردار جعفری کے یہاں ''نئی دنیا کو سلام'' اور ''پتھر کی دیوار'' وغیرہ جیسی طویل نظمیں ہیں، ان کے برعکس مخدوم کے یہاں ایسی طویل نظمیں نہیں ہیں۔ مخدوم اور سردار کی دوسری نظموں کا موازنہ کرنے پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک ہی موضوع پر لکھی گئی نظموں میں سردار کے یہاں بے جا طوالت ہے اور مخدوم کے یہاں اختصار۔ سردار کے یہاں لہجے میں سختی زیادہ ہے، ان کی پوری شاعری ہی بلند آہنگی ترجمان ہے۔ ان کے برعکس مخدوم کے یہاں یہ سخت مزاجی کم پائی جاتی ہے۔ سردار کے یہاں انقلاب کی اپنی الگ شان ہے۔ وہ بلند آہنگی، گھن گرج اور نعرہ بازی سے انقلاب کے منتظر ہیں ان کے برعکس مخدوم انقلاب کا انتظار خوش جمال محبوبہ کی طرح کرتے ہیں۔ مخدوم کے یہاں عورت کا روایتی تصور ہے جب کہ سردار کے یہاں عورت کا بھی احتجاجی روپ پیش کیا گیا ہے۔ اور آخری بات یہ ہے کہ سردار کے یہاں دہراؤ (Repeatation) ہے اس کے برعکس مخدوم کا شعری سرمایہ بہت کم ہے اور انہوں نے جو بھی لکھا ہے اس میں کہیں دہراؤ نہیں ہے۔

حرف آغاز

تقابلی جائزہ ایک نہایت دلچسپ عمل ہے اور جب یہ دو شخصیتوں، دو افکار کے درمیان کیا جائے تو دلچسپی دو بالا ہو جاتی ہے۔اس کے لیے سب سے پہلے تو ذہنی طور پر ا تارگی اختیار کرنی ہوتی ہے کہ اس منصوبے کو عمل میں لانے کے امکان کس قدر ہوتی ظہور پذیر ہو سکتے ہیں اور دونوں میں مثبت اور منفی یا باہمی اتفاق اور مماثلت کس قدر ایک دوسرے کے خیالات و افکار کو متاثر کرتے ہیں ۔ جب تک مماثلت ثابت نہیں ہوگی انفرادیت کے راستے بھی ہموار نہیں ہوں گے۔شرائط یہ ہیں کہ ان ،افکار اور شخصیات کا بغور مطالعہ کیا جائے اور مثالوں اور دلیلوں کے ذریعہ واضح کیا جائے جس سے حقیقت تک رسائی ہونے میں آسانی ہو جائے۔جو بات تحقیق کی کسوٹی پر کھری اترے اسے بغیر جھجھک ، ذاتی بغض یا ناپسندیدگی کے اور ایمانداری اور دیانت داری سے پیش کیا جائے۔اس طرح سے کسی بھی موضوع کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی اور تحقیق کا معیار بھی برقرار رہے گا۔

جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے کہ ریسرچ میں سب سے زیادہ پریشانی موضوع کے انتخاب میں ہوتی ہے۔موضوع ہی مقالے کی بنیاد ہے جس پر مقالے کا سارا دارومدار ہوتا ہے۔میرے نزدیک یہ دلچسپ موضوع ہے۔شاعری سے مجھے ہمیشہ دلچسپی اور لگاؤ رہا ہے اس لئے میں شاعری اور خاص طور سے نظم پر کام کرنے کی خواہش مند تھی۔ترقی پسند شعرا میں فیض احمد فیض میرے پسندیدہ شاعر ہیں اور میں ان پر اپنا تحقیقی کام انجام دینا چاہتی تھی۔اس وقت پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب الہ آباد یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو تھے جو ترقی پسند ناقد اور دانشور کی حیثیت سے اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ہر دل عزیز فاطمی صاحب کی شخصیت سے میں کافی متاثر تھی۔ میں نے اپنے تحقیقی مسئلے کے درپیش ان سے رابطہ کیا۔انہوں نے ترقی پسند نظم سے میری دلچسپی کے مدنظر مجھے ''سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی مزاحمتی و احتجاجی شاعری کا تقابلی جائزہ'' تجویز کیا۔ مجھے یہ موضوع خاصا دلچسپ لگا لہٰذا میں فوراً رضامند ہوگئی۔

اپنے تحقیقی مقالے جس کا عنوان ''علی سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی نظموں میں مزاحمتی

اوراحتجاجی آہنگ :ایک تقابلی جائزہ'' ہے ،اس کو پانچ (۵)ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جس کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے:

باب اول: مزاحمت اوراحتجاج سے متعلق ہے جس کے پانچ ضمنی ابواب قائم کئے گئے ہیں۔

پہلا ضمنی باب مزاحمت واحتجاج کی تعریف اوروضاحتوں پر مشتمل ہے جس میں اردواور انگریزی کے مستنداور معتبر لغات کے حوالے سے مزاحمت ،احتجاج اورانقلاب کے معنی ومفہوم کوواضح کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ مزاحمت ،احتجاج اورانقلاب میں فرق پر مشتمل ہے جس میں تینوں کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے ۔تیسرے ضمنی باب میں زندگی کے مختلف شعبوں میں مزاحمت واحتجاج کی نوعیت ،ضرورت اوراہمیت پر گفتگو کی گئی ہے ۔جس میں یہ بتایا گیاہے کہ مزاحمت واحتجاج کی اتنی ہی قسمیں ہیں جتنی معاشرے میں جبر کی ۔مثلاً سماجی نظام ،سیاسی بدعنوانیوں ،معاشی بدحالی ،مذہبی انتہا پسندی ،تہذیبی و ثقافتی رویوں اورتاریخی وادبی جبر کے خلاف بھی ہوسکتا ہے ۔چوتھا ضمنی باب ادب سے مزاحمت و احتجاج کا رشتہ (شاعری کے حوالے سے) ہے جس میں ادب کو معاشرے کا وسیلۂ اظہار خیال کیا گیا ہے ۔اس طرح سے ہر دور کے شعرا نے اپنی شاعری کے ذریعہ اس دور میں ہورہی تبدیلی اور ناآسودگی کا اظہار کیا گیا ہے ۔ پانچوے ضمنی باب میں قدیم اردوشاعری میں مزاحمت واحتجاج کی نوعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہجویات ،شہرآشوب اور واسوخت جو احتجاجی شاعری کے زمرے میں آتے ہیں ان کا مختصراً جائزہ پیش کیا گیا ہے ۔

باب دوم: مزاحمتی اوراحتجاجی شاعری کی مختصر تاریخ پر مشتمل ہے جس میں تین ضمنی ابواب ہیں ۔

پہلے ضمنی باب میں کلاسکی اردوشاعری میں مزاحمت واحتجاج کی مختصر تاریخ ہے ۔جس میں قدیم اردو شاعری میں ہجویات اورشہرآشوب پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے ۔دوسرے ضمنی باب میں جدید اردو شاعری میں مزاحمت واحتجاج کی ابتدائی صورتیں ہیں جس میں ''جدید نظم'' اور''انجمن پنجاب لاہور'' کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے جس کے ذریعہ حالی اورآزاد نے نیچرل شاعری کی داغ بیل ڈالی ۔ تیسرا ضمنی باب وطن پرستی اورانگریزی حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کے جذبات کے اظہار پر مبنی ہے ۔حالی ،آزاداورشبلی نے اس دور میں حب الوطنی کے جذبات سے بھرپور نظمیں کہیں جوآگے چل

کر دوسرے وطن پرست شعرا کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئیں ان میں اقبال، سرور جہاں آبادی، چکبست، ظفر علی خاں، سیماب اکبرآبادی، تلوک چند محروم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

باب سوم: ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری کا مختصر جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس کے تین ضمنی ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں ترقی پسند تحریک کا آغاز و ارتقا ہے جس میں اس کا پس منظر بیان کیا گیا ہے اور ان اسباب کا ذکر کیا گیا ہے جو ترقی پسند تحریک کے معرض وجود میں آنے کا باعث ٹھہریں، اور اس تحریک کی ضرورت، اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے ضمنی باب میں ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری کے حوالے سے بات کی گئی ہے جس میں اردو شاعری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کی وضاحت کی گئی ہے۔ ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری کو نئے موضوعات کے ساتھ ساتھ نئے رنگ، نیا انداز بیان اور نیا لب و لہجہ عطا کیا ہے۔ باب کے تیسرے حصے میں ترقی پسند شعرا اور ان کی مزاحمتی، احتجاجی اور انقلابی شاعری کا مختصراً جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب چہارم: علی سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی نظموں کا تفصیلی جائزہ پر مشتمل ہے جس میں دو ضمنی ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ پہلا ضمنی باب مخدوم محی الدین سے متعلق ہے جس میں مخدوم کی مختصر سوانح عمری ہے اس میں ان کی ابتدائی تعلیم، گھر کا ماحول، تخلیقی سفر کا آغاز وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد مخدوم کی ابتدائی شاعری کا ذکر کیا گیا ہے جس کا آغاز رومانی انداز میں ہوتا ہے۔ بعد از بعد وہ کس طرح مزاحمتی و احتجاجی شاعری کی جانب آتے ہیں اور انقلابی رویہ اختیار کر لیتے ہیں اس کا بھی بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا ضمنی باب علی سردار جعفری کی مختصر سوانح عمری کو پیش کرتا ہے ساتھ ہی ان کی ابتدائی تعلیم، گھر کا ماحول اور ان کی زندگی کے نشیب و فراز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ابتدا میں مخدوم کی طرح وہ بھی رومانی شعرا کی حیثیت سے اپنی شاعری کا آغاز کرتے ہیں پھر بعد میں ان کی شاعری کے مختلف ادوار کا ذکر آتا ہے جب وہ رومانی شاعری سے مزاحمتی و احتجاجی شاعری کی طرف مائل ہوتے ہیں اور براہ راست انقلابی رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔

باب پنجم: علی سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی نظموں کا تقابلی جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس کے دو ضمنی

ابواب ہیں۔ پہلا ضمنی باب سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی نظموں میں مزاحمتی، احتجاجی اور انقلابی صورتوں میں یگانگت سے متعلق ہے جس میں ان کی نظموں کو زیر بحث لایا گیا ہے جو عناوین اور موضوعات کے اعتبار سے ایک ہیں۔ ان دونوں شعرا کا زمانہ ایک ہی تھا اس لیے اس دور کے مسائل بھی وہی تھے جس سے متاثر ہوکر دونوں نے بہت سی نظمیں ایک ہی موضوع پر تخلیق کی ہیں۔ دوسرا ضمنی باب علی سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی نظموں میں مزاحمتی، احتجاجی اور انقلابی آہنگ: ایک تقابلی جائزہ پر مشتمل ہے جس میں دونوں شعرا کی شاعری کی انفرادیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس میں موضوع، انداز بیان، لب ولہجہ اور فکر وخیال کی بنیاد پر دونوں شعرا کی نظموں کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔جس کی وضاحت مثالوں سے کی گئی ہے۔

حاصل مطالعہ اور نتائج میں ان شعرا کی نظموں کا فکری اور فنی جائزہ لیتے ہوئے ان کے افکار و خیالات اور خصوصیات کا بیان ہوا ہے۔ساتھ ان شعرا کی فکری وفنی بالیدگی پر تبصرہ بھی پیش کیا گیا ہے۔اس کے بعد کتابیات کی فہرست ترتیب دی گئی ہے۔جن میں ماخذات کا ذکر باترتیب ہے جو اس تحقیقی مقالے میں بنیادی اور امدادی وسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

موضوع کے انتخاب کے بعد پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب نے میرے نگراں کی حیثیت سے استادالاساتذہ پروفیسر سید محمد عقیل رضوی صاحب کا نام پیش کیا تو میری خوشی دو بالا ہوگئی۔اتنی قابل اوراعلیٰ شخصیت کی نگرانی میں کام کرنا مجھ جیسی حقیر طالبہ کے لئے فخر کی بات تھی۔ میری نیک بختی اور پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب مہربانی سے مجھے پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔استاد محترم کے ساتھ کام کرنے میں نہ صرف تحقیق کی باریکیوں سے آشنائی ہوئی بلکہ پیہم جدوجہد کرنا بھی سیکھا۔انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود میرے مقالے کے ابواب کی ترتیب وتشکیل کی۔مواد کی فراہمی میں بھی جس قدر ان کا تعاون حاصل رہا اسے الفاظ میں بیان کر پانا ناممکن ہے۔سب سے زیادہ مواد ان کے ذاتی کتب خانے سے ہی حاصل ہوا، جہاں تک بہت کم لوگوں کی رسائی ہوتی ہے۔ان کا کتب خانہ نایاب کتابوں کا ذخیرہ ہے جس سے میں نے حتی المقدور استفادہ کیا۔

بظاہر میرا موضوع دلچسپ اور چیلنجنگ تھا اور استاد محترم نے ابواب کی طویل فہرست تیار کرا دی تھی لیکن ان کی بے پناہ محبت ،شفقت ،حوصلہ افزائی اور تعاون نے اس مرحلے کو میرے لیے آسان کر دیا۔انھوں نے قدم قدم پر مجھے مفید مشوروں اور ہدایات سے نوازا لیکن یہ میری تیرہ نصیبی تھی کہ میں ان کی نگرانی میں اپنے تحقیقی مقالے کو انجام نہ دے سکی۔ دراصل اس وقت یو۔ جی۔ سی۔ کے نئے ضابطے کے مطابق سبک دوش پروفیسر کی نگرانی میں کام کرنے والے ریسرچ اسکالرز کا تبادلہ ہونا تھا اور اس طرح میرے نگراں تبدیل ہو گئے اور مجھے اردو ادب کی عہد حاضر کی مایہ ناز شخصیت اور استاد محترم سید محمد عقیل رضوی کے شاگرد پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب کی سرپرستی نصیب آئی اور بقول عقیل صاحب ان کے ''سچے جانشیں'' پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب کی نگرانی میں مجھے کام کرنے کا موقع ملا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ میں ان کے احسانات سے گراں بار ہوں۔ ریسرچ میں داخلے سے لے کر ،موضوع کا انتخاب،مواد کی فراہمی اور نگراں کی تبدیلی کے علاوہ زندگی کے دشوار گزار مرحلوں پر انھوں نے نہ صرف میری رہنمائی کی بلکہ مسلسل حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ تحقیق کو لے کر انھوں نے جن مشوروں سے نوازا اور جس طرح میری ذہنی تشکیل فرمائی میرا قلم اس بیان سے قاصر ہے۔ زندگی کے سخت اور مشکل مراحل میں جس دو نے میرا مکمل ساتھ نبھایا ان میں میری سانسیں اور استاد محترم فاطمی صاحب کا خصوصیت سے شمار ہے ۔شکریہ اور مہربانی کا لفظ ان کی شفقت کے بیان کے لیے ناکافی ہے پھر بھی رسم دنیا ہے لہٰذا میں صمیم قلب سے ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ ان کی نگرانی میں میرا مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میرا مقالہ دو ترقی پسند نقاد و دانشور پروفیسر سید محمد عقیل رضوی اور پروفیسر علی احمد فاطمی صاحبان کے فکر و خیال سے آراستہ ہے۔

اس مقام پر میں الہ آباد یونیورسٹی کے بے حد قابل اساتذہ کی محبتوں اور شفقتوں کو کیسے نظر انداز کر سکتی ہوں۔لائق احترام صدر شعبہ اردو پروفیسر شبنم حمید صاحبہ،عزت مآب بزرگ استاد پروفیسر عبدالحامد صاحب،محترمہ عطیہ نشاط خان صاحبہ، محترمہ پروفیسر نوشابہ سردار صاحبہ، کی میں بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً میری اصلاح اور رہنمائی کی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

مقالے کے لیے ایک اہم مسئلہ مواد کی فراہمی ہے جس کے لیے مجھے کئی مقامی اور بیرونی شہر

کے کتب خانوں کا طواف کرنا پڑا۔اس سلسلے میں الہ آباد یونیورسٹی کی سینٹرل لائبریری (الہ آباد) ہندوستانی اکادمی (الہ آباد) بھارتی بھون لائبریری (الہ آباد) وغیرہ سے مجھے کافی حدتک مواد دستیاب ہوئے جومقالے کی تکمیل کے لیے مدومعاون ثابت ہوئے۔مقامی کتب خانے تک تو با آسانی رسائی ہوگئی تھی لیکن بیرونی شہروں کے کتب خانوں تک پہنچنے میں کافی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔وہاں سے جوموادحاصل ہوئے ان سے مقالے کی ترتیب وتکمیل میں بڑی مددملی۔اس کے لیے میں نے جواہر لال نہرویونیورسٹی (دہلی) اورجامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی (دہلی) کی لائبریری سے استفادہ کیا۔

اس موقع پر میں اپنے تمام عزیز، دوست احباب کی دل سے شکرگزار ہوں جنہوں نے تحقیق جیسے دشوارگزارراستے پرمیری مدد اورحوصلہ افزائی کی۔میرے عزیز دوست محمد افضل بھائی، ایاز خلیل،محمدنوشادکامران،محمدیٰسین ،احمدعبداللہ،خالدہ خاتون، نازیہ عرشی،فرح ہاشم اور کائنات انصاری نے موادکی فراہمی میں قدم قدم پرمیرا ساتھ دیا۔علاوہ ازیں تمام سینئراور جونیئرطلباو طالبات کا بھی دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے ہرممکن مددفرمائی۔

میں جناب بدرعالم بھائی کی دل سے شکرگزار ہوں جنہوں نے کمپوزنگ جیسے دشوارگزار راستے پرصبر،خوش دلی،دیانت داری اورایمانداری سے میری مددکی۔انہوں نے دن رات محنت کرکے میرے مقالے کوتکمیل تک پہنچایا۔ان کی ایمانداری انسانیت کی اعلیٰ مثال ہے۔

میں الہ آبادیونیورسٹی کے تمام اسٹاف کا بے حدشکریہ ادا کرتی ہوں کیونکہ ہرمشکل مرحلے پر ہمیشہ وہی یادآتے تھے۔انہوں نے داخلے سے لے کر مقالہ جمع ہونے تک قدم قدم پررہنمائی اور تعاون فرمایا۔ان کے خوش گوارریوں اورمشوروں لے لیے میں ان کی تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔

اس موقع پر میں ان عظیم ہستیوں کا ذکرکرنا چاہوں گی جنہیں وحدہٗ لاشریک نے والدین کی شکل میں مجھے عطا کئے۔والدجناب سرفرازاحمداوروالدہ محترمہ نازنین بیگم جن کی کڑی محنت ومشقت نے مجھے تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے۔ان کے علاوہ گھرکی سب سے بزرگ خاتون میری نانی امی محترمہ کشوری بیگم کا ذکرکرنا چاہوں گی ،ان سب کی دعائیں ہروقت میری حفاظت کرتی ہیں۔میں ان کے احسانات کبھی ادانہیں کرسکتی جنہوں نے مجھے آج اس منزل تک پہنچایا ہے۔ ان

کے علاوہ میری چار بہنیں شاذیہ سرفراز، نازیہ سرفراز، سمیّہ سرفراز اور ماہِ ضیا سرفراز کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا، میری ہر ممکن مدد کی۔ آخر میں ان تمام عزیز و اقارب کا شکریہ جن کے تعاون کے بغیر یہ کام میرے لیے خاصا مشکل تھا۔

کیسے فراموش کروں اس لازوال ہستی کو جس نے اس وسیع کائنات کی تخلیق کی۔ جو زمین۔ آسمان، دن۔ رات، زندگی۔ موت، عروج۔ زوال کا مالک ہے، جس کے فضل وکرم سے میں نے تحقیق جیسے سنگلاخ مراحل کو بھی باآسانی طے کرلیا۔ اس ذات الٰہی کے فضل وکرم سے مجھے مشفق و مہربان اساتذہ ونگراں، والدین، بہنیں، دوست واحباب اورعزیزواقارب کی محبت اور رہنمائی نصیب ہوئی۔ اس ذات الٰہی کی سب سے زیادہ مشکور اور ممنون ہوں......الحمدللّٰہ

شکریہ

تاریخ....................

عرشیہ سرفراز
ریسرچ اسکالر
شعبہ اردو
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

(ابواب)

باب اول

مزاحمت اوراحتجاج:

☆ تعریف اور وضاحتیں

☆ مزاحمت احتجاج اور انقلاب میں فرق

☆ زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کی نوعیت، ضرورت و اہمیت

☆ ادب سے مزاحمت و احتجاج کا رشتہ (شاعری کے حوالے سے)

☆ قدیم اردو شاعری میں مزاحمت و احتجاج کی نوعیت (ہجویات، شہر آشوب، واسوخت)

مزاحمت اور احتجاج: تعریف اور وضاحتیں

اس بوالعجب آفاق و رنگ و بو میں معتدر نوعیت کی جاندار شے مثلاً جانور، انسان، پرندے، کیڑے مکوڑے، پیڑ پودے، جراثیم وغیرہ قیام پذیر ہیں۔جس میں سب سے افضل انسان کہا جاتا ہے جس کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا ہے۔انسان کو یہ حیثیت یوں ہی نہیں ملی بلکہ اس کے پیچھے اس کے دیکھنے، سننے، بولنے، سوچنے اور محسوس کرنے کی قوت کارفرما ہے۔ یہی احساس ہی تو ہے جو اسے اس کائنات کی دوسری جاندار قوتوں سے منفرد کرتا ہے۔کسی بھی عام شے کو دیکھ کر اس کے ذہن میں ایسے خیالات ابھرتے ہیں جو مثبت بھی ہوسکتے ہیں اور منفی بھی یہ خیالات پہلے پہل اس شکل میں متحرک نہیں ہوتے بلکہ انسان کے باطن میں مخفی احساس کے باعث وجود میں آتے ہیں۔اسی احساس کے سبب اس کے اپنے دلی جذبات بھی رونما ہوتے ہیں کیونکہ جب تک کوئی فرد کسی جذبات کو محسوس نہیں کرے گا تب تک وہ اس پر اپنی کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا۔ یہ جذبات ہی ہیں جو اسے حسّاس بناتے ہیں گویا جذبات واحساسات ایک دوسرے میں اس طرح شِیر وشکر ہوجاتے ہیں کہ ان کی تفریق مشکل ہے۔اسی جذبات واحساسات کے سبب کچھ اضطراب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو بے اطمنانی اور ناآسودگی کے ماحول کی تشکیل کرتی ہے۔اس ماحول سے بہ یک وقت انحراف بھی ہوتا ہے جو اختلاف کی صورت بھی اختیار کرلیتا ہے۔ اوریہی اختلاف آہستہ آہستہ احتجاج کی شکل میں اپنی منزل کی جانب گامزن ہوتا ہے۔اس طرح سے احساس، اضطراب، انحراف، اختلاف اور احتجاج اپنے ارتقائی سفر کو پہنچتے ہیں۔جس کے پس پردہ مزاحمت کارفرما ہوتی ہے۔

لفظ 'مزاحمت' اور 'احتجاج' ایک دوسرے سے کافی قریب ہیں۔بعض لوگ ان دونوں کو ہم معنی قرار دیتے ہیں۔مزاحمت اور احتجاج ایک دوسرے سے قریب ضرور ہیں مگر یکساں نہیں۔ان کے درمیان بہت باریک سا فرق ہے۔دونوں کے درمیان امتیازی پہلوؤں سے متعلق گفتگو کرنے سے قبل ان کے معنی ومفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔

'مزاحمت' کا ماخذ عربی زبان کا لفظ 'زحمہ' ہے جس کے لغوی معنی حریف سے ٹکرانے، یا

'مدافعت' کرنے کے ہیں۔انگریزی میں اس کا مابدل Resistance ہے۔مثلاً کسی ناموافق صورت حال سے مطمئن نہ ہونا یا ایک طرح سے اسے Forbid کرنا ہے۔ یہاں مختلف مستند و معتبر لغات کے ذریعے مزاحمت کے مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی جارہی ہے:۔

فرہنگ عامرہ میں مزاحمت کے معنی ''کسی پر تنگی کرنے کے ہیں'' [۱] اور فرہنگ آصفیہ میں اس سے مراد ''تعرض' اٹکاؤ' ممانعت اور روک ٹوک'' [۲] ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد نے Resistance کے لئے ''مقاومت' مخالفت' مدافعت' یا رکاوٹ'' [۳] کا استعمال کیا ہے۔

اسی طرح بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بھی Resistance کے لئے ''مقاومت' مخالفت' مدافعت' یا رکاوٹ'' [۴] کا استعمال کیا ہے۔

مشہور و معروف Oxford English-English-Hindi Dictionary میں Resistance کی تعریف کچھ یوں درج ہے:

"Trying to stop sth from happening or to stop sb from doing sth; Fighting back against sb/sth.

dqN ?kfVr gksus ;k fdlh dks dqN djus ls jksdus dh fdz;k(O;fDr ;k oLrq dk izfrjks/k ;k fojks/k [۵]**

کوئی واقعہ ہونے یا کسی کو کچھ کرنے سے روکنے کا عمل انگریزی لغت Collins Cobuild میں 'Resistance' کی تعریف یوں ہے:

"The act of refusing to accept something such as a change and

---

[۱] (فرہنگ عامرہ۔محمد عبداللہ خاں خویشگی۔کتابی دنیا دہلی۔2011۔ص:572)

[۲] (فرہنگ آصفیہ۔جلد چہارم۔نیشنل اکادمی دہلی۔1974۔ص:(339)

[۳] (انگریزی اردو لغت۔پروفیسر کلیم الدین احمد۔جلد پنجم۔1998۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی۔ص:168)

[۴] (The Standard English Urdu Dictionary-Dr.Abdul Haq. AnjumanTaraqqiUrda (Hind) New Delhi-2005-P.N-1009)

[۵] { Oxford English-English Hindi dictionary-Dr.Suresh Kumar and Dr.Ramanath Sahai-oxford University Press New Delhi-2008- Page

trying to prevent it from happening." [1]

''نا قابل قبول تبدیلی سے پرہیز یا اس کے خلاف ایک انحرافی عمل''

مذکورہ بالا لغات کے ذریعہ مزاحمت کے معنی کافی حد تک واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر جیسے کوئی ایک ملک دوسرے ملک کے معاشی معاملے میں دخل اندازی کرتا ہے جس کے باعث وہاں کے مفاد متاثر ہوتے ہیں تو ان کی دخل اندازی کو منفیانہ طور پر اختیار کرنا مزاحمتی طرز عمل کہلائے گا۔

دوسری جانب 'مزاحمت' سے قریب کا لفظ 'احتجاج' ہے جس کے لغوی معنی اعتراض یا حجت کرنے کے ہیں۔ انگریزی میں اس کا مابدل Protest ہے۔ مثلاً (to express One's dissent strongly) کسی نہ موافق صورت حال کے خلاف نا آسودگی کا اظہار کرنا یا اس پر معترض ہونا ہے لفظ احتجاج کی وضاحت کے لئے مختلف لغات کے حوالے مندرجہ ذیل ہیں۔

فرہنگ عامرہ میں 'احتجاج' کے معنی ''حجت'' [2] کرنے کے ہیں۔

کلیم الدین احمد نے اپنے لغت میں 'احتجاج' کے معنی ''عذر' اعتراض یا اظہار ناراضی'' [3] کے دئے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق کے لغت میں 'احتجاج' کے معنی اظہار ناراضگی' اظہار ناخوشی یا نارضامندی' اظہار اختلاف [4] وغیرہ کے ہیں۔

نہایت مشہور و مقبول لغت Oxford English-English Hindi Dictionary, میں Protest, کی تعریف مندرجہ ذیل ہے۔

"A statement or action that shows that youdo not like or approve of sth."

^^fdlh ckr dh ukilanxh ;k vLohdfr fn[kku okyk oDr0; ;k dk;fojk/k**

---

[1] (Collins Cobuild English Dictionary,Harper Collins-India Pvt.Lmt New Delhi-1991-P.No-1233)

[2] (فرہنگ عامرہ۔محمد عبداللہ خاں خویشگی۔کتابی دنیا دہلی۔2011۔ص:18)

[3] (انگریزی اردو لغت۔پروفیسر کلیم الدین احمد۔جلد پنجم۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی۔1998 ص:713)

"Not happily and after expressing disagreement"

vIgefr 0;Dr djr g, vkj vfuPNk d lkFk** ۱

''نارضامندی ظاہر کرتے ہوئے اورناپسندیدگی کے ساتھ''

انگریزی کی نہایت دقیع لغت Collins Cobuild میں 'Protest' کی تعریف پیش نظر ہے۔

"The act of saying or showing publically that you object to something that someone, especially in authority, is doing or intending to do." ۲

''حد درجہ بالادستی کی مخالفت یابرسراقتدار کے خلاف اظہارنا آسودگی کے طور پرعوام کا ردعمل''

فن خواہ تعمیری ہو،سنگ تراشی ہو،موسیقی ہویاادبی دل ودماغ پر کچھ نہ کچھ عکس ضرور چھوڑ جاتا ہے۔جب ہم اس کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تووہ بھی سامعین وناظرین کواپنی جانب پُرکشش لہجے میں کھینچتا ہے مگراس سے متاثرصرف وہی اشخاص ہوسکتے ہیں جن میں فہم وبصیرت ہواور وہ اپنی حواس خمسہ Five Sense organs کا استعمال بخوبی کرتے ہوں کیونکہ ہرانسان کے باطن میں ایک ایسا شخص پنہاں ہوتا ہے جو اس کے عادات واطوار کے خلاف بھی جاسکتا ہے۔شعوری یاغیرشعوری طور پروہ اپنی دلی کیفیات وناآسودگی کااظہاربھی کرتا ہے۔خواہ وہ علانیہ طور پراپنے خیالات کااظہار نہ بھی کر پائے تو محض اپنے طور طریقوں سے کچھ رمزوکنایوں میں ہی سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔دیگراشخاص کواس کی بہ نسبت کم فہمی ہوتی ہے اور وہ اس طرزعمل سے ناآشنا ہوتے ہیں۔کسی فن سے بخوبی واقفیت کے لئے اس کوسمجھنااورجاننا بے حد ضروری ہے جب تک اس کی پورے طور پرشناخت نہیں ہوجاتی ' تب تک اس پر بحث کرنا بے مقصد ہے۔اس فن پرصرف وہی شخص غورکرسکتا ہے جس میں حسّیت ہو،اورکچھ تحرّک بھی کیونکہ اسی کے سبب مزاحمت وجود میں آتی ہے گویاجذبات واحساسات ہی ان مزاحمتی ریوں کے محرک ہیں۔سنجیدہ نقاد سیدمسعودحسن رضوی ادیب کے قول سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے:۔

{Oxford English-English Hindi Dictionary-Dr.Suresh Kumar and Dr.Ramanath Sahai-Oxford University Press New Delhi-2008- Page.No. 951} ۱

> ''دنیامیں جوکچھ رونق اورچہل پہل ہے وہ جذبات کی بدولت ہے۔اگرخوشی،غم،محبت،عداوت، نفرت،خوف اور ہمدردی وغیرہ یہ سب جذبے ناپید ہوجائیں تو دنیامیں ایک سناٹا چھا جائے۔ نہ گلاب کے چمن سے فرحت ہو،نہ ببول کے بن سے وحشت۔نہ شاماکے سحری نغموں سے روح بیدار ہو،نہ کوے کی بے ہنگام صدا کانوں پر بار ہو۔نہ کسی سے ملنے کا اشتیاق ہو،نہ کسی سے چھٹنا شاق ہو۔ ایک بے امتیازی اور بےتعلقی کا عالم پیدا ہوجائے، جس میں نہ ماں کو بیٹے سے محبت ہو،نہ بھائی کو بھائی سے الفت، نہ بچپن کے دوست اورکسی اجنبی میں کچھ امتیاز رہے،نہ اپنے بچے کی دلکشی ''غوں،غاں'' اورکسی ماں کے جگرخراش بین میں کوئی فرق معلوم ہو۔مختصر یہ کہ اگرجذبات فناہوجائیں تو رشتے ٹوٹ جائیں،تعلق چھوٹ جائیں،زندگی کی دلچسپیاں مٹ جائیں،سوسائٹی کی بنیادیں ہل جائیں،معاشرت کی کلیں بگڑ جائیں،تہذیب وتمدن کے کارخانے بند ہو جائیں اورانسانیت وحیوانیت کے بیچ میں ایک دھندلا سا خطِ فاصل باقی رہ جائے۔'' [1]

احتجاج ایک ایسا ردعمل ہے جوکسی وقت کی سماجی حقیقت کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔وہ اس دور کی ناآسودگی کوختم تونہیں کرسکتا مگراس سے ٹکرانے کی ہمت ضرور رکھتا ہے۔سماج میں ہو رہے ایسے حادثے جواس کے لئے ناقابل برداشت ہیں ان کووہ آسانی سے فراموش نہیں کرسکتا کیونکہ انسان اتنا حساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی خودداری وانا کی حفاظت کے لئے مستعد رہتا ہے۔یہ احتجاج کی لُو بھی اس میں اسی حسّیت کے سبب جاگتی ہے مگر یہ پہلے پہل اس شکل میں رونمانہیں ہوتی بلکہ اس کا جنم ایک احساس سے ہوتا ہے جو ہماری دلی کیفیت کو جھنجھوڑکررکھ دیتا ہے جس کے تحت ایک اضطراب دل ودماغ میں برپا ہوجاتا ہے جوکہ اس وقت کے ماحول سے ہماری ناآسودگی کو

---

[1] (ہماری شاعری۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی۔ 2008 ص:19)

ظاہر کرتا ہے۔اس سے قبل ہماری دلی وذہنی کیفیات سے ہمیں یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس سے مطابقت Adjust کرنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ جب ظاہری طور پر کوئی شے ناگوار گزرتی ہے تو انسان کے باطن میں بھی ایک اضطراب کا عمل دخل ہوتا ہے۔آہستہ آہستہ یہ اضطراب شدت پسندی اختیار کرتے ہوئے دوسری شکل میں تبدیل ہوجاتا ہے جس کے تحت جو ناموافق ہو اس سے بحث و تکرار ہی احتجاج ہے۔ڈاکٹر آغا ظفر حسنین مثالوں سے ان کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں:

> ''مثال کے طور پر پارلیمنٹ میں کوئی متنازعہ بل منظور ہو جانے پر
> حزب اختلاف کا شور وغوغا یا واک آوٹ احتجاج کہلائے گا۔ ہند
> پاک میں ایٹمی تجربات کی مخالفت میں دونوں ملکوں کے دانشور، قلم کار
> اور اردو عوام کے ذریعہ اختیار کیا گیا رویہ یا پھر عراق و افغانستان میں
> کی گئی غیر قانونی امریکی کاروائی کے خلاف دنیا بھر میں ہونے والے
> عوامی مظاہرے احتجاج کے زمرے میں آئیں گے جب کہ ان
> دونوں ملکوں میں چلنے والی امریکہ مخالف عوامی تحریک مزاحمت ہے۔
> غرض احتجاج کسی ناموافق صورت حال کے حوالے سے محض انکار
> اور اظہار ناآسودگی کے رویوں تک محدود ہے جبکہ مزاحمتی عمل ایسے
> حالات سے نبرد آزما ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔'' [1]

مزاحمت اور احتجاج کی ابتدا بھی تبھی سے ہوتی آئی ہے جب سے انسان وجود میں آیا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوا کے قصے سے تو ہر کوئی واقف ہوگا۔مگر اس پر ذرا غور کرنے پر یہ نتیجہ نکلے گا کہ اس میں بھی انسانی احتجاج مخفی تھا۔فرمان الٰہی کے تحت حضرت آدم کو ممانعت تھی کہ وہ شجر ممنوعہ کو ہاتھ نہ لگائیں مگر انسانی نفسیات جس میں مزاحمتی خمیر رچا بسا ہے اس کو کیسے برداشت ہو کہ اس پر کسی کی پابندی عائد ہو۔خدا کی اس تخلیق نے اس کی طرف سے بھی مزاحمتی رویہ اختیار کیا اس کی ایک آرزو نے اسے فرمان الٰہی کی نافرمانی کرنے پر مجبور کر دیا اور اس کا تدارک اسے اس کائنات میں آ کر ملا۔ یہی آرزو اضطراب کی آماجگاہ ہے،تب سے لے کر آج تک نہ جانے کتنے ابن

---

[1] (مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری، ڈاکٹر آغا ظفر حسنین، ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی 2006 ص:18)

آدم وجود میں آئیں اورانہوں نے نہ جانے کتنے فرامین الٰہی کونظرانداز کیااور نہ جانے کتنی بار حکم خدا کے خلاف احتجاج کیا۔

اس دہرفانی آفاق میں نظام قدرت کے تحت دومخالف قوتیں ایک دوسرے سے متصادم ہیں مثلاً خوشی وغم،دھوپ اور چھاؤں،روشنی اورتاریکی،زندگی اورموت،عورت اورمرد وغیرہ۔ ثنویت کی یہ قوتیں ایک دوسرے کوکروٹ بھی دیتی رہتی ہیں۔مثال کے طور پرچینیوں کے مذہبی عقیدے (Yin) ین اور یانگ (Yang) اس امر کی وضاحت میں ممّد ومعاون ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس ضمن میں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''چینیوں کے مطابق (Yin) اس کیفیت کا نام ہے جس میں ہر شے جامدوساکن ہوجاتی ہے اور یانگ (Yang) وہ کیفیت ہے جس میں ہر شے بےقراراورمضطرب ہوجاتی ہے۔'' [1]

اختلاف واضطراب کی یہی کیفیت،اجتناب وانحراف کا یہی رجحان التہاب کی شکل میں بھڑک اٹھتا ہے جومزاحمت واحتجاج کوجنم دیتا ہے۔حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوا کے قصے سے وضاحت کرتے ہیں:

> ''گویاجنت ایک ایسی جگہ تھی جوسکون،طمانیت اورٹھہراؤ کا گہوارہ تھی اور اس کاباسی آدم تحرک اور اضطراب سے ناآشنا''ین'' کی کیفیت میں مبتلا تھااور نہ جانے ین کا یہ عالم کب تک قائم رہتا کہ کائنات نے اپنی ازلی وابدی فطرت یعنی ثنویت کامظاہرہ کیااور بہشت میں سانپ کا وجوداسی تحرک اوراضطراب کاباعث ثابت ہوا جس کے زیراثر آدم کے دل میں ممنوعہ پھل کوچکھنے کی آرزو پیدا کی۔اس آرزو کی تکمیل نے دفعتہً آدم کوسکون طمانیت اورٹھہراؤ کی فضا سے نکال کرتحرک اضطراب اور آوارہ خرامی فضامیں لاکھڑا کیا۔گویاین کی کیفیت ختم ہوئی اوریانگ کا آغاز ہوا۔'' [2]

---

[1] (مزاحمت اور پاکستانی اردوشاعری، ڈاکٹر آغاظفر حسنین، ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی، 2006، ص:18)

نظام جمہوریہ میں ہرانسان کو یہ حق ہے کہ وہ آزادی سے اوراپنی مرضی کے مطابق زندگی بسرکرے۔زندگی کے ہرشعبے میں اس کو اپنے آزادانہ فکراورقید وبند سے بری رویوں کا اظہارکرنے کا پوراحق ہے اور یہ حق اسے ملک اورقانون کی طرف سے اس کی سہولت کے لئے مہیا کئے گئے ہیں جس سے وہ کھلی ہوامیں سانس لے سکے اور ہرچیز میں وہ برابری کا حقدار ہوجس سے سماج میں اس کا استحصال نہ ہولیکن معاشرے اورمشاہدے میں چندایسے افراد بھی شامل ہیں جواس ملکی یا قانونی حقوق کا استعمال بالادستی سے کرتے ہیں کہ عوام ان کے خلاف ناراضگی ظاہرکرنے لگتے ہیں اور جب یہ شدت پسنداختیارکرلیتی ہے تواحتجاج کی صورت میں پھوٹ پڑتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ مزاحمت اوراحتجاج کے سامنے کوئی واضح تصورنہیں ہوتا مگر یہ سماج 'نظام' اقتدار اورفرسودہ روایات پر مبنی معاشرے کو بدلنے کی خواہش ضرور ہوتی ہے۔ یہ اس وقت وجود میں آتا ہے جب فرداورسماج کے فرسودہ قوانین وضوابط میں وہ گھٹنے لگتا ہے اوراس ناآسودگی کی وجہ سے وہ اس نظام کی مخالفت کرتا ہے۔اوروہ عصری زندگی میں بے چینیوں اورتلخیوں میں سکون وراحت کا جویا ہوتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن احتجاج کی اس خصوصیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''احتجاج پوری طرح یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا چاہتا ہے اورجو کچھ چاہتا ہے اس کی تکمیل کے لئے کون سے ذرائع اور وسائل اختیار کئے جانے چاہئے البتہ وہ اتنا ضرورجانتا ہے کہ جو کچھ ہورہا ہے وہ اس سے ناآسودہ ہے۔'' [1]

مزاحمت اوراحتجاج صرف یہیں تک محدودنہیں رہتے بلکہ یہ زندگی کے مختلف شعبوں کے خلاف بھی ہوتا ہے مثلاً سماجی، سیاسی، مذہبی، معاشی ومعاشرتی وغیرہ۔مگر ہرسیاسی وسماجی احتجاج سے پہلے ذہنی احتجاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ذہنی احتجاج خودانسان کے باطن میں پیدا ہوتا ہے جس کا نصب العین اس دورکی کیفیات کی ناآسودگی کا اظہار ہے جس زمانے میں وہ زندگی بسرکررہا ہے۔ اسے یہ احساس دلانا کہ یہ موجودہ صورت حال اس کے لئے ناموافق ہے۔ چونکہ ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اس لئے یہ ادب سے بھی وابستہ ہے۔ کہتے ہیں کہ شاعروادیب عام آدمی کے بہ

---

[1] (عصری ادب۔ پروفیسر محمد حسن۔شمارہ۔29,30-1997 نئی دہلی۔ص:30)

نسبت زیادہ حساس ہوتے ہیں ۔ ہزار پابندیوں کے باوجود بھی وہ اظہار کے منفرد راستے تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ اشاروں، کنایوں، ابہام اور علامتوں کے ذریعہ یا براہ راست بھی اپنی ناآسودگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

کوئی بھی شاعر یا ادیب اپنے دور کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی و ثقافتی زندگی پر پوری نگاہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے کے تمام حساس پہلوؤں سے متاثر ہوتا ہے کیونکہ وہ خود بھی حساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے دور اپنے زمانے میں ہونے والی سرگرمیوں، ظلم و جبر اور استبداد سے براہ راست واقف ہوتا ہے اور ان سے وابستگی اس کی حسیت میں اور بھی اضافہ بخشتی ہے۔ اس لحاظ سے شاعر یا ادیب اس ظالمانہ سماج کے خلاف آواز اٹھانے میں مدد معاون ثابت ہوتے ہیں۔ وہ سوسائٹی میں پھیلی خودغرضی کے خلاف کھل کر قلم اٹھاتے ہیں اور اس بے حسی کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر قمر رئیس اپنے مضمون ''ادب میں اختلاف، انحراف، اور احتجاج کی معنویت'' میں فرماتے ہیں:

> ''حساس ادیب جب اپنے کسی معتبر تجربہ کو اظہار کی شکل دیتا ہے تو گویا وہ ایک اختلافی یا انحرافی عمل سے گزرتا ہے۔ وہ بلاشبہ کسی سماجی یا انسانی صورت حال کے بارے میں اس اعتماد سے اپنی بات کہتا ہے کہ اس میں کچھ نیا ہے اس میں دوسروں کی سوچ یا علم و آگہی سے ہٹ کر کچھ کہا گیا ہے۔ یعنی اس کا تخلیقی تجربہ دوسروں سے اختلاف کا پہلو رکھتا ہے۔ معاصرین کے عالم طرز فکر سے وہ ایک گریز یا انحراف ہے، دوسری جانب اس انحرافی رویے میں اکثر احتجاج کا جذبہ اس لئے شامل ہوتا ہے کہ ادیب اپنے ماحول اور معاشرے سے ناآسودہ ہوتا ہے۔ اظہار کے وسیلہ سے وہ اپنی ناآسودگی کے اضطراب اور کرب کا اظہار کر کے ایک سکون پاتا ہے۔ ادب میں انحراف اور احتجاج کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس طرح ادیب اپنے وجود کو

> جتاتا،اس کااثبات کرتاہے،اپنی انفرادی پہچان یااپنے تہذیبی تشخص
> کی جستجوکرتاہے۔صرف یہی نہیں اس صورت سے وہ اپنی آزادیٔ
> اظہارکااعلان کرکے جمہوری عمل کوبھی استحکام بخشتاہے۔'' ۱؎

مزاحمت،اختلاف اورانحراف کے ذریعہ ادب متحرک بنتاہے۔شاعراورادیب جب کسی سماجی یاانسانی صورت حال پرنظرڈالتے ہیں تب انہیں یہ اندازہ ہوتاہے کہ اس میں کچھ نیاپن ہے جودوسروں سے قدرے مختلف ہے اوروہ اس سے انحراف کرتاہے۔ یہ ردعمل مثبت ہے یامنفی انہیں یہ بھی خبرنہیں ہوتی۔وہ دونوں طورپراس کواستعمال کرتاہے۔حالانکہ اس کی رائے غلط بھی ہوسکتی ہے مگریہاں بات ردعمل کی ہے اورادب میں توہرکسی کواپنی بات کہنے کی پوری آزادی ہے پھرچاہے وہ غلط ہویاصحیح ۔جب وہ معاشرے کے تضادات پرنظرڈالتے ہیں تواس کاردعمل ان کی تحریروں میں کم وبیش ظاہرہوتاہے۔اس طرح وہ اظہارکووسیلہ بناکراپنے جذبات واحساسات کوعلانیہ طورپربیان کرتاہے جس میں ہروہ کہانی 'ناول' افسانہ' ڈرامہ' مقالہ' شاعری' تحریروتقاریرشامل ہوتے ہیں جو سماجی سیاسی،اقتصادی،ثقافتی تسلط کے خلاف ہوتے ہیں اورردعمل کے طورپرابھرکرسامنے آتے ہیں۔ اس دنیامیں تمام پسماندہ اورمظلوم افرادتوہمات وتعصّبات،غربت اورجہالت کاشکارہیں اور بیشتر عوام جبرواستحصال کانشانہ بن رہے ہیں ایسے میں جبرواستبداد اوراستحصالی قوتوں کے خلاف آواز اٹھانے والا اوراپناایک تاریخی رول اداکرنے والا مزاحمتی اوراحتجاج ادب،وجودمیں آتا ہے جو آزادی اورمکمل مساوات کے درپے ہوتاہے۔ڈاکٹرابراراحمداپنے مضمون 'مزاحمتی ادب' میں رقمطرازہیں:

> ''ادب تخلیق کرنا،بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے کیونکہ ادیب
> اپنے گردوپیش سے Confirm نہیں کرپاتا اوراس کشمکش کی بنیاد
> پروہ ادب تخلیق کرتاہے۔ایک طرح سے توساراادب مزاحمتی ہے
> اورہرادیب باغی۔'' ۲؎

اس خیال کی روشنی میں مزاحمت ایک ایساردعمل ہے جوکسی شاعروادیب میں بے ساختہ

۱؎ (اردوادب:احتجاج اورمزاحمت کے رویے۔مرتب ڈاکٹرارتضٰی کریم۔اردواکادمی دہلی۔2004ص:20)

اظہار کی جرات پیدا کرتا ہے۔ان کے پاس کچھ پختہ نظریات ہوتے ہیں جس کے تحت وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول سے مطمئن نہیں ہوتا۔اس کشمکش کے دوران اس کی دلی کیفیات واحساسات ابھر کر سامنے آتے ہیں اور آہستہ آہستہ ایک ادب وجود میں آتا ہے جو اپنی فرسودہ روایات سے انحراف کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس کی بات سے اتفاق رکھیں ۔بعض اوقات اس انحراف کا اعتراف بھی ہوتا ہے اور کبھی اختلاف بھی ۔لیکن احتجاج کسی بھی شے کے خلاف اس کو ختم کرنے کا راستہ تب تک نہیں ہموار کرسکتا جب تک وہ منظّم نہ ہو اور با قاعدہ ایک تحریک کی شکل میں نمودار نہ ہو۔بعض اوقات یہ احتجاج کسی مخصوص شعبے کے خلاف نہیں بلکہ ایک پورے نظام کے خلاف ہوتا ہے جو کہ استحصال،ظلم واستبداد، جبر وتعطل کا مارا ہوتا ہے یہ بالواسطہ سماج سے ٹکراتا ہے ، اپنے غم وغصے کا اظہار کرتا ہے یا تو اس نظام سے کنارہ کشی اختیار کرلیتا ہے۔اس کا مقصد ایک بہتر نظام کی تلاش وجستجو ہے۔

مزاحمت، احتجاج اور انقلاب میں فرق

مزاحمت محض انکار یا ممانعت تک محدود نہیں ہے نہ ہی اس کا عنصر نفی تک محدود ہے یہ کیفیت وقت کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ جب مزاحمت نا قابل برداشت ہو جاتی ہے تو یہ دوسری شکل اختیار کر لیتی ہے جس کا دارو مدار احتجاج پر مبنی ہوتا ہے۔ مزاحمت اور احتجاج کے باعث سرکشی سر اٹھاتی ہے اور مظلومیت کو آزادی کی کھلی فضاؤں میں سانس لینے کی توفیق ملتی ہے جس سے ادب اور سماج میں نشاۃ ثانیہ کی صورت میں نئی کرن پھوٹ پڑتی ہے جو سماج اور ادب کی از سر نو تشکیل کرتی ہے۔ یہی احتجاج آگے چل کر انقلاب کا ابتدائیہ بنتا ہے۔ پھر یہ صورتیں مسلسل آگے بڑھتی جاتی ہیں۔ ان تینوں کے درمیان یہی فرق ہے کہ مزاحمت سے لے کر احتجاج اور پھر احتجاج سے لے کر انقلاب تک ارتقاء کی صورت بنتی جاتی ہے۔ ان کے ارتقائی سفر میں آہستہ آہستہ شدت پسندی رونما ہوتی جاتی ہے اور یہ صورتیں اس وقت نشونما پاتی ہیں جب ٹکراؤ کی جرات اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ ویسے تو انقلاب کے معنی تبدیلی کے ہیں خواہ وہ سماجی، سیاسی، معاشی و معاشرتی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں مگر یہاں اسے ردعمل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور اسی انحراف کے ساتھ ساتھ تبدیلی کے اثرات بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ انگریزی لغت Lexicon Universal Encyclopedia میں انقلاب یعنی revolution کی وضاحت کچھ یوں ہے:

"Revolution seeks to achieve extensive change in social and political system in place of the old order, with its emphasis on status and privilege for instance, it may seek a society that values social equality, individual achievement, and political participation based on participation and mobilization. In particular, it supports greater equality of economic conditions………. and involves fundamental changes in the

structure of a society, its basic beliefs and individual behavior."

اس وضاحت کا مفہوم یہ ہے کہ انسانی زندگی میں کسی قابل قدر تبدیلی کو انقلاب سے تعبیر کیا جاتا ہے اور روزمرہ میں انقلاب سے یہی مراد لیا جاتا ہے جب کہ کسی مسلمہ قانون، اصول وضوابط اور رسم ورواج میں بڑی تبدیلی لانے کا عمل بغاوت کے زمرے میں آئے گا۔ اکثر لوگ انقلاب، احتجاج اور بغاوت میں کوئی امتیاز نہیں کرتے بلکہ وہ باغیانہ اور احتجاجی عناصر کو انقلاب تصور کر لینے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انقلاب اور احتجاج میں نمایاں فرق یہ ہے کہ انقلاب کے لئے عمل پیہم ضروری ہے اور انقلاب کا تعلق با قاعدہ کسی تحریک سے ہوتا ہے جس کے اغراض ومقاصد پہلے سے ہی طے ہوتے ہیں وہ با قاعدہ ایک منصوبے کے تحت موجودہ سماج کی برائیوں کو مکمل طور پر ختم کر کے سماج کی تشکیل نو کرتا ہے جب کہ احتجاج کسی بھی سماجی نظام یا تحریک سے نا آسودگی کا اظہار ہوسکتا ہے جس میں ایک طرح کی ذہنی بغاوت ہوتی ہے۔ احتجاج کسی بھی شے کے خلاف اسے ختم کرنے کا راستہ تب تک ہموار نہیں کرتا جب تک وہ منظّم اور تحریک کی شکل میں نہ ہو۔ اسی طرح احتجاج اور بغاوت میں بھی فرق ہے۔ کسی نظام، رسم ورواج کے خلاف مہم کو بھی بغاوت کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے خواہ وہ انقلابی ہو یا جذبات کا وقتی ابال جب کہ احتجاج کسی بھی شے سے ناراضگی کا اظہار ہے جو مقابلہ کی حد تک نہیں پہنچتا۔ بہرحال یہ تو تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ اکثر وبیشتر احتجاج انقلاب کی راہیں بھی ہموار کرتا ہے۔ ڈاکٹر علی جاوید احتجاج، انقلاب اور بغاوت کے درمیان فرق کو اس طرح واضح کرتے ہیں:

> '' انقلاب، بغاوت اور احتجاج ایک دوسرے سے قریب ضرور ہیں لیکن ان میں بہت فرق ہے۔ جہاں تک انقلاب کا تعلق ہے تو اسے لوگوں نے کئی معنوں میں استعمال کیا ہے لیکن انقلاب کے سائنٹفک نقطۂ نظر کو درمیان میں رکھا جائے تو انقلاب کے معنی کسی سماج کی معاشیات کے پیداواری رشتے میں مکمل تبدیلی یا دوسرے الفاظ میں کسی سماجی ڈھانچے میں مکمل سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلی کے

---

[1] (مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری۔ ڈاکٹر آغا ظفر حسنین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ 2006 ص:21-20)

ہیں....... .....انقلاب کے لئے عمل پیہم ضروری ہے اور انقلاب کا تعلق کسی با قاعدہ تحریک سے ہوتا ہے جس کے مقاصد پہلے سے طے ہوتے ہیں۔ساتھ ہی انقلاب کے لئے انقلابی شعور کا ہونا لازمی ہے جب کہ احتجاج کسی بھی سماجی نظام یا تحریک سے ناراضگی کا ردعمل ہوسکتا ہے۔ مثلاً اگر کوبہ شخص کسی تحریک کا مخالف ہے تو اس کی یہ مخالفت کسی طرح کی حکمت عملی کو جنم نہیں دیتی بلکہ ایک طرح کی ذہنی بغاوت کی موجب ہوتی ہے۔اس کے علاوہ احتجاج کسی بھی شے کے خلاف اسے ختم کرنے کا راستہ ہموار نہیں کرتا........ جس طرح انقلاب اور احتجاج میں فرق ہے ویسے ہی بغاوت اور احتجاج بھی معنوی سطح پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔کسی نظام کے خلاف ٹکراؤ یا کسی بھی رسم یا رواج کے خلاف مہم کو بھی بغاوت کا نام دیا جاسکتا ہے، خواہ اس کی راہ انقلابی ہو یا جذبات کا وقتی ابال جو رومانوی اثرات سے پر ہو، جب کہ احتجاج کسی شے سے لاتعلقی یا ناراضگی کا اظہار ہے جو مقابلہ کی حد تک نہیں پہنچتا اور نہ ہی کسی ناپسندیدہ شے سے نجات پانے کا راستہ ہموار کرتا ہے۔'' [1]

اس خیال کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سیاسی طور پر انقلاب کا تعلق کسی تحریک سے وابستہ ہے۔جیسے انقلاب روس' انقلاب ۱۸۵۷ء جس کے مختلف اسباب تھے۔ ہر انقلاب کے پیچھے کچھ نہ کچھ نصب العین ہوتا ہے جبکہ احتجاج صرف اس سے نبرد آزما ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ تو پورے طور پر یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ خود کیا چاہتا ہے۔وہ تو صرف کسی شے کے خلاف آواز اٹھانے کی جرات پیدا کرتا ہے نہ کہ اسے باضابطہ طور پر ختم کرنے کا راستہ بناتا ہے۔اس کے برعکس انقلاب کسی مقصد کے تحت اس شے کے خلاف آواز تو اٹھاتا ہے ساتھ ہی اس میں تبدیلی لانے کا خواہاں ہوتا ہے اسے پورے طور پر ختم کرنے کی کوشش وسعی کرتا ہے۔یہ اور بات ہے کہ ہر انقلاب کامیاب نہیں ہوتا لیکن

---

[1] (افہام وتفہیم۔ڈاکٹر علی جاوید۔رائٹرس گلڈ انڈیا لمٹیڈ۔نئی دہلی۔2004 ص:47)

اس کی ناکامی دوسری باتوں پرمنحصر ہوتی ہے۔

بیشک مزاحمت ،احتجاج،انقلاب اور بغاوت مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے قریب ترتو نظرآتے ہیں مگر باضابطہ طور پر یکساں نہیں ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان چاروں کی اصطلاحیں ایک دوسرے کے مابدل کے طور پراستعمال کی جاتی رہی ہیں اوران کی توجیحات بھی غالباًوہی ہیں۔ جہاں کہیں استحصال ہے وہاں مزاحمت اوراحتجاج ہیں اور جہاں مزاحمت اوراحتجاج ہے وہاں انقلاب کا ہونا لازمی ہے کیونکہ سماج میں جب تک غیر جانبداری ،مساوات،اعتدال اورمکمل آزادی اور بنیادی حقوق کی آدائیگی نہیں ہوگی تب تک انحراف ،اجتناب،التہاب اورجدوجہد کی آوازیں بلند ہوتی رہیں گی اوران کا سلسلہ بقائے دوام تک جاری وساری رہے گا۔

زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کی نوعیت ،ضرورت واہمیت

تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور میں مزاحمت واحتجاج اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد رہے ہیں ہاں اتنا ضرور ہے کہ مزاحمت واحتجاج کی اتنی ہی قسمیں ہیں جتنی معاشرے میں جبر کی ۔ یہ جبر واستبداد سماجی نظام کے خلاف بھی ہوسکتا ہے ، سیاسی بدعنوانیوں کے خلاف بھی ،معاشی بدحالی کے خلاف بھی اور مذہبی انتہا پسندی کے خلاف بھی ۔ یہ تہذیبی وثقافتی رویوں کے خلاف بھی جاسکتا ہے ، تاریخی وادبی جبر کے خلاف بھی ۔زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کی نوعیت الگ الگ رہی ہے اور ہر شعبے کی اپنی ایک اہمیت ہے اور یہ آپس میں ایک دوسرے سے اس طرح منسلک ہیں کہ نہ تو کوئی ان کو الگ کرسکتا ہے اور نہ ہی کسی شعبے کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے ۔اس کی ایک شکل مفید ہوسکتی ہے اور دوسری نقصان دہ بھی ، محدود بھی ہوسکتی ہے اور وسیع بھی ۔زبان وتہذیب اور ذات پات کے نام پر بھی ہوسکتی ہے تو کبھی کسی خاص نظریے اور تہذیب کے اختلاف پر بھی ۔سب کا الگ الگ وجوداور اہمیت ہے ۔ڈاکٹر شارب ردولوی صاحب ان کی نوعیت کے سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

> ''احتجاج اوراس کی نوعیت کا بیان ایک طویل موضوع ہے لیکن ایک بات ضرور ہے کہ احتجاج ادب کے زندگی ،سماج اور تہذیب سے تعلق کی بہت مضبوط سند ہے۔ جب بھی شخصی یا انفرادی زندگی اپنے سماجی حالات سے غیر مطمئن ہوئی یا اجتماعی زندگی فطری آلام یا سیاسی، تاریخی اور معاشی بحران کا شکار ہوئی تو وہ بے اطمینانی یا بحران ادب کے صفحے پر ایک نشان سنگ کی طرح ابھر آیا۔ بارہویں صدی ہجری کا دکن ہو یا اٹھارہویں صدی عیسوی کا شمال ہند، اردو شعر وادب اپنے ابتدائی مراحل میں بھی جس وقت نثر ونظم کے اصول متعین تھے ،نہ اظہار و بیان کی کوئی بوطیقا لیکن احتجاج کے لئے اس وقت بھی بہت واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔'' [۱]

---

۱ (اردو ادب میں احتجاج اور مزاحمت کے رویے، مرتب: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، اردو اکادمی دہلی، 2004، ص: 132)

مذکورہ بالاقول کی روشنی میں زندگی کے مختلف گوشوں میں مزاحمت واحتجاج کی نوعیت ضرورت اوراہمیت کا تذکرہ درپیش ہے۔

(1) سیاسی جبر کے خلاف مزاحمت واحتجاج

اس کے تحت قومی یا بین الاقوامی سطح پر موجودسیاسی صورت حال پر ناآسودگی کا اظہار کیاجاتا ہے جس کے سبب دوموضوعات کا احاطہ ہوتا ہے۔ایک تواس قوم کے سیاسی نظام، سیاسی نظریے اور سیاسی تصور سے اختلاف اوردوسراسیاسی بدعنوانی ہے۔ ہرایک ملک کا اپناسیاسی نام ہوتا ہے جس کے تحت وہ اپنے ملک کے مفاد کے لئے کچھ قانون بناتے ہیں۔ Universal Declaration of human Rights کی روسے دنیاکے سبھی انسانوں کو چند بنیادی حقوق حاصل ہیں جس کے سبب وہ اپنے ملک کے سیاسی نظام میں دخل اندازی کر سکتے ہیں اوراس طرح جمہوریت وجودمیں آتی ہے۔ڈاکٹر سلامت اللہ نے جمہوریت کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کی ہے:

> ''موجودہ سیاسی جمہوریت یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام کے ابھار سے وابستہ ہے۔انگریزی،امریکی اورفرانسیسی انقلابوں کے نتیجے میں ریاست پرمتوسط طبقوں کا اقتدار مستحکم ہوگیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے بہت سے ادارے معرض وجودمیں آ گئے جن کی بنیادعوام کی نمائندگی کے اصول پرقائم ہے۔اس کا اظہار جمہوریت کی اس مقبول عام تعریف سے ہوتا ہے کہ جمہوری حکومت عوام ہی کی ہو،عوام ہی اس حکومت کومنتخب کریں اورعوام کے مفادمیں وہ کام کرے۔'' [1]

دنیاکے ایسے ممالک جہاں نظام جمہوریت ہے وہاں کےعوام اپنا حکمراں خودمنتخب کرتے ہیں۔ یہ مطلق العنان حکمراں عوام کے حقوق کی حفاظت کرنے کے لئے ہوتے ہیں جن کی ذمہ داری ہے کہ ان کی مشقتوں اور پریشانیوں کوحل کرنا اوران کے لئے ایسے کام انجام دیناجوان کی بھلائی کے لئے ہوں لیکن اکثر حالات اس کے برعکس ہوتے ہیں ،زیادہ ترحکمراں اس ملک کے سیاسی حالات کا فائدہ

---

[1] (تعلیم اوراس کا سماجی پس منظر ۔ڈاکٹر سلامت اللہ ۔قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان نئی دہلی ۔199 ص:89)

اٹھاتے ہوئے عوام کے لئے ایسے مختلف کام انجام دیتے ہیں جو کہ ان کی خوشحالی کے لئے نہیں بلکہ بدحالی کے لئے ہوتے ہیں۔اپنے خودساختہ قانون اور پالیسیوں کے ذریعے بے بس ، مجبور اور لاچار عوام کا جبر وتشدد سے استحصال کرنا ان کا شیوہ بن جاتا ہے۔لہٰذا اس کے تئیں ایک منفی اور ناپسندیدگی کا رویہ پایا جاتا ہے۔عوام جب اس صورت حال اور جبر واستبداد سے عاجز آجاتے ہیں تو اس کے خلاف متحد ہو کر آواز اٹھاتے ہیں۔اس طرح عوام کی سیاست میں مداخلت یا ان کی پامالی سیاسی جبر سے موسوم ہوگی اور اس جبر کی مخالفت مزاحمت واحتجاج سے ۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں سیاست دانوں نے عوام کا استحصال کیا ہے خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے وابستہ ہو۔وہ اپنے مفاد کے لئے نئی نئی پالیسیاں بناتے ہیں اور اس کو سختی سے عوام پر مسلط بھی کرتے ہیں۔بین الاقوامی سطح پر دیکھا جائے تو انگلینڈ، روس، امریکہ، اٹلی، جرمنی اور فرانس وغیرہ میں جو انقلاب آئے وہ سب عوام کے احتجاج کا ہی نتیجہ ہیں جس طرح سے حکمرانوں نے وہاں کے عوام پر سماجی وطبقاتی کشمکش، مذہبی انتہا پسندی، معاشی واقتصادی بدحالی، تہذیبی وثقافتی انتشار کے ذریعے ظلم کئے اگر وہاں کے عوام اپنے حقوق کے لئے آواز بلند نہ کرتے اور متحد ہو کر احتجاج نہ کرتے تو پوری دنیا آج بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوتی۔اگر ہندستان کی تحریک آزادی کے دور کو مثال کے طور پر پیش کریں تو یہاں اس کے پیچھے اس وقت کے سیاسی حالات ہی کارفرما تھے۔انگریزوں کا تجارت کے بہانے ہندوستان میں قیام کرنا اور پھر یہاں کے سماجی وسیاسی حالات کا فائدہ اٹھا کر ہندوستانیوں پر ظلم کرنا ایک عام بات تھی۔برطانوی افسر صنعت وتجارت کے ساتھ ساتھ سیاسی حالات میں دلچسپی لینے لگے جس کے پیچھے ان کا مقصد اقتصادی مفاد کے ساتھ ہندوستان کی قدیم وراثت اور قومی یکجہتی جو کہ اس وقت زوال آمادہ تھی اس کو منتشر کر کے ان پر حکومت کرنا تھا۔ڈاکٹر تاراچند اس دور کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ’’ہندوستان کا یہ حال تھا کہ اس میں سوسائٹی کے مختلف طبقات میں
> موثر تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ملک میں بسنے والوں کے مختلف
> گروہوں میں دولت مند مالکان زمین اور راجگان کا گروہ اب بھی

حکومت کا وفادار تھا۔لیکن تجار، پیشہ ور جماعتیں اور پڑھے لکھے لوگ یہ
محسوس کررہے تھے کہ ان کی آنکھوں پر سے پردے اٹھ گئے ہیں
اور وہ غیر مطمئن تھے۔اس لئے تبدیلی لانے کی اپنی جدوجہد کا رخ
قدرتاًوہ جامد،افسردہ اور غیر مطمئن عوام کی جانب موڑ رہے تھے جسے
آئینی جدوجہد کا نام دیا گیا تھا۔اس کے بے کار ہونے کو باا‌ثر
لیڈران میں سے کچھ لوگوں نے سمجھ لیا تھااور جس طرح اس صدی
کا وقت گزرتا گیا ان کی تعداد اور ان کے اثر میں اضافہ ہوتا گیا اور ان
کی منظّم کارروائیوں نے شدت، جوش اور جارحیت اختیار کر لی۔'' ۱؎

تقسیم بنگال، مارلے منٹو اصلاحات، عدم تعاون اور خلافت تحریکیں، سائمن کمیشن، جلیاں والا باغ حادثہ وغیرہ جیسے حادثات سے پریشان عوام اگر اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے احتجاج نہ کرتی اور چپ چاپ خاموشی سے اپنے ہی ملک میں ظلم کا شکار ہوتی رہتی تو کیا ہم آج آزادی کی کھلی فضاؤں میں سانس لے پاتے ؟ لہٰذا سیاسی جبر کے خلاف آواز اٹھانے کی سخت ضرورت ہے۔ جب تک ہم اپنے حق کے لئے آواز بلند نہیں کریں گے تب تک ہمارا جسمانی و ذہنی استحصال لازم و ملزوم ہے۔

(2) سماجی جبر کے خلاف مزاحمت واحتجاج

دور بربریت میں انسان نیم وحشی زندگی گزارتا تھا وہ درختوں کے نیچے ،جنگلوں یا غاروں میں رہتا تھا وہ خانہ بدوش زندگی بسر کرتا تھا۔ جہاں جو مل گیا اسی سے پیٹ بھر لیا مثلاً پھل سبزی، قندمول جیسی قدرتی اشیا سے اپنی بھوک مٹاتا یا پھر جنگلی جانوروں کا شکار کر اپنی اپنی خوراک بناتا۔اسے کپڑوں کا بھی علم نہ تھا موسم کی تبدیلی کے ساتھ اپنے جسم کو درختوں کے پتوں یا چھالوں سے ڈھانک لیتا یا پھر جانوروں کی کھال پہن لیتا تھا۔شکار کے لئے پتھر کے ہتھیاروں کا استعمال کرتا تھا۔نہ وہ آگ سے واقف تھا، نہ لوہے سے اور نہ ہی تانبے سے ۔پھر ہزاروں سال کے بعد آریوں کی آمد سے انسانی تہذیب کا ایک دور شروع ہوا اور یہ آہستہ آہستہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوا جس میں انسان دور جاہلیت

۱؎ (تاریخ تحریک آزادی ہند، جلد سوم، مترجم: عدیل عباسی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

سے نکل کر کچھ تہذیب کے دائرے میں آ گیا۔اب اس نے رہنے کے لئے مکان بھی بنائے ،کھانے کے لئے کھیتی بھی کی۔ پہننے کے لئے کپڑوں کا استعمال بھی ہونے لگا اور کھانے پکانے کے لئے آگ کا علم بھی ہوگیا جس کے باعث جانوروں کے گوشت کو پکا کر کھانے لگا۔کل ملا کر اب وہ ایک سماج اور سماجی زندگی سے وابستہ ہوگیا۔آریوں کی سماجی زندگی کی بنیاد دھرم اور کرم کے اصول پر رکھی گئی۔رگ ویدی دور میں رنگ ،دھرم اور کرم کی بنیاد پر سماج کو چار ورنوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا یہ تقسیم پیدائشی نہیں تھی اس کا تعلق ان کے کام سے تھا جو وہ برائے پیشہ اختیار کرتے تھے۔ ہر فرد کو یہ آزادی تھی کہ وہ اپنی مرضی اور صلاحیت کے مطابق کوئی بھی پیشہ اختیار کرسکتا تھا اور ایک فرد ایک وقت میں کئی کام کرتا تھا۔تقسیم کے لحاظ سے سماج برہمن،چھتری،ویش اور شودر چار ورنوں میں بٹا ہوا تھا۔ڈاکٹر مجیب اشرف اس ضمن میں اظہار خیال کرتے ہیں :

> ''چنانچہ علم کی درس وتدریس کا کام کرنے والے برہمن کہلاتے تھے۔ ملک کی حفاظت اور حکمرانی کرنے والے لوگ چھتری کہلاتے تھے۔ زندگی کی ضروریات کا سامان مہیا کرنے والے ویش کہلاتے تھے۔ غیر آریوں کو شودر کہا جاتا تھا۔وہ دوسرے طبقوں کی خدمت کرتے تھے۔'' [۱]

مذکورہ بالا خیالات کی روشنی میں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آریوں کی آمد سے قبل جو سماج تھا اس میں ذات پات کا کوئی تصور نہیں تھا اور رگ وید کے آخری دور میں ورنوں کو ذاتوں میں تبدیل کر دیا گیا اور اس کے بعد ذاتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو چار ذاتوں سے یہ متعدد ذاتوں تک پہنچ گیا اور اس طرح سماجی نابرابری کا جو دور شروع ہوا وہ تا حال تک جاری وساری ہے بلکہ اس میں اور بھی شدت پسندی آ گئی۔سماج میں بہت سی نیچی ذاتیں بنائی گئیں جن کا اس سے پہلے کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا یہ انسانوں کی پیدا کردہ ہیں جس کو اپنے مفاد کے لئے بنایا گیا تھا جیسے نائی،موچی،حلوئی،جولاہا،کنجڑہ،دھوبی وغیرہ یہ اپنے پیشے سے جانے جانے لگے۔ اور ان سے بھی نیچے چمار،پاسی وغیرہ آتے ہیں جو اور بھی زیادہ پریشان کئے گئے۔سماج کے اونچے

۱۔ (قدیم ہندوستان کی سیکولر روایات۔ ڈاکٹر مجیب اشرف۔ نئی آواز، جامعہ نگر نئی دہلی۔ 1988ء ص: 22)

لوگوں نے ان کا سکھ چین چھین لیا اوران کوسماج کے ان سبھی قانون سے الگ کر دیا گیا جن کے وہ حقدار تھے۔ان کوسماج میں بڑی گری نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا جس سے ان کی انا کو بہت ٹھیس پہنچتی تھی۔حالانکہ وقت پڑنے پرانہوں نے متحد ہوکرکسی نگراں کی نگرانی میں احتجاج بھی کیا۔آریہ سماج، برہموسماج، رام کرشن مشن وغیرہ نے جو بھی تحریک چلائی ان میں ان ادنیٰ ذات والوں کے حقوق کی حمایت کی گئی۔گاندھی جی نے انہیں''ہری جن'' کہہ کر بلایا اوران کی حفاظت کے لئے کچھ قانون بھی بنائیں جن کے اثرات مثبت بھی ہیں اورمنفی بھی۔ان کے لئے مختلف شعبوں مثلاًتعلیم،سیاست وغیرہ میں Reservation کا انتظام کیا گیا جوان کے لئے کافی حد تک فائدے مند بھی ثابت ہوالیکن اس کے بہت سارے نقصانات بھی سامنے آئے۔اونچی اوراعلیٰ جگہوں پران کی حکومت بڑی مضر ثابت ہوئی جس سے نااہل لوگوں کی ایک بھیڑ شامل ہوگئی اوراس کے زیراثر ایسے صلاحیت مند لوگ پیچھے رہ گئے جو واقعی اس جگہ کے حقدار تھے اپنا ایک اعلیٰ وقار رکھتے تھے۔

ایک طرف توذات پات کے نام پرتفریق کی گئی تو دوسری طرف معاشی حالات کو پیمانہ بنا کرسماج کے تین طبقوں،اعلیٰ،متوسط اورادنیٰ میں تقسیم کر دیا گیا۔خواہ یہ تفریق سماجی پیمانے پر ہو یا معاشی اس میں اعلیٰ طبقہ زیادہ طاقتور ہوتا تھا۔وہ زندگی کے ہرشعبے میں حاوی ہوتا تھا۔سیاست و معاشیات و مذہبی معاملوں میں بھی ان ہی کی حکومت چلتی تھی۔سماج میں ہرطرح کے فرد ہیں جن کی شناخت اپنے اپنے پیشوں سے بھی ہوتی ہے اس میں زمیندار بھی ہیں اورکسان بھی،سرمایہ دار بھی ہیں اورمزدور بھی۔سماجی نابرابری ایک طرح سے معاشی شے سے بھی وابستہ ہے جس کے تحت اونچی ذات کے اعلیٰ زمینداراورسرمایہ دار نچلی ذات کے کسان ومزدور پرظلم کرتے ہیں اوران کا سماجی اورمعاشی طورپراستحصال کرتے ہیں لیکن جب سماج کے پسماندہ طبقے کودبایا جاتا ہے اوراعلیٰ طبقہ ان کا استحصال کرتا ہے تو سماجی جبر کے خلاف مزاحمت واحتجاج جنم لیتے ہیں۔

سماج میں رہنے والے فرد کو ملک اورقانون کی طرف سے کچھ حقوق ملے ہیں جن کا استعمال کرکے وہ اپنی آزادی کومحفوظ رکھ سکتے ہیں۔ان کی اس ضرورت کودیکھتے ہوئے ان کے لئے بہت

سی سہولتیں مہیا کرائی گئی ہیں جس کے تحت آج وہ اعلیٰ طبقے کی برابری کررہے ہیں۔اب ہرذات کے لوگ تعلیم حاصل کرسکتے ہیں اورسماج کے اونچے عہدوں پربھی فائز ہوسکتے ہیں یہ سب ان کی کوششوں کا نتیجہ ہیں کیونکہ اگروہ اپنے حق کے لئے آواز بلند نہ کرتے اوراسی طرح ظلم کا شکار ہوتے رہتے ،سرمایہ داراورزمیندار طبقے کی قوتوں کا نوالہ بنتے رہتے تو آج ان پر یہ اعلیٰ طبقہ سماجی اور معاشی دونوں صورت حال سے ان پر مسلط ہوتااوران کے ساتھ ویسی ہی زیادتی کرتا جیسا کہ ہمیشہ سے کرتا چلا آیا ہے۔

(3) معاشی جبر کے خلاف مزاحمت واحتجاج

کسی بھی ملک کی پیداوار کے ذرائع کی غیرمساوی تقسیم اوراس سے پیدا ہونے والی معاشی پسماندگی کے خلاف ناپسندیدگی کا رویہ معاشی جبر کے خلاف مزاحمت واحتجاج کے ضمرے میں آئیں گے۔یہ احتجاج یکا یک نہیں پھوٹ پڑتا بلکہ اقتصادی وعمرانی حالات وحادثات کی مدھم رو سے گزرتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی منزل مقصود کو پہنچتا ہے۔معاشی بدحالی کا معاملہ ملک کے سماجی اور سیاسی حالات سے منسلک ہوتا ہے۔جمہوری یا غیر جمہوری نظام کے تحت جو حکمراں منتخب ہوتے ہیں وہ سب سے پہلے کسی نہ کسی شکل میں اس ملک کے معاشی حالات میں دخل اندازی کرتے ہیں جس سے وہاں کے مفاد متاثر ہوتے ہیں اور یہ مفاد ملکی نہ ہوکر اس بیرونی طاقت کی حمایت میں ہوتے ہیں جو اقتدار میں آنے کے بعد ذاتی منافع کی جانب زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ایسے میں بیروز گاری ، ناخواندگی ، فاقہ کشی کے ساتھ ملک کے صنعت وحرفت میں بھی گراوٹ آجاتی ہے۔اس طرح سے قومی ترقی میں خلل پڑتا ہے اور وہاں کے تہذیبی اور ثقافتی حالات بھی متاثر ہوتے ہیں۔لیکن جوقوم اس حالات سے نبرد آزما ہوکر اس کے مثبت یا منفی اثرات سے گزرتے ہوئے ایک انقلاب برپا کردینے کی طاقت رکھتی ہے اوراپنے حقوق کے لئے لڑ پڑتی ہے وہی آگے ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہے کیونکہ کسی بھی ملک کی ترقی کا انحصار اس ملک کے معاشی حالات پر ہوتا ہے جب تک وہ ملک معاشی طور پر مستحکم نہیں ہوگا تب تک اس کا سیاسی ،سماجی ، مذہی اور تہذیبی و ثقافتی معیار بلند

نہیں ہوگا اور اس کا کسی نہ کسی طرح استحصال ہوتا رہے گا۔

معاشی جبر کے خلاف مزاحمت واحتجاج کی وضاحت اور مثالیں تاریخ میں بے شمار ہیں لیکن اس ضمن میں انقلاب روس سب سے بڑا واقعہ ہے۔انقلاب روس اس لئے خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار خالص مادی نظریات پر مبنی معاشی استحصال اور اس سے نجات پانے کے لئے ایک وسیع وعریض ریاست کی تشکیل عمل میں آئی۔دبے کچلے ایسے عوام جن کا خوب استحصال ہوا اور ان کے حوصلے پست ہو گئے جب کہ وہ زندگی کے تئیں ترقی پسندانہ نقطۂ نظر رکھتے تھے انقلاب روس سے بے حد متاثر ہوئے۔کارل مارکس اور لینن نے سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی جس کے تحت دولت کی نابرابر تقسیم کو انقلاب کے بڑے اسباب میں شامل کیا گیا۔برصغیر میں بھی جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو استحصالی اور انسانی اقدار کے منافی سمجھنے کی روش عام ہوئی۔عالمی سطح پر نوآبادیاتی نظام سے چھٹکارا پانے کی جدوجہد سے ہندوستان میں چل رہی تحریک آزادی کو مزید تقویت ملی۔

انگریزوں نے جب ہندوستان میں قدم رکھا تو ان کا ارادہ تجارت کا تھا جو کہ معاشیات سے متعلق ہے چونکہ ہندوستان کو قدیم دور میں 'سونے کی چڑیا' کہا جاتا تھا اس لئے انگریز اس پر قبضہ کرکے وہاں کے معاشی معاملوں میں دخل اندازی کرکے استفادہ کرنا چاہتے تھے۔اس سے قبل ہندوستانی بادشاہوں کے پاس بے شمار دولت تھی جس کے سبب ملک کے معاشی حالات بہت اچھے تھے جس کے زیر اثر وہ ترقی کرتے گئے لیکن بعد میں مغل خاندان کے آخری دور کے شہزادوں اور باہری لوگوں کے حملوں کی وجہ سے ملک کے معاشی حالات بہت خراب ہو رہے تھے جس کا فائدہ اٹھا کر برطانوی حکومت نے یہاں اپنا قبضہ جما لیا اور یہاں کے عمرانی واقتصادی معاملات میں من مانے طریقے سے دخل اندازی کرنے لگے۔اس ضمن میں تاراچند لکھتے ہیں:

> ''غریبوں کی تعداد میں اضافہ ہوا غریب اور زیادہ غریب ہو گئے اور
> دولت منداور زیادہ دولت مند ہو گئے اور ان کی تعداد بھی بڑھ گئی۔
> دولت پیدا کرنے کے جو دو خاص ذرائع تھے یعنی زراعت اور صنعت
> ان میں سے مقدم الذکر زیادہ تر جمود کا شکار رہا.......سیاسی اور اقتصادی

> قوتوں کے اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک متوسط طبقہ نے جنم لیا یعنی
> ملک التجار تاجر مالکان بنک۔مہاجن۔مالکان اراضی۔لگان وصول
> کرنے والے ٹھیکیدار پیشہ ورآدمی وغیرہ وجود میں آئے ۔اور ان
> لوگوں کی تعداد اور دولت میں اورافزوں اضافہ ہوتا رہا۔'' [1]

اس طرح سے اقتصادیات کی مختلف النوع ترقی اور دولت کی غیر مساوی تقسیم نے ہندوستان کے سماجی حالات کو بھی متاثر کیا۔سرمایہ داراور جاگیردار کے ساتھ کسان اورمزدور وجود میں آئے جس کے سبب سرمایہ داروں کے ہاتھوں مزدوراور جاگیرداروں کے ہاتھوں کسانوں کا معاشی اور مالی طور پر استحصال ہونے لگا۔ذراعت ،تجارت ،صنعت وحرفت وغیرہ اس تبدیلی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے لیکن آخرکار انسان کی زندگی میں جہالت کے اندھیرے کے ساتھ علم کا سویرا بھی ہوتا ہے۔لہٰذا جدید تعلیم کا آغاز اسی لئے ہوا جو اس پریشانی کو بہت حد تک ختم کرنے میں مدد ومعاون ثابت ہوئی۔اس لئے جدید تعلیم اخلاقی کم اور کاروباری زیادہ ہے جس پر اکثر اعتراض بھی ہوتے آئیں ہیں لیکن بدلتے وقت اور حالات کے تحت ضرورت کو پورا کرنے والی اس تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔ماڈرن تعلیم یافتہ لوگوں نے اس اقتصادی حالات کے خلاف آواز اٹھائی ۔یعنی لینن کا کہنا تھا ''اصل سیاست وہاں شروع ہوتی ہے جہاں عوام ہوتے ہیں۔''

اس طرح ہندوستان کے اقتصادی حالات میں ایک انقلاب برپا ہوگیا عوام کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ ان کی محنت کے صلے میں کوئی برابر کا حقدار ہو اوران کا معاشی طور پر استحصال کرے اوران ہی کے ملک میں ان کی ہی پراپرٹی (Property) سے منافع کما کر بیرونی ممالک کے حکمراں اپنے ملک وقوم کی ترقی میں صرف کریں لہٰذا ان کومعاشی جبر کے خلاف انقلاب کی ضرورت واہمیت محسوس ہوئی۔

---

[1] (تاریخ تحریک آزادی ہند۔جلد سوم۔مترجم عدیل عباسی۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)۔

(4) مذہبی جبر کے خلاف مزاحمت واحتجاج

مذہب کا رشتہ انسان کے وجود سے وابستہ ہوتا ہے اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہی انسان کو کسی نہ کسی مذہب سے منسلک کر دیا جاتا ہے۔دنیا کے سبھی مذاہب چین وامن،انسانی حقوق اور بھائی چارے کو فروغ دیتے ہیں۔کسی مذہب میں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ دوسرے مذہب کی اطاعت نہ کرو لیکن ہر انسان اپنے اپنے مذہب کو ہی سب سے افضل سمجھتا ہے اور اسے دیگر مذاہب میں خرابی ہی نظر آتی ہے لہٰذا وہ دیگر مذہبی عقائد کو کھوٹا ثابت کرنے اور ان کے ماننے والوں کو گمراہ قرار دینے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور اس میں وہ اکثر کامیاب بھی ہو رہے ہیں،اور یہ محض یہیں تک محدود نہیں بلکہ اپنے مذہب ومسلک میں ہی فرقے ایجاد کر لیتے ہیں اور آپس میں ایمان وعقیدے کو زیر بحث لاتے ہیں جس کے باعث ان میں یکجہتی کا فقدان ہے۔اس طرح مذہب میں انتہا پسندی کے خلاف مزاحمت واحتجاج جنم لیتے ہیں۔

مذہب میں ریا کاری کا بھی تصور ہے مثلاً اکثر لوگ مذہبی رسومات کی آدائیگی پر زور دیتے ہیں جن کا مقصد انسانی واخلاقی اقدار کو فروغ دینا تھا،انہیں یہ نظر انداز کر کے دیگر مذہبی معاملوں میں الجھ جاتے ہیں۔مثلاً مسلمانوں میں پانچ وقت کی نماز، روزہ، زکوٰۃ، فطرہ،حج، تلاوت قرآن وغیرہ۔ ہندوؤں میں دریا میں غسل کرنا،دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا،ویدوں کو سننا اور سنانا،آرتی،گیروا لباس۔ عیسائیوں میں کلیسا میں ہونے والی عبادت، بائبل وغیرہ کی تلاوت وغیرہ کے ذریعے مذہبی ظاہر داری کو تو فروغ ملتا ہے لیکن اس کے اصل مقصد کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے پس پردہ سیاسی رویوں کو عملی جامہ پہنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ایسے میں ہر مذہب کا باشعور طبقہ اس روش پر ہمیشہ سے تنقید کرتا آیا ہے۔کیونکہ جب جب مذہب میں انتہا پسندی غالب آئی ہے تب تب اس کے خلاف کھل کر احتجاج ہوا ہے ۔تاریخ کے صفحات ان سے بھرے پڑے ہیں۔ویدک عہد میں یہ احتجاج اپنے عروج پر تھا جس کے بعث انسانی حقوق کے تحفظ کے مسئلے بڑھتے گئے جنھوں نے دیگر مذاہب کو فروغ دیا۔ڈاکٹر قمر رئیس اپنے مضمون ’’ادب میں اختلاف،انحراف اور احتجاج کی معنویت‘‘ میں مذہبی

احتجاج کی ایک مختصر سی تاریخ پیش کی ہے:

''ڈھائی ہزار سال قبل بدھ اور مہاویر نے برہمنیت کے جبر و بیداد، عدم مساوات اور دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے جانداروں کی قربانیوں کے خلاف کھل کر احتجاج کیا تھا۔ جس کے عناصر قدیم جا تک کہانیوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ بعد کے دور یعنی عہد وسطی میں سنت کبیر اور گرو نانک جیسی برگزیدہ روحانی شخصیتوں نے بھی سماجی اونچ نیچ، دوراز کار برہمنی رسم ورواج اور بت پرستی کے خلاف اپنے اشعار اور بانیوں میں واضح مزاحمانہ رویہ اختیار کیا۔ اسی طرح دنیا کی دوسری اصلاحی، متصوفانہ اور باغیانہ تحریکوں کے بانیوں نے اپنے ملفوظات اور تحریروں میں سماج کی انسان دشمنی طاقتوں کے خلاف انسانی وقار اور انسانی حرمت کو محفوظ بنانے کی مسلک کی اشاعت کی۔ یہ ان باغی اور احتجاجی تحریکوں کا اثر تھا کہ انسانی تہذیب اور سماج میں ہم آہنگی پیدا ہوئیں اور نئ تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔'' [1]

مذکورہ بالا قول کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر دور میں ایسے مذہبی معاملے بھی درپیش آئے ہیں جن کو سماجی اور سیاسی نظریے سے دیکھنے پر کچھ اور ہی نتیجے نکلتے ہیں۔ مذہب کے نام پر سماج میں ذات پات کو فروغ دیا گیا اور اس کے سبب نیچی ذات والوں سے وہ سارے حقوق چھین لئے گئے جو ہر مذاہب میں سب کے لئے برابر تھے۔ اس تقسیم ذات نے ہمارے ملک وقوم کی یکجہتی کو بہت نقصان پہنچایا۔ ہر مذہب نے انسانی مساوات، اہنسا، امن اور فلاح و بہبود کا راستہ دکھایا مگر زمانے کی برق رفتاری کے ساتھ غیر صحت مند روایتیں داخل ہوگئیں اور لوگوں نے اصل تعلیم کو بھلا دیا۔ ہندوستان میں یہ سیکولر روایتیں بہت پہلے سے تھیں لیکن اس کو سیاست کے ساتھ منسلک کر کے اس کے اصل مقصد و مفہوم کو دوسری جانب موڑ دیا گیا۔ سیکولرزم کے مفہوم کی وضاحت کچھ یوں ہے:

''کیمبرج ڈکشنری کے مطابق سیکولرزم سے مراد ایسے سماج سے

---

[1] (تاریخ تحریک آزادی ہند۔ جلد سوم۔ مترجم عدیل عباسی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ نئی دہلی)۔

ہے جہاں ریاست، اخلاقیات اور تعلیم کو مذہب سے آزاد رکھا جائے۔'' ۱

سیکولرزم کے متعلق ڈاکٹر مجیب اشرف آگے فرماتے ہیں:

''دنیا کے سارے مذہب، انسان اور سماج کی بہبود کا پیغام دیتے ہیں۔مگر ہوا یہ کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ غیر صحت مند رسموں اور روایتوں نے جڑ پکڑلی۔اصل مذہبی تعلیم کو بھلادیا گیا اس کے بہت سے اسباب ہیں۔اس خرابی کے سب سے بڑے ذمہ دار موقع پرست عالم ہیں اور حکمراں طبقہ ادھر مذہب کی ناکافی معلومات رکھنے والے پروہتوں اور مذہبی رہنماؤں نے بھی عوام میں گمراہی پھیلائی ہے۔ سماجی کٹرپن، بھاؤ بھید اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کردیا ہے۔رواداری، فراخ دلی اور روشن خیالی اور اتحاد جیسی بہتر انسانی اقدار کے خلاف مہم جاری ہے۔لیکن سائنسی دور میں دقیانوسی خیالات کی کوئی گنجائش نہیں۔رجعت پسندی ایک لعنت ہے۔'' ۲

ابھی تک محض قدیم ہندوستان کی سیکولر روایات کو مثال کے طور پر پیش کیا جارہا ہے اب جدید ہندوستان میں سیکولر کی چند مثالیں بھی پیش نظر ہیں۔اٹھارہویں صدی کے وسط میں ہندوستان کے سیاسی حالات کا تذکرہ کیا جائے تو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد خودمختار ریاستیں عروج بام پر پرآئی۔ایک طرف بیرونی حملے میں جس میں سکھ، جاٹ، راجپوت اور مراٹھے وغیرہ تھے اور دوسری طرف اندرونی بغاوتیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کا بنگال پر سیاسی تسلط، ولیم بینٹک کی سماجی اصلاحات، راجہ رام موہن رائے کا برہمو سماج، دیانند سرسوتی کا آریہ سماج، رام کرشن مشن، سرسید کی علی گڑھ تحریک، دیوبند تحریک، پرارتھنا سماج وغیرہ مذہب کی ظاہرداری کو فروغ تو دیتے تھے لیکن اس میں ریاکاری کے خلاف بغاوت بھی اور ان کے ذریعے صحت مندانہ سماج وجود میں آیا۔آگے چل کر آزادی کی تحریک جب اپنے شباب پر پہنچی تو کانگریس کا قیام، گاندھی جی کا عروج، مسلم لیگ کا قیام، نہرو کا

---

۱ (قدیم ہندوستان کی سیکولر روایات، ڈاکٹر مجیب اشرف، نئی آواز جامعہ نگر دہلی 1988ء ص:8)

عروج، محمد علی جناح اور لاہور قرارداد، آزادی وطن اور تقسیم ہند وغیرہ ایسے واقعات ہیں جنہوں نے ہندوستان کی سیکولر روایت کی جڑیں ہلا دیں۔ کینسٹو یل ایسمتھ نے سیکولرزم کی تین قسمیں بتائی ہیں:

> ''اول مذہبی تصور جس کے تحت ریاست، اور چرچ، اپنے اپنے دائرے میں آزادانہ طور پر کام کرتے ہیں۔ دوم ہندو سیکولرزم، جس کے تحت تمام مذاہب کو یکساں طور پر پھلنے پھولنے کی آزادی ہے۔ اور تیسرا تصور قومی سیکولرزم کا ہے جس کے مطابق ملکی اور قومی مفاد کو زندگی کے کچھ معاملات پر ترجیح دی گئی ہے۔'' ۱

آزادی کے بعد کے جو حالات تھے اس سے متعلق جناب اختر بستوی فرماتے ہیں:

> '' بیسویں صدی میں سیکولرزم کے مثبت اور صالح تصور کی سب سے روشن مثال اس وقت سامنے آئی جب ہندوستان میں بیرونی تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے بعد وہ جمہوری آئین نافذ کیا گیا جو مکمل طور پر سیکولر کردار کا حامل ہے۔ اس آئین کے ذریعے آزاد ہندوستان نے نہ صرف یہ کہ سیکولر ریاست کا سب سے بہتر نمونہ پیش کیا بلکہ اس کی روشنی میں ہمارے ملک میں ایک ایسے سیکولر انداز نظر نے فروغ پایا جسے بلا شبہ مثبت اور صالح سیکولرزم کا سب سے زیادہ نکھرا ہوا روپ قرار دیا جا سکتا ہے۔'' ۲

مختصر یہ کہ ہمارے ملک میں دور قدیم سے آج تک مذہبی سیکولرزم کا جو نظریہ چلتا چلا آیا ہے اس میں سیاست کی دخل اندازی کے سبب سیکولرزم کے مفہوم کو بھٹکا دیا گیا جس کے زیر اثر مذہب کے خلاف بھی مزاحمت و احتجاج کی ضرورت و اہمیت درپیش آئی۔

---

۱ (جدید ہند کے سیکولر معمار، ڈاکٹر محمد اشرف، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی 1989ء ص: 24)

(5) تہذیبی وثقافتی رویوں کے خلاف مزاحمت واحتجاج

اس کے تحت کسی مخصوص تہذیب وثقافت کے خلاف ناراضگی یا ناپسندیدگی کا اظہار کرنا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ تہذیبیں زمانے کے لحاظ سے تبدیل ہوتی رہی ہیں۔اوراس تہذیبوں سے متعلق قومیں جیسے جیسے ترقی کرتی گئیں ویسے ویسے ان کی تہذیبوں میں بدلاؤ آتا گیا۔جس قوم نے دوسری قوم کو فتح کیا اس پر اپنی تہذیبیں بھی مسلط کردیں جس کے باعث نئ تہذیب وثقافت وجود میں آتی رہیں جس میں آریوں کی تہذیب، وادی سندھ کی تہذیب، دراوڑوں کی تہذیب، یونانی تہذیب، اسلامی تہذیب اورمغربی تہذیب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔فاتح قومیں مفتوح قوموں کی تہذیبوں پر خود بخود غلبہ حاصل کرلیتی ہیں اورمفتوح قوموں کا اثر بھی فاتح قوموں کی تہذیب پر پڑتا ہے۔مثال کے طور پر مسلمانوں نے جب ہندوستان پر حملہ کیااوروہاں حکومت کرنے لگے تو وہ بھی اپنی تہذیب کو وہاں پر چھوڑ تو گئے لیکن یہاں کی تہذیب کے اثرات سے دامن نہ بچاپائے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنی تصنیف ''ہندوستان کی تحریک آزادی اوراردوشاعری'' میں فرماتے ہیں:

> ''اٹھارہویں اورانیسویں صدی میں ہمارے سیاسی زوال کے باوجود باہمی محبت اور روا داری کے رشتے مضبوط تھے۔اس دور کی اردو شاعری کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان ایک بیرونی قوم کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے لیکن اس ملک کواپنا وطن بنالینے کے بعد عرب و ایران کی تہذیب ومعاشرت سے کہیں زیادہ وہ مقامی ماحول اور یہاں کے رسم ورواج سے گہرے طور پر متاثر ہوئے یہ اثرات کسی بھی سطح پر ایک طرفہ نہیں تھا۔مسلمانوں نے اگر ہندوستانی تہذیب و تمدن کو بہت کچھ دیااوراس میں گراں بہاں اضافہ کیاتو دوسری طرف وہ خود بھی ہندوستانی معاشرت کے رنگ میں اتنے گہرے رنگ گئے کہ روزمرہ کی زندگی میں نئ نئ رسمیں پیدا ہوئیں۔''[1]

---

[1] (ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

کسی بھی ملک ،علاقے یا گروہ کی تہذیبی شناخت جیسے:فنون لطیفہ،لباس وطعام، آداب و نشست وبرخاست اور زبان وغیرہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ یاان کی جگہ دیگر تہذیب کوان پر مسلط کرنا اورکسی مخصوص تہذیب وثقافت کے تحت زندگی گزارنے کی پابندی تہذیبی وثقافتی جبر کے خلاف مزاحمت واحتجاج سے منسوب ہوگی۔کسی بھی قوم یا گروہ کی تہذیب خواہ وہ کتنی پرانی ہی کیوں نہ ہوں ان کو بڑی عزیز ہوتی ہیں اوروہ اس تہذیب کواپنے ملک،قوم یا گروہ سے اس طرح منسلک کرتے ہیں کہ کوئی بھی شخص ہرکام اپنی تہذیب کے دائرے میں ہی رہ کرانجام دیتا ہے۔ایسانہیں ہے کہ یہ تہذیبیں نہیں بدلتی ۔تہذیبیں تبدیل بھی ہوتی ہیں اوران کا زوال بھی ہوتا ہے لیکن یہ سیاسی یا سماجی سطح پراور بڑے پیمانے پرتبدیل ہوتی ہے۔اس کا سب سے بڑا سبب ہے باہری حملہ، جوکسی قوم ملک کی طرف سے دوسری قوم یاملک پر ہوتا ہے اوردوسراسبب ہے کسی دوسری تہذیب سے متاثر ہوکراپنی تہذیب کوترک کردینا جس کے باعث وہ تہذیب زوال آمادہ ہوجاتی ہے اوراس کی جگہ نئ تہذیب کا سورج طلوع ہوتا ہے۔مثال کے طور پر ہندوستان پرانگریزوں نے جب قبضہ کیا تو مشرقی تہذیب وثقافت پر مغربی تہذیب وثقافت غالب آگئی جس کے باعث وہاں کی زبان،فنون لطیفہ، مجلس آداب بھی متاثر ہوئے۔چونکہ زبان ثقافت کاایک اہم جز ہے اس لئے یہ سب سے زیادہ متاثر ہوئی اور یہ صورت حال لسانی جبر سے موسوم ہوتی ہے۔زبان کے معاملے میں اردو کی پیدائش پرنظر ڈالی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اردو بھی مسلم وہندو دونوں تہذیبوں کے اشتراک سے وجود میں آئی ۔اس سلسلے میں سنجیدہ نقاد شمیم حنفی صاحب رقم طراز ہیں:

> ''تاریخ کے اعتبار سے تو یہ بالکل درست ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے اشتراک سے یہ زبان وجود میں آئی ہے، خواہ اس میں غالب حصہ مسلمانوں کا ہو۔اس غالب حصے کی توجیہہ بھی، کچھ عرصہ ہوافراق صاحب نے بڑے انصاف کے ساتھ کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ جس وقت اردو ترقی کررہی تھی،اس وقت مسلمانوں کی تخلیقی صلاحیت اورلسانی حس ہندوؤں سے زیادہ تیز تھی اور اسی وجہ

> سے مسلم کلچر کا رنگ اتنا زیادہ اردو پر چڑھتا گیا۔ جس وقت مسلمانوں کو
> اس بات کا احساس پیدا ہوا کہ اردو میں ہندو تہذیب کے اثرات کم
> ہیں تو انہوں نے خود بڑی خوشی سے ہندو دیو مالا کے تصورات
> اور ہندی کے بیسویوں لفظوں کو اردو میں داخل کرنا شروع کر دیا۔'' [۱]

(6) تاریخی جبر کے خلاف مزاحمت و احتجاج

کسی ناخوشگوار تاریخی واقعات جو انسانی زندگی کو بے حد متاثر کرے اس کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار تاریخی جبر کے زمرے میں آئیں گے اور اس کے خلاف ناآسودگی کا اظہار مزاحمت سے موسوم ہوگا۔ دنیا کے بہت سے واقعات ہیں جس نے انسانی زندگی کو بہت متاثر کیا۔ عالمی جنگیں، سوویت یونین کا بکھرنا، دیوار برلن کی تعمیر، امریکہ کا جاپان پر حملہ اور بم بلاسٹ وغیرہ جیسے عالمی واقعات اور حادثات سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں جس سے انسانی زندگی کئی نسلوں تک متاثر ہوتی رہی ہے۔ برصغیر کی بات کی جائے تو اس میں تقسیم ہند اور اس کے بعد کے واقعات جو اس کے نتیجے میں درپیش آئے ان میں فرقہ وارانہ فسادات، ہجرت، ہند و پاک، جنگیں، کشمیر کا مسئلہ، چین کا حملہ وغیرہ ایسے واقعات ہیں جس کی خونچکاں داستان تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی اور جس نے ملک کے سماجی و سیاسی حالات اور عام انسانوں کی زندگی کو بیحد متاثر کیا۔ انقلاب روس، انگلینڈ، امریکہ کی جنگ، چین کی جنگ، نازیزم، فاسزم، ایران وعراق کے درمیان معرکہ آرائی، ۱۱/۹ کا حادثہ، افغانستان اور عراق پر امریکی فوج کی کاروائی وغیرہ ایسے واقعات و حادثات ہیں جو تاریخی جبر کے زمرے میں شامل ہیں۔ اگر ہم تاریخی جبر کے خلاف مزاحمت و احتجاج کو فراموش کر دیں تو ہمیں اپنی قوم یا ملک کی اہمیت کے متعلق کچھ علم نہ ہوگا۔

---

۱ (غالب نامہ، ہمارا ادبی اور تہذیبی ورثہ، جلد 30، شمارہ 2، جولائی 2008، غالب انسٹی ٹیوٹ

(7) ادبی جبر کے خلاف مزاحمت واحتجاج

اس کے تحت ادبی تعطل، ادبی بے ضابطگی اور ادبی ثقہ بندی کے خلاف مزاحمت واحتجاج کیا جاتا ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو ادب تخلیق کرنا خود اپنے آپ میں ایک مزاحمتی عمل ہے کیونکہ ہم جس شے یا واقعے سے ناآسودہ ہوتے ہیں یا اسے ناپسند کرتے ہیں اس کے خلاف جرأت انکار کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے یہ انکار ہمارے باطن میں پیدا احساس کے سبب جاگتا ہے اور یہ احساس اضطراب کی صورت میں تلملایا ہوا سا دھیرے دھیرے اپنی تلخی کے ساتھ بڑے ہی ناخوشگوار حالات میں ناپسندیدگی کے ساتھ پھوٹ پڑتا ہے۔ چونکہ شاعر و ادیب عام آدمی کے بہ نسبت زیادہ حساس ہوتے ہیں اس لئے وہ ان کو اپنی احاطۂ تحریر بلکہ تخلیق میں بھی شامل کرتے ہیں کیونکہ ادب ہی ایسا وسیلہ اظہار ہے جس کے ذریعے ہماری بات کی رسائی عوام تک ہوسکتی ہے اور بغیر عوام کے کوئی بھی ملک یا قوم ترقی نہیں کرسکتے۔ مشہور نقاد پروفیسر قمر رئیس صاحب اپنے معرکہ آرا مضمون ''ادب میں اختلاف، انحراف اور احتجاج کی معنویت'' میں ادب میں مزاحمت واحتجاج کی ضرورت واہمیت کو اس طرح واضح کرتے ہیں:

> ''کوئی بھی دور ہو اور کتنی ہی تعزیری شخصیتوں کا اندیشہ ہو احتجاج اور سرکشی کے بے اماں جذبہ کے اظہار میں ادیب اپنے آپ کو بے اختیار پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سامنت شاہی اور جاگیرداری کے عہد میں بھی انحراف اور مزاحمت کا ادب ملتا ہے کم وبیش ہر زبان کے ادب اور لوک ادب میں احتجاجی اظہار کی مستحکم روایت کا سراغ دیکھا جاسکتا ہے لیکن یہ اظہار اکثر راست نہیں بالواسطہ صورت میں ملتا ہے۔ یعنی رمز و کنایہ اور استعارہ و تمثیل کے پیکروں میں اسے زیادہ موثر اور دھاردار بنانے کے لئے تخلیق کار طنز و ظرافت کے حربے سے بھی کام لیتا ہے۔ یہی نہیں اساطیر قصے، کہانیوں، حکایتوں اور حیوانوں

> اور پرندوں کے افسانوں میں بھی سماجی نظام کی بوالعجبیو ں کے خلاف
> احتجاج اور بیزاری کا شدید احساس نمایاں نظر آتا ہے۔'' ۱؎

ادب میں کوئی بھی شے حرف آخر نہیں ہوتی اس سے تو سبھی واقف ہیں خواہ نظم ہو یا نثر، تحریکات ہو یا رجحانات ،موضوعات ہوں یا اصول ہر دور میں تبدیلی کے اثرات کے ساتھ نمایاں ہیں ۔ ہر ایک تحریک اپنے موضوع اور مقاصد کے ساتھ چلتی ہے اور اس طرح قدیم اصول و ترتیب کی جگہ نئے موضوعات اور ضابطہ کو پروان چڑھایا جاتا رہا ہے اور اس طرح ادبی جبر کے خلاف احتجاج کیا جاتا رہا ہے جو کہ وقت کے ساتھ لازم و ملزوم بھی تھا کیونکہ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے اور جیسے جیسے سماج کے حالات تبدیل ہوتے ہیں ویسے ویسے ادب میں بھی تبدیلی آتی جاتی ہے۔ ہر ادب اپنے دور کا احاطہ کرتا ہے اس لئے ادب میں ہر دور کے موضوعات بنتے ہیں ۔مشہور و معروف نقاد ڈاکٹر ارتضیٰ کریم صاحب اپنی مرتب کردہ تصنیف میں ''اعتزار'' کے عنوان سے رقمطراز ہیں :

> ''یہ سچ ہے کہ ہر عہد کا ادیب اپنے زمانے کے جبر رواں نظام کی بے
> چینی نیز عوام کی بے بسی سے مضطرب ہو کر ہی قلم اٹھاتا ہے اور کوشش
> کرتا ہے کہ اس درد کو جو اس کے عہد نے اسے دئے ہیں، صفحۂ قرطاس
> پر کچھ اس نوع سے بکھیرے کہ اس کی آواز ہر عہد کی آواز میں شامل
> ہو سکے، اگر وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوتا ہے تو اچھا ادیب ظہور
> میں آتا ہے ورنہ ادب کو نعرہ میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔'' ۲؎

اردو ادب میں ایک کے بعد ایک تحریکیں سامنے آتی گئیں جن میں سے اکثر ایک دوسرے کی ضد پر تھیں، کچھ ایک دوسرے کی توسیع اور کچھ ردعمل کے طور پر بھی استعمال کی گئیں ۔ یہ محض اردو ادب میں ہی نہیں تھا بلکہ پوری دنیا کے یا ہر زبان کے ادب میں تھی ۔کسی مخصوص ادبی رویے یا تحریک کے خلاف بھی مزاحمت کی مثالیں مل جاتی ہیں ۔اردو ادب کی تاریخ میں دیوان ولی کی آمد ۱۷۲۱ سے قبل کے دور کو ریختہ گوئی کا دور کہا جاتا ہے ۔ریختہ گوئی کے اس دور میں زبان صرف ذائقہ بدلنے کی چیز سمجھی جاتی تھی اور فارسی گو شعرا کبھی کبھار محض خوش طبعی کے لئے ریختہ میں طبع آزمائی کر لیتے

۱؎ (اردو ادب میں احتجاج اور مزاحمت کے رویے، مرتب ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، اردو اکادمی دہلی 2004ء ص:22)

تھے۔ ریختہ کو اس دور کے ادبی ماحول میں شعری اعتبار حاصل نہ ہوسکا۔ فارسیت کی تحریک ابھی جاری ہی تھی کہ اسے ایک شدید جھٹکا لگا۔ وہ تھا ایہام گوئی کا شدید رجحان جس نے اردو سے فارسیت کے خط وخال کو دھندلا کر رکھ دیا۔لیکن اپنی تھوڑی سی زندگی میں ایہام گوئی نے اردو کی ادبی ارتقا میں بہت کچھ اضافہ کیا۔شاہ حاتم اس دور کے سب سے اہم شاعر تھے اوران کا ''دیوان زادۂ حاتم'' ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ترک ایہام گوئی کی تحریک ادبی جبر کے خلاف مزاحمت واحتجاج کا جیتا جاگتا ثبوت ہے اوراس کے علمبردار مرزا مظہر جان جاناں تھے۔

اردونظم نگاری کی تحریک بھی ادبی مزاحمت کی ایک اعلیٰ مثال ہے جس کے ذریعے نظم نگاری کو فروغ ملا، جدید مشاعروں کی داغ بیل پڑی، ہئیتی تجربوں کا رجحان پروان چڑھا۔جس کی کامیابی کا سہرا مولانا الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی اوران کے رفقا کے سر بندھتا ہے۔ادھر اس سے قبل نظیر اکبرآبادی کی موضوعاتی نظموں کو کلاسکی دور کا دوسرا مزاحمتی رویہ کہہ سکتے ہیں۔اس کے بعد علی گڑھ تحریک اردوادب میں ایک مزاحمتی واحتجاجی فضا قائم کرتی ہے جو خالص ادبی تحریک تو نہیں تھی لیکن اس سے اردوشعروادب کو ایک نئی جہت ملی۔پھر یکے بعد دیگرے رومانویت اور کلاسکیت کی تحریک ابھر کر سامنے آتی ہے۔موضوعات کے لحاظ سے بڑا مزاحمتی اوراحتجاجی رویہ تب وجود میں آیا جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ یہ ایک بڑی اور منظّم تحریک تھی جس نے حسن کے معیار کو کافی حد تک تبدیل کیا اور ادب برائے زندگی کے نعرے بلند کئے۔ڈاکٹر منظر اعظمی صاحب ترقی پسند تحریک کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہیں:

> '' فطرت پرستی کے رجحان میں حقیقت نگاری کا رنگ بھر گیا۔اوران تمام قدیم اوربعض فرسودہ قدروں سے بغاوت کا اعلان کیا گیا جو ترقی پسند نہیں تھیں.........اس کی رو بغاوت آہنگ تھی۔ دراصل اس تحریک کا مسلک ہی اشتراکی اورعوامی انقلاب تھا۔اگر چہ اس تحریک نے اپنا رشتہ ملکی آزادی کی جدوجہد اور جمہوریت سے جوڑا مگر بہت جلد یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ اس تحریک کا اصل مقصد اشتراکی

انقلاب تھا۔اور یہ ادب سے زیادہ اشتراکیت کی نقیب بن گئی۔'' [۱]

ترقی پسند مصنفین کے منشور سے اختلاف رکھنے والے ادیب وشعرا نے ایک نئی جماعت بنائی جس کا نام حلقۂ ارباب ذوق رکھا جس میں داخلی تپش، ابہام اور نئے استعارے تھے، سیاسی موضوعات کی ممانعت تھی بعد میں اس کی بھی متعدد شاخیں کھلیں۔ علاوہ ازیں بہت سی اصناف کے متعلق بھی مزاحمت واحتجاج نظر آتے ہیں۔ مثلاً غزل پر طنز اور اس کی اہمیت سے انکار، آزاد اور نثری نظم اور نظم معرّا بھی وقت اور حالات کے خلاف اور ضرورت کے لحاظ سے وجود میں آئیں۔ ادب میں اجتماعیت کی جگہ یگانگت کو فروغ دیا جانے لگا یہ بھی ایک مزاحمتی عمل تھا اور اس کے تحت جدیدیت کی تحریک وجود میں آئی جو کسی بندھے ٹکے اصول پر مبنی نہ تھی۔

اس کا کوئی فائدہ نہیں یہ تو ایسا ذہنی رویہ، طرز احساس اور نئی روہے جو کسی تقلید، اصول و ضابطے کی قائل نہیں۔ اس طرح سے ادب میں یکے بعد دیگرے اور نت نئے تجربوں نے اسے وقت وقت پر نیا رجحان دیا۔ پھر اس کے بعد مابعد جدیدیت کی تحریک بھی ایک نیا مزاحمتی رویہ تھا اور تانیثیت کی تحریک اور دلت ادب کی تحریک وغیرہ بھی اردو ادب میں اپنا خاص مقام رکھتی ہیں۔ ادب میں یہ تحریکیں بڑی تبدیلی کے ساتھ رونما ہوئیں۔ یہ تبدیلی اس لئے ضروری تھی کیونکہ بدلتے وقت اور حالات کے ساتھ پرانے اصول وضوابط کی جگہ پر نئے نئے تجربے زیادہ کارآمد تھے چنانچہ ادبی جبر کے خلاف مزاحمتی اور احتجاجی روش نے ادب میں مختلف نوعیت کے فکر وفن کو جنم دیا۔

---

۱ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔ ڈاکٹر منظر اعظمی۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ

ادب سے مزاحمت واحتجاج کا رشتہ (شاعری کے حوالے سے)

انسان خیالات وجذبات کا مجموعہ ہے۔کسی بھی شے کو دیکھ یا سن کرفوراً اظہارِ خیال کرتا ہے یہ خیالات اس کے جذبات سے پیدا ہوتے ہیں۔انسان کے جذبات واحساسات کا زبان وبیان کے دلکش پیرائے میں اظہار کرنا ہی ادب ہے۔سائنسی خیالات میں ربط ونظم قائم کرتا ہے اوراس کا واسطہ عقل سے ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ خیالات میں تراش خراش کرتا ہے لیکن اس کا جذبات سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔جذبات کو جگانے ،بنانے ،سنوارنے ،نقش ونگارش،اشارات والفاظ کے ذریعے اس کی ترجمانی کا کام آرٹ کا ہے اورادب آرٹ کا ایک اہم حصہ ہے۔ادب دراصل ایک فرد کا تخلیق کردہ ہوتا ہے اورفرد معاشرے کا حصہ اورایک تہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے۔ادیب اپنی جذباتی کیفیات کوالفاظ کا جامہ پہنا کراظہاروابلاغ کا ذریعہ بناتا ہے۔اس طرح ادب جذبات کی اس بولتی ہوئی تصویر کی مانند ہے جووقت اورحالات کے ساتھ اپنا رنگ بدلتی رہتی ہے۔اس کا ایک رخ انسان کو ہنساتا ہے تو دوسرا رخ رلاتا ہے،ایک رخ یاس وامید پیدا کرتا ہے تو دوسرا رخ ناامیدی کی طرف مائل کردیتا ہے۔ادب سے متعلق ڈی بونالڈ کا قول کتنا معنی خیز ہے:

"Literature is expression of society." [1]

ادب معاشرے کا وسیلۂ اظہار ہے۔ہر دور کے ادب میں اس زمانے اوراس معاشرے کے خدوخال نظر آتے ہیں اوراس کا ایک مقصد بھی ہوتا ہے۔وہ اپنے خیالات کے ذریعے اس ماحول کو پیش کرنا چاہتا ہے جن سے وہ ناآسودہ ہے اورقارئین کو اس حالات سے واقف کرانے کی کوشش وسعی کرتا ہے۔اس کے خیال معاشرے کے اردگرد چکر لگاتے رہتے ہیں وہ زندگی کے تمام گوشوں،انسان کے تمام مشاغل ،کائنات کے تمام مظاہر اورگوشے گوشے میں بکھری ہوئی صداقتوں کو اپنی تخلیق کا موضوع بناتا ہے۔اس کا معاشرے سے گہرا تعلق ہوتا ہے اگر اسے اپنے گردوپیش کے حالات سے پورے طور پر واقفیت نہیں ہوتی اوروہ ان انقلابات وحادثات کے متعلق پورا علم نہیں رکھتا اوراس کے اثرات سے بھی بے خبر رہتا ہے تو ادیب کی قلم سے کبھی بھی زندہ تخلیق وجود میں نہیں

---

1 {literature and society:De Bonald-oxford press-London-1962-P.N.321}

آسکتی۔ترقی پسند نقاد اختر حسین رائے پوری نے اپنی مشہور ومعروف تصنیف ''ادب اورانقلاب'' میں اس بات کا اعتراف کیا ہے:

> ''ادیب سماج کے مطالبات اوراپنے گرد وپیش سے ہر انسان کی طرح متاثر ہوتا ہے وہ جس زمانے میں جس تہذیب وتمدن کی گود میں پرورش پائے گا،جن لوگوں کے ساتھ رہے گا اور جن روایات و خیالات کا حامل ہوگا وہ یقیناً اس کے جذبات کو رنگ وروپ دیں گے اس لئے میری ناچیز رائے میں کسی ادیب کی روح کو سمجھنے کے لئے اس فضا کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے جس میں اس نے پرورش پائی۔جب تک اس زمانے کی زندگی نہ سمجھی جائے یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ ادیب نے یہی کیوں کہا اس کے خلاف کیوں نہیں کہا اس لئے کہ ادیب اپنے جذبات کی نہیں اپنی فضا کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔اس کی زبان سے اجتماعی انسان بول رہا ہے۔'' [۱]

ادیب کی ایک حیثیت معاشرے کے ایک فرد اور سماجی کارندے کی بھی ہوتی ہے لہٰذا ان کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ گرد وپیش کے سماجی وسیاسی تحریکیں اور غیر مساوی حقوق کی جانب توجہ دیں جس کے باعث جبر واستبداد ظلم واستحصال کے خلاف ادب کو ذریعہ بنا کر مزاحمت واحتجاج کا علم بلند کریں۔ادب کو زندگی سے قریب لانے میں بھی انہیں ادیبوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے جنھوں نے بڑی محنت ومشقت سے ادب اور زندگی کے رشتے کو مزید تقویت بخشی اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ہو رہے استحصال کے خلاف آواز بلند کر کے ادب اوراحتجاج کو بھی ایک دوسرے سے ایسے منسلک کر دیا کہ ان کی تفریق مشکل ہوگئی۔ادب اور مزاحمت کے رشتے پر غور کرتے ہوئے ابرار احمد اپنے معرکہ آرا مضمون ''مزاحمتی ادب'' میں اس کی وضاحت کچھ یوں کی ہے:

> ''ادب تخلیق کرنا' بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے کیونکہ ادیب اپنے گرد وپیش سے کنفرم (Confirm) نہیں کر پاتا اوراس کشمکش کی بنیاد

---

۱ (ادب اور انقلاب، اختر حسین رائے پوری، ادارۂ اشاعت اردو حیدر آباد 1943ء ص: 12-13)

پر وہ ادب تخلیق کرتا ہے۔اس طرح سے تو ساراادب مزاحمتی ہے اور

ہرادیب باغی۔'' ۱؎

مذکورہ بالاقول سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ادب اور مزاحمت واحتجاج شیروشکر کی طرح ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں جن کی تفریق مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ادیب اپنے قلم کے ذریعہ ادب کووسیلۂ اظہار بنا کراپنے گردوپیش کے حالات کوپیش کرتا ہے جس کے سبب عوام میں بیداری اورطلاطم برپا ہوجاتا ہے۔اس سے متعلق ژاں پال سارتر کہتا ہے ادیب کاقلم اس کا ہتھیار ہے ،سارتر کے اس قول میں بڑی صداقت ہے۔کیونکہ بڑے بڑے ادباء اورشعراء نے اپنی تخلیق کے ذریعہ دنیامیں انقلاب کی فضا ہموار کی ہے۔انہوں نے کبھی سماجی،کبھی معاشی،کبھی سیاسی تو کبھی تہذیبی جبر کے خلاف احتجاج کیاہے جن کے ذریعہ ان کوانساف بھی ملااور انہوں نے اپنی موجودگی اور اپنے منفرد وجود کا احساس بھی کرایا۔یوں تو ادب کے دو حصے ہیں نظم اور نثرلیکن یہاں میرامیدان فقط شاعری ہے۔یہاں شاعری کے حوالے سے مزاحمت واحتجاج کے رشتے کامختصر جائزہ پیش نظر ہے۔

اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کا سیاسی نقشہ کافی حدتک تبدیل ہو چکا تھا۔جنوب میں مرہٹھوں اورشمال میں جاٹ اورسکھ،مغل سلطنت کے علاقے پرقابض ہو رہے تھے۔مغل سلطنت پہلے کی بہ نسبت اب کمزور ہوچکی تھی اوران طاقتوں پرفتح پانا اب اس کے لئے مشکل تھااس لئے ہرٹکراؤ کے بعدوہ ان سے سمجھوتہ کرلیتی تھی۔مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی بہادری اورشجاعت کے ذریعہ ان مرہٹھوں کومنھ توڑ جواب دیا اورمسلسل حملوں سے مرہٹھوں کی شکست ہوتی چلی گئی لیکن عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷) کے بعدپھر سے مرہٹھوں کے حوصلے بلند ہوگئے۔اورنگ زیب کے بعد بہت سے مغل بادشاہ تخت نشین ہوئے لیکن وہ اس قابل نہ تھے کہ اپنے علاقوں کومحفوظ رکھ سکیں۔اب وسیع مغل سلطنت منتشر ہونا شروع ہوگئی۔جہاں ایک طرف پورا شمالی ہنداس سے متاثر تھاوہاں ہمارے شعراء پراس کا اثر کیسے نہ ہوتا۔اس دور میں فارسی شعری روایت سے مغلوب ادبی ماحول میں ہم ایک ایسے شاعر کی آواز سنتے ہیں جوفارسی ادب کی سنجیدگی اورلطافتوں کے خلاف احتجاج کرتا ہوانظرآتا ہے اوروہ ہے جعفر زٹلی جو ہندوستانی اشرافیہ کے لئے اپنی ہجویات کے باعث ایک دہشت بن گیا تھا۔وہ اپنے عہد کی

۱؎ ... (65: ،2004ء ... [illegible]

سماجیات کا نقاد تھا اوراس سخت ماحول میں اس نے ہزلیہ اورہجو یہ شاعری کی ۔مغلوں کے زوال کے حوالے سے اس نے اردو میں یہ نظم پیش کی ۔ چنداشعار ملاحظہ ہوں۔

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے

نہ یادوں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے

ہنرمندان ہرجائی پھریں در در بہ رسوائی
رزل قوموں کی بن آئی عجب یہ دور آیا ہے

اس طرح سے اس نے اس زوال پزیر معاشرت کا ایک خاکہ پیش کرنے کی جرات کی جو آئندہ نسلوں کے لئے مشعل ہدایت بنی اورہجو یہ شاعری کا ایک دورشروع ہوگیا جس نے اس وقت کے سماجی ،سیاسی پہلوؤں کوشاعری کے ذریعہ پیش کرنے کی ہمت دکھائی۔آگے چل کر میؔراورسوؔدا نے اس روایت کو قائم رکھتے ہوئے شکایت زمانہ کوشہرآشوب کی شکل میں پیش کیا۔شاکرناجی ،شاہ حاتم ،اوردوسرے کئی شعراء نے بھی شہرآشوب کہے جن میں اس دورکی بدحالی اور زوال کی واضح تصویریں نظرآتی ہیں۔اس دورکی شاعری میں نہ صرف عصری عکاسی موجود ہے بلکہ مستقبل کا ڈراور خدشے بھی ہیں ۔میرکہتے ہیں۔

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

جب غلام قادرروہیلہ نے شاہ عالم ثانی کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیریں تو میر نے کہا۔

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاک پاجن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

میؔر،درؔداورسوؔدا کا دورمعاشی بدحالی اورسیاسی الٹ پھیرکا دورتھا۔مختلف شعراء نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق ان اثرات کوقبول کیا یہ تجربہ میؔراوردرؔد کی داخلیت میں ظاہرہوا توسوؔدا کے یہاں اس کی شکل دلی کے شہرآشوب میں نظرآتی ہے ۔ان شعراء نے مطلق العنان حکمرانوں کی غلط

کاری اور بدانتظامی کونشانہ طنزاور ہدف بنانے سے گریزنہیں کیا۔ان کی ہجویں اورشہرآشوب میں احتجاج کی لے بیحد صاف ہے اور یہ اس عہد کے معاشرتی تضادات ،طبقاتی ناہمواری اوراقتصادی ناآسودگی کی ترجمانی کرتی ہے۔''ناکارہ گھوڑے'' کی تصویر کے چند بند دیکھئے۔

آگے سے تو بڑا اسے دکھلائے تھا سیس
پیچھے نقیب بانکے تھا لاٹھی سے مار مار

ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا رو براہ
ہلتا نہ تھا زمین سے ، مانند کوہسار

اس مضحکے کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار

پہیئے اسے لگاؤ کہ تا بودے یہ رواں
یا بادبان باندھیو یوں کہ دو اختیار

انقلاب ۱۸۵۷ سے پہلے آگرہ میں نظیر اکبرآبادی نے انسانی مساوات اورجمہوری اقدارکو اپنی شاعری کا خاص موضوع بنایا۔انہوں نے جاگیردارانہ معاشرے میں طبقاتی کشمکش کے خلاف سخت احتجاج کیا۔اپنے عہد کے سیاسی ،سماجی اورمعاشی نظام کی سچی تصویر پیش کی ہے ۔ان کے دور میں نااہلوں کوعروج حاصل ہوگیا تھا۔شرفاء اپنی جگہوں پر سمٹے اورسہمے ہوئے تھے۔اس انتشاراور خلفشار کے خلاف انہوں نے نظم ''دنیا'' میں اپنی آوازاس طرح بلند کی ہے۔

جنھوں کے کان نہیں دور کی سنتے ہیں
جو کان والے ہیں بیٹھے وہ سر کو دھنتے ہیں

برستے دھوئیں ہیں اور ابر تنکے چنتے ہیں
کباب بھونتے ہیں اور کبابی بھنتے ہیں

غرض میں کیا کہوں دنیا عجب تماشا ہے

۱۸۵۷ کی بغاوت تاریخ میں اپناایک منفردمقام رکھتی ہے جب انگریزوں کے روز افزوں بڑھتے

ہوئے اقتدار پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی گئی۔اس ناکام جنگ آزادی کارد عمل یہ ہوا کہ سارے ہندوستان پرانگریزوں کی حاکمیت آئین بن گئی۔اس وقت ہندوستانی معاشرہ فطری طور پر اس تاریخی واقعے اورسانحے سے متاثر ہوا۔شاعروں کی ذہانت ،حساسیت اوربصیرت بھی اس صورت حال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔بہادرشاہ ظفؔر جواس وقت تخت تاج کے مالک تھے اور شاعر بھی، یہ کہتے ہوئے مقید ہوکر رنگون چلے گئے۔

اے وائے انقلاب زمانہ کے جود سے
دلی ظفر کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی

دوسرا شعر دیکھئے۔

گئی یک بہ یک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں، میرا سینہ غم سے فگار ہے

وے شہر دلی یہ تھا چمن، سبھی طرح کا یہاں تھا امن
وہ خطاب اس کا جو مٹ گیا ، فقط اب تو اجڑا دیار ہے

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ مل سکی کوئے یار میں

غالبؔ نے بھی دلی کے اجڑنے کی کہانی اوراس کے دردکوسوز،کسک کے ساتھ شعری لہجے میں یوں نمایاں کیا۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

غالبؔ کواس سیاسی انقلاب کا سب سے زیادہ غم تھا وہ اس تباہی اور بربادی کے لئے خون کے آنسو روتے رہے اوراپنا احتجاج یوں بیان کرتے رہے۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اس انقلاب سے متاثر خواجہ الطاف حسین حاؔلی کی احتجاجی لئے جملہ ملاحظہ کیجئے۔

صحبتیں اگلی مصور مجھے یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

لے کے داغ آئے ہیں سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

داؔغ دہلوی بھی دلی کے سیاسی زوال کے شدید احساس سے متاثر تھے وہ اس وقت دہلی کا مرثیہ پیش کرتے ہیں جب پہلی جنگ آزادی کے وقت انگریزی فوجوں نے کشت وخون کا ماحول برپا کر دیا تھا۔

لہو کے چشمے ہیں پر آپ کی صورت
شکستہ کاسۂ سر ہے حباب کی صورت

لٹے ہیں گھر دل خانہ خراب کی صورت
کہاں یہ حشر میں توبہ عذاب کی صورت

اور پھر ظلم کے خلاف اس طرح احتجاج کرتے ہیں۔

برنگ بوئے گل اہل چمن ، چمن سے چلے
غریب چھوڑ کے اپنا وطن ، وطن سے چلے

نہ پوچھو زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے
قیامت آئی ہے مردے نکل کر کفن سے چلے

مقام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
وہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

دلی کی بربادی کے بعد شعروادب کا دبستان لکھنؤ منتقل ہوا اور تمام دلی کے شعراء وادباء کو ایک نئی فضا میسر آئی۔ اس سے متعلق ڈاکٹر تبسم کاشمیری اپنی معرکہ آرا تصنیف 'اردو ادب کی تاریخ' میں اس دور کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اٹھارہویں صدی کے ربع آخر میں دلی کا مظلوم اور بدنصیب شہنشاہ شاہ عالم ثانی لال قلعہ کے خزاں زدہ ماحول میں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ وہ دیوان عام اور دیوان خاص کے افسردہ در و دیوار کو بھی دیکھنے کے قابل نہ رہا تھا کہ اسے غلام قادر روہیلہ کے ظلم نے کور چشم کر دیا تھا۔ اس افسوس ناک اور المیہ صورت حال کے باعث دلی کے لوگ صدیوں پرانے آبائی گھروں کو چھوڑ کر حصول معاش کے لئے ہجرت کرنے پر مجبور ہو چکے تھے۔ اس دور میں ایسے خستہ حال لوگوں کے لئے اودھ کی سرزمین ایک عمدہ پناہ گاہ کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اول اول فیض آباد اور بعد ازاں لکھنؤ اودھ کے نئے ثقافتی مرکز بن چکے تھے۔ لہٰذا دلی کے مہاجر شعرا اور دیگر فنکار وہاں کا رخ کرنے لگے تھے۔ لکھنؤ کی خوش حالی ان لوگوں کو تیزی سے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔'' [۱]

یہ تھا اودھ کی نئی زندگی کا رنگ و آہنگ جس کے سبب دلی کے آشوب سے نکلنے والے لوگوں کے لئے فیض آباد ایک نخلستان کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ سراج الدین علی خان آرزوؔ، سوداؔ، سوزؔ، میرؔ، انشاؔء، رنگینؔ اور مصحفی جیسے شعرا بھی دلی سے ترک وطن کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ میر حسن لکھنؤ کے متعلق لکھتے ہیں۔

جب آیا میں دیار لکھنؤ میں
نہ دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں

زبس یہ ملک ہے بیہڑ پہ بستا
کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستہ

کسی کا آسماں پر گھر ہوا میں
کسی جھونپڑا تحت الثریٰ میں

ہر ایک کوچہ یہاں تک تنگ تر ہے
ہوا کا بھی بمشکل واں گزر ہے

۱۔ اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ تک، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ایم آر پبلی کیشنز دہلی، 2009

سر اٹھانے نہ دیا دوراں نے
اس طرح مجھ کو پائمال کیا

مصحفی سے دلی کا واقعہ سنئے جب اس وقت وہ دلی پہنچے جب گلشن دلی میں خزاں کا عمل زور وشور سے جاری تھا۔

اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک
ہے صاف تو یہ گلشن دلی میں خزاں ہے
کیا لکھنؤ کو چھوڑتے لگتا ہے مصحفی
جب ہم نے دلی شہر سا گلزار تج دیا

لکھنؤ میں لکھی جانے والی شاعری کو دیکھ کر مصحفی نے بے اختیار احتجاج کیا تھا۔

کیا چمکے گا اب فقط میری نالے کی شاعری
اس عہد میں ہے تیغ کی بھالے کی شاعری

اردو شاعری کی تاریخ میں اکبرالہ آبادی کا نام انتہائی عظمت کے ساتھ لیا جاتا ہے جنھوں نے طنزیہ شاعری کے سبب اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔ اکبر نے اس دور کے سیاسی ومعاشرتی مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ اکبر کا زمانہ وہ زمانہ تھا جس وقت ہندوستان کی قدیم تہذیب زوال آمادہ تھی اور اس کی جگہ نئ تہذیب کا استقبال ہورہا تھا۔ مغرب پرستی، مغربی افکار وخیالات کی انتہا پسندی اور اس کے ساتھ لوگوں کے رہن سہن، تعلیم وتہذیب اور زبان وبیان پر مغرب کا گہرا اثر نمایاں تھا۔ چونکہ اکبر مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے اس لئے وہ اس انتہا پسندی کو طنزومزاح کی ڈھال سے روکنا چاہتے تھے۔ طنزومزاح بھی ایک طرح سے سوسائٹی سے اختلاف ہے۔ جب سماج میں سیدھے اپنی بات کہنے کی ممانعت ہو تب شاعر طنز کو وسیلہ اظہار بنا کر اپنی مزاحمتی اور احتجاجی فکر کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ لہٰذا ان کی شاعری میں نئ تعلیم وتہذیب، مذہبی ریاکاری اور مغرب پرستی کے خلاف احتجاج نظر آتا ہے۔ چند مثالیں پیش نظر ہیں:

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب

عقل سپرد ماسٹر ، مال سپرد آنجناب
جان سپرد ڈاکٹر ، روح سپرد ڈارون

مذہب کے متعلق کہتے ہیں۔

طفل دل محو طلسم رنگ کالج ہو گیا
ذہن کو تب آ گیا مذہب کو فالج ہو گیا

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو ان پر ہے جو اس مٹنے پر مرتے ہیں

اگرہم جدیداردو شاعری کی بات کریں تواس میں انجمن پنجاب، جدیدمشاعرے اورقومی اوروطنی شاعری کی داغ بیل بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔انگریزوں کا ملک پر قبضہ اور یہاں کے سماجی سیاسی اوراقتصادی حالات سے چھیڑ چھاڑ کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کی قومی یکجہتی کومنتشر کرنا ان کا ایک مقصد بن گیا تھالیکن ہندوستانیوں میں قومی اوروطنی محبت کو بیدارکرنے میں ہمارےشعراء کا اہم رول رہا ہے۔وہ وطن کی محبت کے احساس سے بے حد متاثر تھے۔انہوں نے وطن کی محبت میں انگریزوں کے خلاف سخت احتجاج کیا۔جدیدشاعری کے ساتھ قومیت کاتصوربھی ابھرکرسامنے آیا جس میں حاؔلی، آزاؔد،چکبست ،سروؔر جہان آبادی،اقباؔل ،سیماؔب اکبرآبادی وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔حاؔلی کی نظر میں اتحادواتفاق کی کمی نے ملک کوانتہائی خراب حالت میں پہنچادیا۔

ہند میں اتفاق ہوتا اگر
کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

انگریزوں نے جب 'Divide and Rule' پھوٹ ڈالواورحکومت کرو کی پالیسی اپنائی تو اس سے حالی کافی متاثر ہوئے۔ وہ برطانوی حکومت کی اس چال سے بخوبی واقف تھے ان کی اس چال پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
واں پاؤں جمانے کے لئے تفرقہ ڈالو

حالی نے اپنی نظموں کے ذریعے اہل ملک وقوم کو اتحاد و اتفاق کا درس دیا اور ساتھ ہی انہیں آزادی کی اہمیت کا احساس بھی کرایا۔

ایک ہندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنہیں
قدر داں ان سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم

ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں
قدرآزادی کی جتنی ہم کو ہو اتنی ہے کم

حالؔی کے علاوہ آزادؔ کے نظموں میں بھی حب الوطنی کے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اہل وطن میں حب الوطنی کے فقدان کا احساس آزاد کو بہت پہلے ہی ہوگیا تھا۔ بڑے ہی دردانگیز انداز میں کہتے ہیں۔

حب وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں
حیراں ہوں آج کل ہے بڑا اس کا کال کیوں

حالؔی اور آزاؔد کے بعد اردوشاعری میں جنہوں نے قومی اور وطنی جذبات سے بھرپور کلام پیش کیا وہ سرور جہان آبادی ہیں ان کی شاعری میں حب الوطنی کے اثرات نمایاں ہیں جس کے ذریعہ انہوں نے اہل ملک کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش وسعی کی۔

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو
پستی میں کیوں پڑے ہو اونچے نشان والو

کب تک یہ آہ ذلت و عزّ و شان والو
کب تک یہ خواب غفلت سونے کی کان والو

ملک کی آزادی اورقومیت کے جذبے سے سرشارچکبستؔ کی شاعری بھی وطنیت کے جذبات کوجلابخشتی ہے۔انھوں نے ایسی متعددنظمیں کہی ہیں جن کے ذریعہ اہل ملک وقوم کو مادری وطن کی عظمت واہمیت سے روشناش کرایا۔نظم ''صبح وطن'' میں ملک کی آزادی کی تمنا جوان کے دل میں تھی اس طرح ظاہرہوتی ہے۔

دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

چکبستؔ ہوم رول تحریک کے حامی تھے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے انھوں نے اپنی شاعری کووسیلۂ اظہار بنایااور برطانوی قوم کے خلاف مزاحمت واحتجاج کیا۔

پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے
خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے

جو سنتری در زنداں کے سو بھی جائیں گے
یہ راگ گا کے انہیں نیند سے جگائیں گے

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

چکبستؔ کی شاعری سے متعلق گوپی چند نارنگ اظہارخیال کرتے ہیں۔

''چکبست کی شاعری ہماری تحریک آزادی کی اعتدال پسنداورمصلحانہ روش کی بہترین مظہر ہے۔اردوشاعری کوتحریک آزادی کے اصلی رنگ اورصحیح مزاج سے آشنا کرانے کی اولیت شبلی کے بعدچکبست کو حاصل ہے۔وہ نہ انتہاپسندوں کے ساتھ تھے نہ اعتدال پسندوں کے۔ وہ تلک کا اتنا ہی احترام کرتے تھے گوکھلے اورگاندھی کا۔لیکن

> ان نکتہ سنج طبیعت نے تحریک آزادی کی ہندوستانی اعتدال پسندی،
> نرم گفتاری اورمیانہ روی کا پالیا تھا۔انہوں نے اپنی شاعری میں انہیں
> قدروں کو عام کیاہے۔'' ۱

اردو شاعری کو قابل رشک بلندی پر پہنچانے والے شاعر سر محمد اقبال نے اپنی قومی اور وطنی نظموں کے ذریعہ اہل وطن کے دلوں میں آزادی کی ایک چنگاری بھڑکادی تھی۔ان کی شاعری میں سرسید ،حالی اورشبلی کی روایات کا امتزاج ملتا ہے جس میں وطن دوستی کا جذبہ خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔ ملک کی سیاسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے ان کی نگاہ دورس نے اہل وطن کو آنے والی مصیبت سے آگاہ کردیا تھا۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والوں
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

ظفرعلی خان بھی اہل ہندوستان سے محبت کرنے والے تھے انہیں بھی اپنے وطن ہندوستان سے بے حد محبت تھی اوران کی اس محبت کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے۔

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگرہے عشق تو ہندوستاں سے ہے

تہذیب ہند کا نہیں چشمہ اگرازل
یہ موج رنگ رنگ پھرآئی کہاں سے ہے

۱۹۳۶ سے آزادئ ہند کا زمانہ اردو میں ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ ہے ان برسوں میں ترقی پسند تحریک نے اردو شعروادب کی حدود کو بے حد وسیع کیا اوراسے اپنے زلزلوں سے خاصہ

زیر وزبر بھی کر دیا۔ادب میں انسان دوستی، حب الوطنی، سامراج دشمنی اورآزادی کا جذبہ پہلے بھی موجود تھا لیکن ۱۹۳۵ سے ۱۹۳۶ میں جب دنیا پہلی جنگ عظیم کے خطرناک اثرات سے دوچار ہو چکی تھی اور دوسری جنگ عظیم کے بادل سر پر منڈلا رہے تھے۔ ایک طرف فاشزم بھی حاوی تھا ایسے میں جمہوری رجحانات کی ضرورت تھی۔ترقی پسند تحریک نے یہ ضرورت نہایت خوبی سے انجام دی ،اس کے ذریعہ ادباء وشعراء کوایک واضح اور منظّم نصب العین کی دعوت دی گئی۔اس وقت تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی اور ہندوستان برطانوی سامراج سے آخری ٹکر لینے کو تیار ہورہا تھا ''نیا وفاق'' جس کے تحت برطانوی صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں کوملا کر مرکز میں ایک وفاقی حکومت قائم کرنا تھا، یکم اپریل ۱۹۳۷ کو نافذ ہوا۔ جوش ملیح آبادی نے اس کی مخالفت کچھ اس طرح کی۔

اس نوحۂ خزاں کو سمجھنا نوید گل
اک بے پناہ چوک ہے اک سخت بھول ہے

یہ بوستاں یہ اہل سیاست کی شاخ گل
شیطاں کے پاس باغ کی سوکھی ببول ہے

ناداں اکڑ رہے ہیں کہ حاصل ہوا وفاق
دانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فول ہے

جوش کا مزاج رومانیت کا پروردہ تھا مگر ترقی پسند تحریک کے اثرات قبول کر کے ان کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔اس تحریک نے ہماری شعری دنیا میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ چنانچہ ہمارے شعراء کے یہاں اس کا اظہار کچھ یوں کیا گیا۔فیض کی نظم ''ترانہ'' کے کچھ بند ملاحظہ فرمائیں۔

اے خاک نشینوں اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

جہاں ایک طرف فیض نے اختلاف کیا وہیں مجاز بھی پیچھے نہ رہے اوراپنے دور کی سچی،

کھری اور سب سے پر خلوص آواز کو اس طرح بلند کیا۔ ’’بدیسی مہمان سے‘‘ مخاطب ہو کر کہا۔

مناسب ہے کہ اپنا راستہ لے
وہ کشتی دیکھ ساحل سے لگی ہے

بگولے اٹھ رہے ہیں بڑھ رہے ہیں
فضائے دہر میں ہلچل مچی ہے

ترقی پسند شعراء میں مخدومؔ، سردارؔ جعفری، فراقؔ، ساحرؔ، کیفیؔ اعظمی وغیرہ بھی تحریک آزادی میں بڑے زوروشور سے حصہ لیتے ہیں اور برطانوی حکومت کے خلاف کھل کر احتجاج کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں احتجاج ہی نہیں بلکہ ایک انقلاب کی سی صورت نظر آتی ہے جس نے غلامی کی صبح وشام دیکھی تھی اور جو آئندہ آزادی کے رات دن دیکھنے کے مشتاق تھے۔

مخدومؔ اس آزادی کے خواہاں تھے۔

یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

ہم ہند کے رہنے والوں کی
محکوموں کی مجبوروں کی

آزادی کے متوالوں کی
دہقانوں کی مزدوروں کی

یہ جنگ ہے جنگ آزادی، آزادی کے پرچم تلے

ادھر سردارؔ جعفری عوام کو پیغام عمل اور بیداری کا درس دیتے ہیں۔

اٹھو ہند کے باغبانوں اٹھو
اٹھو انقلابی نوجوانوں اٹھو

اٹھو کھل گیا پرچم انقلاب
نکلتا ہے جس طرح آفتاب

غلامی کی زنجیروں کو توڑ دو
زمانے کی رفتار کو موڑ دو

اپنے زمانے کی تحریکات سے متاثر ہوکر کیفیؔ اعظمی نے بھی عوام کو طوق غلامی اتار پھینکنے کی ترغیب دی۔

پھونک دو صور کہ اب منتظر صور ہیں سب
ایک جھٹکے میں فقط طوق اتر جائے گا

مٹا دو مل کے مٹا دو نشاں غلامی کا
زمین چھوڑ چکا کارواں غلامی کا

بغاوت کا پرچم اٹھاتے چلو
نظامی غلامی مٹاتے چلو

فراقؔ گورکھپوری نے بھی اہل ہندوستان کو آزادی کی اہمیت کا احساس کرایا۔

یہ مہر و ماہ یہ تارے یہ بام ہفت افلاک
بہت بلند ہے ان سے مقام آزادی

جاں نثار اخترؔ نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ غیر ملکی اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے سرگرم مجاہدین آزادی کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

یہ دھوپ چمکتی تیغوں کی اک آن میں ڈھل سکتی ہے ابھی
زنجیر غلامی کی کیا ہے اک آنچ میں گل سکتی ہے ابھی

ترقی پسند شاعری کے متعلق گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''اس سیاسی بحران میں جو ہندوستان کے دل ودماغ پر چھایا ہوا تھا۔
ادیبوں کا اس طرح سوچنا بے حد قابل قدر تھا۔افسانوں، ڈراموں اور
ناولوں میں تو نہیں لیکن شعری ادبیات میں ایسے مقامات بہت سے

ملیں گے جہاں شاعر نے قومی رہنماؤں کو برطانوی سیاست کی چال بازیوں سے آگاہ کیا ہے۔ان کے جال میں پھنسنے سے روکا ہے۔یہی نہیں بلکہ اپنے رہنماؤں کی غلط کاریوں پر تنقید بھی کی ہے۔مختلف سیاسی مکاتب فکر سے تعلق رکھنے کے باوجود ملک کی سیاسی اور معاشی آزادی کی خواہش میں جوشؔ،مزاجؔ، مخدومؔ، جاں نثار اخترؔ، فیضؔ،فراقؔ۔سردار جعفریؔ،کیفیؔ،قاسمیؔ،شمیم کرہانی آنندنرائن ملا وغیرہ ہم آواز رہے۔'' ؎۱

اس طرح زندگی آزادی کی ہر اہم تحریک پر بڑے ہی موثر انداز میں روشنی ڈال کر عوام کو اس کی اہمیت وافادیت سے روشناش کرانے کی کوشش کرنے والے اردو شعراء کی فہرست بہت طویل ہے۔اردو میں انقلابی شاعری کا جادو جگانے والے تمام وطن پرست شعراء نے مادر وطن کی عظمت اور آزادی کی اہمیت پر روشنی ڈال کر حریت کی چنگاری کو شعلہ جوالہ بنانے میں جو اہم رول ادا کیا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔اس کے نتیجے میں اردو ادب اور مزاحمت واحتجاج کے رشتے کو مزید تقویت ملی اور اردو شاعری میں ایک ایسے دور کا آغاز ہوا جس میں ہمیں اس عہد کی سماجی سیاسی بیداری اور احتجاجی وانقلابی رجحانات کی بھرپور ترجمانی نظر آتی ہے۔

---

۱ (ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

قدیم اردو شاعری میں مزاحمت واحتجاج کی نوعیت
(ہجویات اور شہرآشوب)

یوں تو مزاحمت واحتجاج ادب کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔لیکن ادب نے بھی انہیں ہمیشہ سے ہی پروان چڑھایاہے۔ہر دور میں شاعرواد یب نے اپنے گردوپیش کے حالات اور شکایت زمانہ کے لئے مزاحمتی شاعری کو ہی منتخب کیا ہے۔اپنے احساس وجذبات کا شاعری کے حوالے سے کیا۔اردو شاعری میں مزاحمت واحتجاج کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ قدیم دور کی شاعری میں ہی ان کے ابتدائی خدوخال نظر آتے ہیں۔زمانے کی تبدیلی کے ساتھ سماج میں جس طرح کا ماحول بنتا جاتا ہے اس طرح سے وہاں کے عوام کو اعتدال برتنا پڑتا ہے۔مثلا۔مہنگائی، روزگار، چوری،نشہ خوری، بے ایمانی،قتل،خون ریزی وغیرہ سماج کی ایسی صداقتیں ہیں جو کسی بھی معاشرے کی بدحالی کا سبب ہیں۔یہ ہمیشہ سے ہی معاشرے میں کسی نہ کسی موجود رہیں ہیں حالانکہ یہ اس دور کے حکمراں پر منحصر ہے کہ وہ اپنے دور کو کس طرح سے ان بدحالی سے محفوظ رکھ سکتے ہیں لیکن حالات کے ساتھ ساتھ یہ سماج کا ایک حصہ بنتی گئی۔وقت وقت پر دانشوروں، مذہبی رہنماؤں نے اصلاحی تحریکیں چلائیں جس کے ذریعہ ان کو کچھ حد تک ختم کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔

اردو شاعری جس نے ہر دور میں ہمیشہ سماج کے بدلتے ہوئے طور کو پیش کیا ہے ان میں مزاحمت واحتجاج کی مختلف نوعیتیں ہیں مثلاً ہجویہ شاعری،شہرآشوب اور واسوخت وغیرہ۔ان کے ذریعہ کسی بھی عہد کی سماجی ،سیاسی،معاشی اور معاشرتی بدحالی کا تذکرہ اوراس کے خلاف ناآسودگی اورناپسندیدگی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر نعیم احمد نے لغات کے حوالے سے شہرآشوب کی تعریف یوں کی ہے:

> ''شہرآشوب اس نظم کو قرار دیا جاسکتا ہے جس میں کسی فرد کے حسن کی
> ہنگامہ آفرینی یا کسی شہر یا اس کے بشندوں کی خوبی یا خامی کا ذکر کیا
> گیا ہو۔'' [۱]

اس طرح شہرآشوب کے ذریعہ کسی شے،فرد یا شہر کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار کیا جاتا ہے

---

۱ (شہرآشوب کا تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر نعیم احمد، ادبی اکادمی علی گڑھ، 1979ء ص:19)

مثلاً کسی اجڑے ہوئے شہر کا ماتم، پریشانی، گردش آسمانی اورزمانے کی ناقدردانی وغیرہ شکایات کا حال بیان کرنا ہے۔شہر آشوب کی ابتداء کب سے ہوئی اس میں اختلاف ہے۔ڈاکٹر نعیم احمد کا خیال ہے کہ:

''اردو میں شہر آشوب نگاری کا اورنگ زیب کی وفات کے بعد باقاعدہ آغاز ہوا۔مغل فوج کے ہاتھوں دکن والوں کو جو روز بد دیکھنا پڑا تھا تقریباً چوتھائی صدی کے عرصہ میں ہی مغلیہ سلطنت پر بھی زوال اور ادبار کے وہی مہیب سائے منڈلانے لگے ۔ہر طرف سیاسی ابتری، معاشی بحران اور سماجی افراتفری پھیل گئی جس سے اردو شاعری شمال میں اپنے دور آغاز میں ہی بڑی شدت سے متاثر ہوئی۔شہر آشوبیہ نظمیں ایسی بحرانی کیفیت، اخلاقی زوال اوراقتصادی تباہ حالی کے بیان واظہار کے لئے وقف ہوکررہ گئیں اورآئندہ کے لئے اس نے ایک روایت کی حیثیت اختیار کر لی۔'' ۱

شہر آشوب کے ذریعہ کسی بھی شہر کے سیاسی ،سماجی ،اقتصادی اور معاشی ومعاشرتی انتشار اورعوام و خواص کی بدحالی بیان کی جاتی ہے اس میں ہئیت کی بھی کوئی خاص پابندی نہیں ہوتی۔یہ شہر آشوب دلی، اودھ، بہار، روہیل کھنڈ ،اکبرآباد اور حیدرآباد سے متعلق ہیں ۔اس قسم کی نظم سب سے پہلے جعفر زٹلی کے یہاں ملتی ہے، پھراس کے بعد شاکر ناجی ،ظہورالدین حاتم، مرزا محمد رفیع سوداؔ ،میر تقی میر، قائم اور مرزا جعفر علی حسرت وغیرہ نے اس وراثت کو مزید تقویت بخشی۔ان میں ۱۸۵۷ کے قبل کے حالات کا بھی ذکر ہے اوراس کے بعد کے حالات کا بھی۔زمانے کے ساتھ ساتھ اس کی ہئیت میں بھی تنوّع پیدا ہوتا گیا اوراس نے قطعوں اور رباعیوں کے علاوہ بھی مختصر مثنویوں یا منفرد شعروں کے مجموعے کی شکل اختیار کر لی،تو کبھی مسدس ،کبھی مخمس اور کبھی قصیدے کی۔موضوع کے اعتبار سے بھی اس کی نوعیت منفرد رہی ہے ۔سید مسعود حسن رضوی ادیب ''شہر آشوب'' کے عنوان سے فرماتے ہیں:

''امتداد زمانہ کے ساتھ شہر آشوب کی ہئیت میں تنوع پیدا ہوتا گیا

---

۱ (شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ ، ڈاکٹر نعیم احمد ، ادبی اکادمی ، علی گڑھ ، 1970ء ص: 33)

اوراس نے قطعوں اور رباعیوں کے علاوہ کبھی مختصر مثنویوں یا منفرد شعروں کے مجموعے کی شکل اختیار کرلی۔کبھی قصیدے کی، کبھی مخمس کی اور کبھی مسدس کی۔اس کے موضوع میں کبھی تبدیلی ہوتی رہی۔اس میں کسی شہر کے مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا بیان، کبھی ہمدردی کے رنگ میں، کبھی تضحیک اور ہجو کے انداز میں ہونے لگا۔اورآخرکار شہرآشوب سے ایسی نظم مراد لی جانے لگی جس میں کسی شہر کی تباہی اوراہل شہر کی بدحالی کا بیان ہو۔اس طرح شہرآشوب کی حسب ذیل تین قسمیں ہوگئیں:

(۱) ایسے قطعوں، رباعیوں، مختصر مثنویوں یا منفرد شعروں کا مجموعہ جن میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کے لڑکوں کے حسن اور ان کی دلکش اداؤں کا ذکر ہو۔

(۲) ایسی نظم جس میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا ذکر ہمدردی کے رنگ میں تضحیک وہجو کے انداز میں کیا گیا ہو۔خواہ قصیدے کی شکل میں، خواہ مثنوی، مخمس یا مسدس کی شکل میں۔

(۳) ایسی نظم جس میں کسی شہر کی تباہی اوراہل شہر کی بدحالی کا بیان کیا گیا ہو، خواہ کسی شکل میں ہو۔'' [۱]

جہاں تک شہرآشوب یا سوسائٹی سے اختلاف کی بات کی جائے تو 1857ء سے قبل کا ایک شاعر میر جعفر جس نے بعد میں زٹلی تخلص اختیار کیا، بہت مشہور ہوا۔اس کے کلام کے مطالعے سے اس کے دور کی صورت حال اوراس کے اثرات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ان کے کلام میں جابجا فحش نگاری کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے لیکن وہ اس عہد کی اخلاقی گراوٹ کا نتیجہ نظر آتی ہے۔وہ بہت بڑے ہزل گوشاعر تھے اوراپنی بے باکی اور جدت طرازی کی وجہ سے اپنی زندگی سے ہاتھ دھوبیٹھے۔فرخ سیر نے تخت نشین ہوتے ہی عجیب و غریب پالیسیاں اختیار کی۔زٹلی نے اس کی مذمت کچھ یوں کی۔

---

۱ (نقوش 102، لاہور مئی 1965، ص نمبر 6)

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
پادشا ہے تسمہ کش فرخ سیر

جعفرزٹلی کا دورآخری مغل بادشاہوں کا دورتھاجس کی تہذیب کی اکائی بظاہر ثابت وسالم نظرآرہی تھی لیکن اندرہی اندرمنتشرہورہی تھی۔عدل وانصاف معاشرے سے رخصت ہورہاتھا۔ انسانیت،محبت وخلوص سے رشتے بوسیدہ ہورہے تھے،مکاری وعیاری معاشرے میں اہمیت حاصل کررہی تھی ،جس کے باعث اقتصادی بدحالی کی صورت پیداہورہی تھی۔جعفرنے اپنے دورکے سماجی،سیاسی اوراقتصادی حالات سے متاثرہوکراسے تضحیک کی شکل میں پیش کیا۔ان کے یہاں ایسے بہت سے موضوع ہیں جن کوانھوں نے شہرآشوب کا نام دیا۔''دربیان نوکری''کےعنوان سے فوجیوں کی بدحالی کی جانب اشارہ کیاہےجس میں برسرروزگارفوجیوں کوتنخواہ نہ ملنے پران کی معاشی پریشانیوں کاذکرکیاکیاگیاہے وہ کس طرح فاقہ کشی پرزندگی بسرکررہے ہیں اورآدمی کےساتھ جانور بھی بھوک سے پریشان ہیں۔

مردم پریشاں یک دگر ، گشتہ سپاہی در بدر
خور دہ بسے خون جگر ، یہ ، نوکری کا حظّ ہے

ہرصبح ڈھونڈتے چاکری کوئی نہ پوچھے بات ری
سب قوم ڈھونڈن لاگ ری ، یہ ،نوکری کا حظّ ہے

گھوڑا رہا بھوکا سدا اور فاقہ شد میاں گدا
بی بی کہے میرا خدا ، یہ نوکری کا حظ ہے

ترسے ہمیشہ گیہوں کو سمجھا رکھیں اب جیو کو
جیسا پپیہا پیو کو ، یہ ، نوکری کا حظ ہے

مہاجنوں کی معاشی حالت کاذکرکرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ ان بے روزگاروں کوقرض دیتے دیتے دیوالیہ ہوگئے۔

دیکھو مہاجن کا مہاجن سود کا لالچ کیا
مے قرض پھرنا ہی دیا، یہ، نوکری کا حظ ہے

اوران کی اس حالت کے لئے زٹلی نے امرائے سلطنت کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

امراؤ سب ہیں بے خبر، احدی بے چارے بے وقر
اسوار پاجی سے بتر، یہ، نوکری کا حظ ہے

اس میں فوجیوں کی بدحالی کے برعکس ادنیٰ طبقے کے پیشہ وروں کی معاشی حالت زیادہ بہتر بتائی گئی ہے۔

دھنیاں جلاہا چاق ہے کنجڑا قصائی طاق ہے
دیوّث قرّم ساق ہے، یہ، نوکری کا حظ ہے

اس سلسلے میں ڈاکٹر نعیم احمد کہتے ہیں:

''زٹلی کے یہ شعر آشوب حاتم، سوؔدا اور میؔر کے لئے نمونہ ثابت ہوئے ہوں گے۔اس کی وفات کے بعد ہندوستان کے حالات پہلے سے زیادہ خراب ہوگئے۔اس لئے معاشرتی اوراقتصادی خرابیوں کا ذکر اردو شاعری کا ایک مشکل مضمون بن گیا۔'' [1]

اس کے بعد شہر آشوب نگاری کی فہرست میں محمد شاکر ناجی، سوؔدا، حاتؔم، قاسؔم، نواب آصف الدولہ، میر محمد تقیؔ، میاں قلندر بخش جرات، مصحفیؔ، نظیر اکبر آبادی، رنگینؔ، بہادر شاہ ظفر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ناجی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بہت شوخ اور ظریف طبع تھے۔ان کا پیشہ سپہ گری تھا وہ نادر شاہ سے کرنال کے میدان میں جنگ کے وقت محمد شاہ کا شریک حال تھا۔اس کی فوجی معلومات، شوخ مزاجی اور کرنال کی لڑائی کے مشاہدات نے اسے ایک شہر آشوب لکھنے پر مجبور کر دیا۔نظم کا ایک بند پیش ہے۔

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا

---

[1] (شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر نعیم احمد، ادبی اکادمی علی گڑھ 1979ص: 116/115)

کہ میں نشاں کے ہاتھی اوپر نشانہ تھا

نہ پانی پینے کو پانا وہاں نہ کھانا تھا
ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا

نہ ظرف و مطبخ و دکاں نہ غلہ و بقال

اس نظم کے ایک بند سے ہی دلی والوں کا حال دریافت ہوتا ہے کہ یہ لوگ کافی عرصے سے عیش وعشرت کے ماحول میں زندگی گزار رہے تھیان کو جنگ کی تیاریوں کی مشق نہیں تھی اور وہ نادر شاہ سے مقابلہ کے وقت رسد وغیرہ کا انتظام کرنے سے قاصر تھے اور محمد شاہ نے جو بھی رقم جنگ کے بندوبست کے لئے دی تھی اس کو بے جا صرف کر دیا تھا۔اسی طرح درگاہ قلی خاں کا بھی شہر آشوب قصیدے کی ہئیت میں ہے جس میں لشکر میں قحط پڑنے ، جنگ سے اکتاہٹ اور نااہلوں کے عروج کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

رئیس وقت ہے قائم نفیر در ہمہ وقت
بسان طوطی بے نطق طائر بے پر

اشرف علی خاں فغاں نے بھی اپنے دور کے اقتصادی پریشانیوں کا تذکرہ شہر آشوب کی شکل میں کیا ہے۔وہ مسلسل فاقہ کشی سے عاجز آ کر کہتا ہے۔

کیوں کر کٹیں گے یارب یہ بے شمار فاقہ
مجھ کو تو دوسرا ہے نفروں کو چار فاقہ

کوئی اگر سپاہی سردار سے کہے ہے
لے اپنا خبر شتابی مرتے ہیں یار فاقہ

کل سے نفر نے میرا گھوڑا نہیں ملا ہے
مقدور نہیں بشر کا کاٹے ہزار فاقہ

سن کر اسے یہ کہنا یکساں ہے حال سب کا

تیرا نفر ہے بھوکا میرے کہار فاقہ

مرزامحمد رفیع سوداؔاس دور کے شہرآشوب نگاروں میں بے حدممتاز ہیں۔انہوں نے بھی اس دورمیں بام عروج کوپہنچی بے روزگاری،زرعی اورفوجی نظام کی ابتری،سیاسی انتشار،لاقانونیت،امراء کی نااہلی،فوج میں نکمے لوگوں کی بھرتی،فاقہ کشی دلی کی عمارتوں اور باغوں کی ویرانی کا تذکرہ بڑے ہی طنزیہ انداز میں کیاہے۔اس وقت پھیلی ہوئی بے روزگاری کے متعلق فرماتے ہیں۔

کہامیں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانواڈول
پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لیکے گھوڑا مول

لگا وہ کہنے یہ اس کے جواب میں دو بول
جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول

بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈیھریوں یا تول

معاشی پریشانیوں کے باعث شریف گھرانوں کی عورتیں بھیک مانگنے پرمجبورہوگئیں تھیں۔

نجیب زادیوں کا ان دنوں یہ ہے معمول
وہ برقع سرپہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول

ہے ان کی گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول
اوران کے حسن طلب کاہرایک سے یہ اصول

کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جولیجئے مول

سوداؔ کےقصیدہ شہرآشوب کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے۔

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ میرے منھ میں زباں ہے

میں حضرت سودا کو سنا بولتے یارو
اللہ رے ! اللہ ہے کیا نظم بیاں ہے

ان میں ان پیشوں کا ذکرکیا گیا ہے جوشرفاء اختیارکرتے تھے لیکن ان کومعاشی منافع ہونے

کے بجائے نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔سودا نے سپاہ گری،سوداگری،مصاحبیت،زراعت،طباعت، کتابت اور شاعری کے پیشے کو زیر قلم رکھا۔انھوں نے دہلی لی بربادی کے متعلق یہ اشعار کہے ہیں۔

باغ دلی میں جو ایک روز ہوا میرا گزار
نہ وہ گل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار

نخل پت جھڑ ہوئے اور سوکھی پڑی ہیں روشیں
خاک اڑتی ہے ہرایک طرف پڑے ہیں خس خار

مسکراتا تھا جہاں غنچہ و گل ہنساتا تھا
اشک شبنم کے بھی قطرہ کا نہیں وہاں آثار

جس جگہ جلوہ نما رہتے تھے سر و شمشاد
مشت پر قمری کے اوس جا نظر آئے یک بار

شیخ ظہورالدین حاتم نے بھی اپنے شہرآشوب جو مخمس کی ہیئت میں ہے ، میں نادرشاہ کے حملے کے بعد کے اثرات کا تذکرہ کیا ہے۔انہوں نے نچلے طبقے کی دولتمندی ،عشرت پسندی اورآرام وآرائش کا جائزہ تفصیلی طور پر کیا ہے لیکن اس وقت سپاہیوں کا جوحال تھا اور جنگ کی وجہ سے جو مالی پریشانیاں تھیں ان کے ساتھ ساتھ خلوص ومحبت میں جو کمی آئی تھی اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

شہوں کے بیچ عدالت کی کچھ نشانی نہیں
امیروں بیچ سپاہی کی قدر دانی نہیں

بزرگوں بیچ کہیں کوئی مہربانی نہیں
تواضع کھانے کی چاہو کہیں تو پانی نہیں

گویا جہاں سے جاتا رہا سخاوت و پیار

حاتم رزق کے متعلق اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے۔

کرے ہے چرخ اگر تجھ پر جفا حاتم

تو سفلے پاس نہ کر جاکے التجا حاتم

ترے ہے رزق کا ضامن سدا خدا حاتم
تو انقلاب زمانے سے غم نہ کھا حاتم

کہ تجھ کو رزق بہت اور روزگار ہزار

اس طرح قیام الدین حاتم نے مغلیہ سلطنت کی خرابی اور کئی بادشاہوں کی نااہلی کا ذکر کیا ہے۔شاہ عالم ثانی جس وقت الہ آباد میں تھا تو وہاں کے عوام تخت خالی ہونے کی وجہ سے دلی کی ثقافتی زندگی میں ایک زبردست کمی محسوس کرتے تھے اور یہ بھی امید کرتے تھے کہ بادشاہ کے دلی آنے کے بعد انتظام سلطنت ٹھیک ہو جائے گا اور عیش وعشرت کے دن واپس لوٹ آئیں گے۔اس کیفیت کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

رہتی تھی ایک خلق کے جی میں یہ آرزو
ہو وے گا بادشاہ بھی پھر ہند میں کبھو

تاز مزمہ وئی ہو سر نووئی غلو
سو آسماں نے لاکے مسلط کیا تو تو

جس کے ستم سے چار طرف آہ آہ ہے

دلی کی تباہی کو موضوع بنا کر اکثر وبیشتر شعراء نے اپنے جذبات واحساسات اور غم وغصے کا اظہار ''شہرآشوب'' کی شکل میں کیا ہے۔وہ اس ماحول اور اس دور کے بادشاہوں سے تو ناآسودہ تھے ہی ساتھ ساتھ ان کی نااہلی اور نظام سلطنت کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ جعفرعلی حسرت نے بھی ''مخمس دراحوال شاہجہاں آباد'' کے عنوان سے شہرآشوب تخلیق کیا۔یہ نظم احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں دلی کی تباہی پر لکھی گئی۔جو دلی کی عمارتوں اور باغوں کی خوبی اور دلفریبی اور ابدالی کے حملے سے ان کی بربادی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

سواب نہ نہر نظر آوے ہے نہ اس میں آب

کنارے جمنا کے ہے سنگ قلعہ اور سیر آب

پڑے ہیں آن کے مرواں جہاں تھا عطر و گلاب
کھنڈر میں سنگ کے ٹوٹے ستون اور محراب

جو تر شے سرو کی صورت تھے اور شکل ہلال

چند شہر آشوب نگاروں نے بادشاہ کے افواج کی بدترین حالت اور رسد کی کمی وغیرہ کو بھی اپنے شہر آشوب میں خاص اہمیت دی ہے۔ میرؔ محمد تقی کے بھی ایک شہر آشوب کا عنوان ''مخمس در حال لشکر'' ہے۔ پہلے بند میں میرؔ کے لشکر میں جانے اور وہاں سب کو محتاج اور بھوک کا شکار ہوتا دیکھنے کے بارے میں معلومات نظم ہیں۔

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش
آئے لشکر میں جو ہم برائے تلاش

آنکے دیکھی یاں کی طرفہ معاش
ہے لب نان پہ سو جگہ پر فاش

نے دم آب ہے نہ چمچہ آش

اس دور میں لشکر کی تنظیم اور ساماں رسد کی فراہمی کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی۔اس لئے لشکر میں قحط پڑ جاتا اور پیشہ ور سے لے کر بادشاہ تک ہر ایک کا سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاتا۔ اس نظم سے ان تاریخی واقعات کی تصدیق ہوتی ہے کہ بادشاہ اور امیروں کے پاس فوج رکھنے کے وسائل بہت محدود تھے۔ جرات میاں قلندر بخش نے بھی شہر آشوب اور ہجویات کہے ہیں۔اس ضمن میں مولانا محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ:

''ظہور اللہ خاں نوا سے کسی معاملہ میں بگاڑ ہو گیا تھا۔ انہوں نے ان کی ہجو میں ایک ترجیح بند کیا۔اور حقیقت میں بہت خوب کہا جس کا شعر ترجیح یہ ہے:

ظہور حشر نہ ہو کیوں جو کلچڑی گنجی
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی ''[1]

جہاں تک اردو شاعری کے متعلق مختلف ناقدین کے مختلف خیالات ہیں کہ شاعری ہر زمانے میں اپنا ایک منفرد رکھتی ہے اور شعراء اس زمانے اور اس عہد سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اسی طرح ان کی شاعری میں بھی اس دور کی سماجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی صورتوں کا اظہار بھی پایا جاتا ہے اب وہ تو اس دور کے بادشاہ اور ان کے عوام پر منحصر ہوتا ہے کہ ان کا زمانہ بہتر تھا یا بدتر۔ مصحفی نے بھی اپنے شہر آشوب میں مہاوجی پٹیل (سندھیا) کے زمانۂ وزارت کے واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ جس میں شاہ عالم ثانی کی بے دست و پائی، سندھیا کی نظم و نسق کی خرابی اور دلی میں چوری، لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا ذکر ہے۔ بادشاہ کی بے بسی کے متعلق مصحفی کہتا ہے۔

کہتی ہے اسے خلق جہاں سب شہ عالم
شاہی جو کچھ اس کی ہے سو عالم پہ عیاں

مصحفی نے آخری اشعار میں سلاطین کی فاقہ کشی کا ذکر نہایت رقت آمیز انداز میں کیا ہے۔

گل جائے زباں میری کروں ہجو اگر ان کی
یہ تنگ معاشی کا سلاطین کی بیاں ہے

اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک
ہے صاف تو یہ گلشن دہلی میں خزاں ہے

نظیر اکبرآبادی کے یہاں مصحفی سے کچھ الگ دیکھنے کو ملتا ہے ان کا انداز اور زبان و بیان بھی مصحفی سے حد درجہ منفرد ہے۔ نظیر دلی میں پیدا ہوئے اور پھر دلی کے حالات کے چلتے اوروں کی طرح انہیں بھی ترک وطن کرنا پڑا۔ پھر وہ اکبرآباد (آگرہ) چلے گئے۔ وہ آگرے کے روزگار بند ہو جانے کی وجہ سے بے حد پریشان تھے۔ نظیر غضب کی قوت مشاہدہ اور تجزیہ و تحلیل کی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ ایک معاشرے کی کامیابی کا انحصار وہاں کی معیشت

---

[1] (آبِ حیات، مولانا محمد حسین آزاد، اتر پردیش اردو اکادمی، 2003ء، ص: 232)

پر ہوتا ہے۔

دنیا میں اب قدیم سے ہے زد کا بندو بست
اور بے روزی میں گھر کا نہ باہر کا بندو بست

آقا کا انتظام نہ نوکر کا بندو بست
مفلس جو مفلسی میں کرے گھر کا بندو بست

مکڑی کے تار کا ہے وہ نا استوار بند

ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرح آگرے میں بھی بے کاری بری طرح پھیلی ہوئی تھی لوگ روزگار کے لئے دردر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے پھر بھی انہیں دووقت کی روٹی بڑی مشقت سے ملتی تھی۔نظیر نے چھتیس پیشہ کے لوگوں بھی کا ذکر کیا ہے۔ جواس وقت تنگدستی کی حالت میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔

مارے ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دست کار
اور جتنے پیشہ دار ہیں روتے ہیں زارزار

کوٹے ہے تن لوہار توپیٹے ہے سرسنار
کچھ ایک دو کے کام کارونانہیں ہے یار

چھتیس پیشہ والوں کے ہیں کاروبار بند

ڈاکٹر نعیم احمد ان چھتیس پیشہ والوں کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں :

''اس نظم میں چھتیس پیشہ والوں میں سے جن تیس کا ذکر ملتا ہے ان کے نام ہیں۔زردار، پٹے،تارکش، بساطی، نانبائی، بھڑ بھونجے، دھنئے،جلاہے،کاغذی، بیوپاری،کوتوال، ملاح،کمانگر،صحاف، مصور، نقاش،حجام،خادم، بامہن،صراف، بنیا، جوہری،ساہوکار،

پنساری، دلال، سپاہی، ملا، گل فروش، شبیہ ساز۔'' [1]

نظیر کے دیگر شہر آشوبوں میں فوجیوں کی بدحالی، ان کی ذلت وخواری اوران کے پاس ناکارہ ہتھیار باقی رہنے کے متعلق بھی معلومات فراہم ہوتی ہے۔اس دور میں روزگاری اور مالی پریشانیوں کی وجہ سے فوجی نوکری کی تلاش میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر مارے مارے پھرتے تھے۔نظیر کے دوسرے شہر آشوب کے بندوں میں ہر بند کے آخر میں یہ مصرعہ دہرایا گیا ہے۔

ع: غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

اس نظم میں سیاسی اورسماجی اختلال کا تفصیل سے بیان ملتا ہے۔اس دور میں ہر معین قدر بدل رہی تھیں۔ یہ تبدیلیاں اتنی غیر متوقع، تکلیف دہ اور حیران کن تھیں کہ لوگ ان کے تجزیے اور تحلیل سے قاصر تھے۔نظیرؔ اس صورت حال کے اظہار میں کہا ہے۔

یہ جتنا خلق میں اب جا بجا تماشا ہے
جو غور کی تو یہ سب ایک کا تماشا ہے
نہ جانو کم اسے یارو بڑا تماشا ہے
جدھر کو دیکھو ادھر ایک نیا تماشا ہے
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

سعادت یار خان رنگینؔ نے بھی اپنے گردوپیش کے حالات سے متاثر ہوکر شہر آشوب کہے ہیں۔آغاز میں حمد ونعت ہے اس کے بعد رنگین کہتا ہے۔

ایک دن مجھ کو سوچ یہ آیا
یعنی زمانے نے ہے ستایا
اس دنیا میں آئے ہیں جب سے
چین نہیں مطلق تب سے
دولت اپنے پاس نہیں ہے
کچھ آمدنی کی آس نہیں ہے

---

[1] (شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ۔ ڈاکٹر نعیم احمد۔ ادبی اکادمی علی گڑھ۔ 1979ص:151)

فکر معشیت نے ہے مارا
کیجئے کس صورت سے گزارا

ہوا بہت سا جب میں مضطر
تب یہ کہا دل سے گھگھیا کر

کیوں رے دل کیا مرضی ہے تیری
فکر تجھے کچھ ہے بھی میری

مجھ کو تو یہ بات یقین ہے
کوئی دنیا میں کسی کا نہیں ہے

چیز بڑی دنیا میں ہے دولت
بن اس کے ہوتی ہے ذلت

کام یہی دنیا میں ہے آتی
اس لئے سب کو ہے بھاتی

جس سے اس پر ہو کر شیدا
کر اس کو اے جان تو پیدا

کھیتی کر یا کر تو تجارت
نوکری کر یا باندھ کے ہمت

نظیؔر کی طرح رنگیںؔ کے یہاں بھی پیشوں میں درپیش دشواریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن رنگیںؔ کے یہاں محض بارہ پیشوں کا ذکر ہے۔

بات شہرآشوب کی ہو اور بہادر شاہ ظفرؔ کا ذکر نہ ہو یہ تو ناممکن سی بات ہے۔جس وقت بہادر شاہ ظفر تخت پر بیٹھا اس وقت مغل خاندان کا وقار ویسا بلند نہیں تھا جیسا ان کے باپ دادا کے زمانے میں تھا۔ان کی شان وشوکت کا تذکرہ پشتوں اور نسلوں سے چلا آ رہا تھا۔ظفر کو اپنے خاندان کا سیاسی

اقتدار ختم ہو جانے کا بہت افسوس تھا۔ وہ اپنے باپ اور دادا (اکبر شاہ ثانی اور شاہ عالم ثانی) کی طرح انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا وہ اس صورت حال پر اس انداز میں اپنے غم کا اظہار کرتا ہے۔

کیا پوچھتے ہو کجروی چرخ چنبری
ہے اس ستم شعار کا شیوہ ستم گری

کرتا ہے خوار تر انہیں جن کو ہے برتری
اس کے مزاج میں ہے یہ کیا سفلہ پروری

کھائے ہے گوشت زاغ فقط استخواں ہما
کیا منصفی ہے زاغ کہاں اور کہاں ہما

نظم کے آخری بند میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہوئے ظفر کہتا ہے کہ

کیا گیا جہاں میں ہوگئے شاہان ذی کرم
کس کس طرح سے رکھتے تھے ساتھ اپنے وہ حشم

آخر گئے جہاں سے تنہا سوئے عدم
دارا کہاں ، کہاں ہے سکندر ، کہاں ہے جم

کوئی یہاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے
کچھ اے ظفر رہے تو نہ کوئی یہاں رہے

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد دوسری جگہوں کی طرح دلی کے باشندوں کو جس دردناک حالات سے گزرنا پڑا وہ اس دور کے شہر آشوبوں میں نمایاں ہے۔ان شہر آشوبوں میں ۱۸۵۷ء کی پریشانیوں کے علاوہ دلی کی عظمت ، یہاں کی عمارتوں کی دلکشی اور دلی والوں کی سابقہ عیش وعشرت کا تذکرہ ملتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ عرصے میں دلی کی مسلسل برباد ہونے کے باوجود یہاں کے باشندے اسے عظیم ترین شہر سمجھتے تھے۔ان کی تفصیل ''فغان دہلی'' کے شہر آشوبوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔''فغان دہلی'' کو تفصیل سے بیان کرنا ممکن نہیں ہے ورنہ بے جا طوالت ہو جائے گی۔میرا

میدان محض خصوصی شہرآشوبوں تک محدود ہے۔ہاں ۱۸۵۷ء کے چنداہم شہرآشوبوں کامختصر ذکر ضرور کرنا ہے۔

۱۸۵۷ء کے شہرآشوبوں میں مولاناالطاف حسین حالیؔ کا نام قابل ذکر ہے۔ان کے یہاں وطن پرستی کا جذبہ اکثرنظرآتا ہے۔حالی اپنے وطن دہلی سے بے حد محبت کرتے تھےلیکن اس کی بربادی نے ان کی شاعری میں ایک سانحہ کی کیفیت نظرآنے لگی ۔دلی کی بربادی کے متعلق کہتے ہیں۔

تذکرۂ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیاح
دیکھو اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

اورآخر میں ان اشعار پرشہرآشوب کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے کہ۔

بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو روکے رلانا ہرگز

مرزا اسداللہ خان غالبؔ کی تخلیق ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے متعلق ایک ایسا جیتا جاگتا ثبوت ہیں ۔ان نظم ونثر دونوں ہی ۱۸۵۷ء کے انقلاب اوراس دورکے حالات کے پرانے ورق کو روشن کرتی ہیں ۔ان کے خطوط اس وقت کے ترجمان ہیں جب ہمارا ملک انقلاب کے نعروں سے گونج رہا تھااور ہرطرف خون ریزی وقتل وغارت نے کہرام مچارکھا تھالیکن یہاں میرا میدان مطالعہ فقط شاعری ہے وہ بھی شہرآشوب تک محدود ہے۔غالب نے ۱۸۵۷ء کی قیامت خیزی پرایک قطعہ لکھا

تھا۔اس میں نوشعر ہیں ۔ یہ قطعہ یہاں نقل کیا جارہاہے۔

بسکہ فعال ما یرید ہے آج ہو سحلشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دلی کا ذرہ ذرہ خاک تشنۂ خوں ہے ہر مسلمان کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کئے باہم ماجرہ دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح وصال سے یا رب کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

اس طرح شہرآشوب کا مطالعہ ہمیں اس دور کے ہندوستان کی حالت کو سمجھنے میں بیش قرار مدد دیتاہے اس میں جس سیاسی انتشار،نظم ونسق کی خرابی ،اقتصادی بحران اورمعاشرتی اختلال کا ذکر کیا گیاہے اسے فنکارانہ انداز میں اس صنف سخن کا موضوع بنایا گیاہے۔ان شہرآشوب نگاروں نے اپنے مشاہدات، تجربات، خیالات اورجذبات اتنی عمدگی سے پیش کئے ہیں کہ اس سماج کی تصویر ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

باب دوم

مزاحمتی اوراحتجاجی شاعری کی مختصرتاریخ:

☆ کلاسیکی اردوشاعری میں مزاحمت اوراحتجاج کی مختصرتاریخ

☆ جدیداردوشاعری میں مزاحمت اوراحتجاج کی ابتدائی صورتیں

☆ وطن پرستی اورانگریزی حکومت کے خلاف جذبات کا اظہار

کلاسکی اردو شاعری میں مزاحمت اور احتجاج کی مختصر تاریخ

شمالی ہند میں اردو ادب کا آغاز جس دور میں ہوا وہ سیاسی انحطاط اور معاشرتی وتہذیبی زوال کا عہد ہے اور اٹھارہویں صدی کے آغاز سے ہی اس زوال کی ابتدا ہوگئی تھی۔ کہنے کو تو یہ زوال بنیادی طور پر سیاسی انحطاط کا نتیجہ تھا لیکن شکست کا اثر صرف ایک ہی سطح پر نہیں ہوتا بلکہ اس سے خارجی صورت حال کے ساتھ ساتھ داخلی رویے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ سیاسی زوال کی تاریخ میں 1857ء کا انقلاب ایک مرکزی نقطہ ہے۔ اس سے ایک ایسے تاریک باب کا آغاز منسلک ہے جس کے نتیجے میں ایک طرف سے تو ساڑھے چھ سو سالہ (1857-1206) مسلم اقتدار ختم ہوگیا اور دوسری طرف غلامی کا ایک طویل دور شروع ہوا۔ مغلیہ سلطنت کا زوال تو اورنگ زیب کی وفات (1707ء) کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا اور اس کے بعد جو مغل بادشاہ ہوئے ان میں وہ قابلیت نہیں تھی کہ وہ اس خاندان کو وہ وقار واپس دلا پائیں جو ان دنوں پستی کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تارا چند فرماتے ہیں:

> ''پچاس سال تک اورنگ زیب کے ہاتھ میں ایک ایسی مملکت کی باگ رہی جس کی ہمسری کا دعویٰ کیا باعتبار رقبہ، کیا باعتبار آبادی اور کیا باعتبار دولت اس عصر کو پوری دنیا کی مملکتوں میں سے کوئی بھی نہ کر سکتی تھی۔ اپنے انتہائی پیچیدہ فرائض کے ادا کرنے میں اس نے جس لگن، محنت، ہمت اور استقلال کا اظہار کیا وہ اس کو تاریخ کے ایک عدیم المثال حکمران کی حیثیت سے ممتاز کرتا ہے۔'' [1]

مغل خاندان سے قبل جن حملہ وروں نے ایک ایک کر کے اپنے خاندان کو یہاں آباد کیا ان کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔ سب سے پہلا نام غزنی سے آئے محمود غزنوی کا آتا ہے جس نے 1021ء میں پنجاب کو غزنوی سلطنت کا ایک حصہ بنایا۔ پھر 1193ء میں دلی فتح کی۔ پنجاب کی غزنوی ریاست کا خاتمہ 1186ء میں ہوتا ہے اور اسی زمانے سے یہاں محمد غوری کا عہد شروع ہو جاتا ہے۔

---

[1] (تاریخ تحریک آزادی ہند، جلد اول، تارا چند، مترجم۔ قاضی محمد عدیل عباسی۔ 2012۔ قومی کونسل برائے

پنجاب میں مسلمانوں کو ایک مستقل اورقومی سیاسی طاقت ثابت کر دیا تھا اور یہ علاقہ اب اتنا مضبوط ہو چکا تھا کہ شہاب الدین غوری کے قدم دلی کی طرف بڑھنے کے خواب دیکھنے لگے۔ 1192ء میں ترائن کی جنگ میں پرتھوی راج ،غوری کے ہاتھوں شکست کھا جاتا ہے اور یوں شمالی ہند میں راجپوت طاقت بکھرنے کے بعد اگلے برس غوری کا نمائندہ سردارقطب الدین ایبک دلی فتح کر کے اپنے آقا کا خواب پورا کر دیتا ہے۔تاریخ کے سفر میں اب ہم اس مقام پرآ جاتے ہیں جہاں شمالی ہند میں ایک اورتبدیلی واقع ہوتی ہے۔ 1206ء میں قطب الدین ایبک اپنی بادشاہت کا اعلان دلی میں کرتا ہے اور خاندان غلاماں کا آغاز ہوجاتا ہے۔اب صورت یہ بنتی ہے کہ مرکز سلطنت دلی قرار دیا جاتا ہے اور یہ شہر ہندوستان کی تہذیب وثقافت اور زبان کا نیا مرکز بن جاتا ہے۔

تاریخ کے صفحات پرنظر دوڑائیں تو قطب الدین ایبک کی فتح دلی کے بعد پنجاب سے سپاہیوں کا ایک بڑالشکر دلی میں اس دور میں داخل ہوتا ہے جب خسرو خلجی خاندان کے تمام افراد اور سلطان مبارک شاہ خلجی کواپریل 1321ء میں قتل کر کے دلی کی بادشاہت پر قبضہ کر لیتا ہے۔اس کے چند ماہ بعد ہی پنجاب کا حاکم غازی ملک خلجی خاندان کی تباہی کا بدلہ لینے کے لئے خسرو پرحملہ آور ہوتا ہے اوراسے شکست دیتا ہے۔اگست 1321ء میں امراء کی فرمائش پرملکی خلا کو پر کرنے کے لئے دلی کی تخت پر بیٹھتا ہے اور تاریخ میں غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوتا ہے۔

1290ء میں دلی کے تخت سے سلاطین شمسی کا آخری وارث بھی رخصت ہوجاتا ہے اور جلال الدین فیروزشاہ خلجی تخت سلطنت پرجلوہ افروز ہوتا ہے۔جلال الدین خلجی کا بھتیجا اور داماد علاء الدین خلجی کڑہ کا صوبہ دار تھا۔وہ اعلیٰ درجے کا منتظم اور بے حد شجاع وجرأت مند انسان تھا اور ساتھ ہی ساتھ ازبس طالع آزمانوجوان تھا۔اس کی ایک نظر بادشاہ کے بڑھاپے پرتھی اور دوسری نظر تخت سلطنت پر۔وہ سلطان کے انتقال تک تخت کا انتظار کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔اس لئے ابتدائی طور پر منصوبہ بندی کرنے لگا۔علاء الدین یہ خوبی جانتا تھا کہ دلی کے تخت تک پہنچنے کے لئے اسے افواج اور خاصی دولت کی ضرورت ہے،ان ہی ایام میں اسے دکن کے علاقے دیوگیری کے انمول اور مال ودولت سے لدے شاہی خزانوں کی خبرملی۔ یہ وہ خزانے تھے جوصدیوں سے

دیوگیری کے شاہی خاندان کی وراثت چلے آرہے تھے۔تخت دلی تک پہنچنے کی عجلت کشاں کشاں علاء الدین کودکن کے اس سب سے خوشحال علاقے میں لے گئی۔دکن پرحملہ کی یہ واردات جلال الدین خلجی سے پوشیدہ رکھی گئی۔1296ء میں دیوگیری کی اس مہم میں علاء الدین کوکامیابی نصیب ہوئی اوروہ دیوگیری کے خزانوں کوسمیٹ کر لوٹ آیا۔جلال الدین خلجی اس فتح سے بے حدمتاثر ہوا اورعلاء الدین کو مبارکباد دینے کے لئے کڑہ کی طرف آیاجہاں اسے علاء الدین کی طائع آزمائی اورشقاوت قلبی کا شکار ہوکرسفرآخرت اختیارکرنا پڑا۔

علاءالدین کوفتوحات کا جنون تھا۔1308ء سے 1314ءتک اس کا سپہ سالار ملک کافور دکنی مہمات میں مسلسل مصروف رہا۔اس کا مشن دیوگیری کودوبارہ فتح کرنا تھا کیونکہ راجہ باج گزار نہ رہا تھا۔ان مہمات میں ملک کافور کے سپاہی دیوگیری کوروندتے ہوئے وارنگل،دوارسمدر،معبراور رامیشورم تک جاپہنچے۔

اس کے بعدتغلق خاندان کاعروج ہوااوراس کے سلطان محمدتغلق نے یہ تاریخی اعلان کیا کہ دلی کے بعد دیوگیری کودوسرامرکزسلطنت قراردیاجائے چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی۔بادشاہ نے فرمان جاری کردیا کہ دلی کے تمام شہری ،عورتیں،مرد، بچے،بوڑھے،جوان سب کے سب دیوگیری منتقل ہوجائیں۔یہ اعلان دلی کی تاریخ میں ایک شہرآشوب کی حیثیت رکھتا ہے۔اہل دلی کے لئے یہ فیصلہ قیامت سے کم نہ تھامگرقدیم اردوکی تاریخ میں یہ زمانہ بنیادی اہمیت کاحامل ہے۔1398ء میں امیرتیمورنے دلی پرزبردست حملہ کیا۔اس حملے میں دلی سلطنت کو سیاسی،تہذیبی اور مالی طور پر شدید نقصان پہنچایا۔دلی شہرکے اندرلشکریوں اورشہریوں کی لاشوں کے انبارلگ گئے۔اس حملے کانفسیاتی طورپربھی برا اثرہوا۔ تمام باشندے،علماء صو،فیااوراشرافیہ کے لوگ ذہنی طورپرعدم تحفظ کاشکار ہوئے اوران کو یہ معلوم ہوگیا کہ دلی مرکزعوام وخواص کی حفاظت کرنے کااہل نہیں ہے۔اس لئے تیمورکے بعدلوگوں کے ذہن پرایک غیرمحفوظ مستقبل کاخوف طاری تھا۔اس حملے کاایک ردعمل یہ بھی ہواکہ مرکزکوکمزوردیکھ کرصوبہ داراپنی خودمختاری کے خواب دیکھنے لگے۔

تغلق خاندان کے بعدسیداورپھراس کے بعدلودی خاندان کی وراثت نے سلطنت کے تخت

وتاج کوجلوہ افروز کیا۔ پھرلودی خاندان کے آخری سلطان ابراہیم لودی اورمغل خاندان کے پہلے چشم و چراغ ظہیرالدین بابر کے درمیان 1526ء میں پانی پت کی لڑائی ہوئی۔اس جنگ میں ابراہیم لودی کی بری طرح شکست ہوئی اور بابر فتح یاب ہوا اوراس نے ہندوستان میں مغل خاندان کی داغ بیل ڈالی۔اس خاندان میں ایک کے بعد ایک شجاعت ور اورانصاف پسند بادشاہ شامل تھے جن کے عدل وانصاف کے قصے آج بھی لوگوں کے درمیان سنے اورسنائے جاتے ہیں۔ بابر کے بعد جو بادشاہ ہوئے ان میں ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کی تہذیبی وثقافتی وراثت کوآگے بڑھایااوراس میں جابجا اپنی بھی تہذیبیں شامل کیں۔فن کے ہر شعبے میں انہیں نہایت دلچسپی تھی ،خواہ وہ فن تعمیر ہو یافن موسیقی ،فن مصوری ہو یا پھرادب فن۔تمام فنون طیفہ میں ان کی دلچسپی کی مثال آج بھی ہندوستان میں موجود ہے خاص طور پرفن تعمیر کے معاملے میں تو اتنے طویل عرصے کے بعدآج بھی ان کا کوئی ثانی نہیں، ان کے ذریعے تعمیر کئے گئے محلات ، قلعے اور عالیشان عمارتیں آج بھی ہندوستان کے لئے باعث فخر ہیں اور آئندہ بھی ہندوستان کی شان میں اضافہ کرتی رہیں گی لیکن یہ تو قدرت کا قانون ہے، جس کا عروج ہوا ہے اس کا زوال بھی لازم وملزوم ہے۔اس عظیم الشان سلطنت نے برصغیر میں ایک طرف سے سیاسی اتحاد پیدا کئے تو دوسری طرف قومی تصور سے بھی روشناس کیا۔اس عہد کے ساتھ ایک ایسی وسیع تہذیب وابستہ تھی جس نے معاشرے میں فکروفن کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔حالانکہ سترہویں صدی اس عظیم سلطنت کا عہدزریں تھا۔اٹھارہویں صدی میں تو یہ زوال کی جانب آمادہ تھی۔اورنگ زیب کے انتقال کے بعد سے ہی یہ منتشر ہونے لگی۔ڈاکٹرجمیل جالبی لکھتے ہیں :

''اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (1707ء) اس صدی کا پہلا اور
سب سے اہم واقعہ ہے جس کے بعد 'پچاس سالہ کے عرصے میں'
نااہل جانشینوں کی بے طاقتی، خانہ جنگی، عیش پرست امراء کی باہمی
آویزش، عسکری قوت کی کمزوری اورسلطنت کے وسیع تر مفاد میں
اتحاد کے جذبے کے فقدان نے اس وسیع وعریض سلطنت کو پارہ

پارہ کردیا۔'' ا

عہد مغلیہ میں پورا ہندوستان تقریباً ایک صدی تک مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کی مسلسل شورشوں اور تباہ کاریوں سے لرزتا رہا۔ اس انتہائی تکلیف دہ صورت حال میں مجموعی طور پر انسانوں میں بے بسی، کس مپرسی، فنا، عاجزی اور لاچاری کے تصورات پیدا ہونے لگے۔ ایسے میں شاہ ولی اللہ نے اپنی طرف سے اصلاحات کا پیغام دیا اور مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے لئے غور وفکر کرتے رہے۔ انہوں نے ہی احمد شاہ ابدالی کو فتح دلی کے لئے دعوت دی تھی تاکہ وہ انہیں مرہٹوں سے نجات دلائے۔ 1761ء میں مرہٹے اور احمد شاہ ابدالی کے درمیان پانی پت کی تیسری جنگ ہوئی۔ مرہٹوں کی عبرت ناک شکست سے شاہ ولی اللہ کی آرزو تو پوری ہوگئی لیکن اس کے بعد دلی کی حالت اور بھی تباہ ہوگئی۔

جب ہم ادب کی بات کرتے ہیں تو اس میں زندگی کے تمام گوشے نظر آتے ہیں۔ ادب ہی ایسا وسیلہ اظہار ہے جس کے ذریعہ ہر شاعر و ادیب اپنے دلی جذبات و کیفیات کو پیش کرتا ہے جس سے اس دور کے سماجی، سیاسی، معاشی و معاشرتی رویّوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے اس فارسی شعری روایت سے مغلوب ادبی ماحول میں ایک ایسے شاعر کی آواز بلند ہوتی ہے جو حالات سے ناآسودہ اور مخالفت کرنے والی طبیعت کا مالک ہے۔ اس دور میں جعفر زٹلی کا کردار ایک ردعمل کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔

میر جعفر زٹلی ایک ایسے عبوری دور کے شاعر تھے جب شمالی ہند میں اردو پوری طرح شعروسخن کی زبان نہیں بنی تھی اور ایک ایسے علاقے (ہریانہ) کے رہنے والے تھے جہاں کی زبان نے اردو کی تعمیر میں ان کی پیدائش سے صدیوں پیشتر بہت بڑا حصہ لیا تھا۔ جعفر کے حالات زندگی کسی تذکرے یا تصنیف میں نہیں ملتے۔ نکات الشعراء، مخزن نکات، چمنستان شعراء، تذکرہ سوزش، تذکرہ میر حسن اور مجموعہ نغز وغیرہ میں جو حالات موجود ہیں وہ بہت مختصر ہیں اور ان سے صرف اس بات کی معلومات ہوتی ہے کہ جعفر، جعفر زٹلی کے نام سے مشہور تھے۔ نادر زمان اور اعجوبۂ دوران تھا، زبان گزیدہ رکھتا تھا۔ وہ فارسی کے مشہور شاعر مرزا بیدل کے ہم عصروں میں بہت بڑے ہزل گو تھا اور اپنی

ا (تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، جلد دوم، حصہ اول، 2013ء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

بے باکی اور جدت طرازی کے باعث ہندوستان میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ اگر چہ زٹلی کے ہم عصر ،بعد کے تذکرہ نویس اور محقق و نقاد ان کو شاعر تسلیم نہیں کرتے لیکن ان کی اکثر نظمیں ایسی ہیں جو ان کو ایک اچھے شاعر کی صف میں کھڑا کرتی ہیں۔

میر جعفر نے جب شاعری شروع کی تو مغلیہ تہذیب کی اکائی بظاہر ثابت و سالم نظر آ رہی تھی مگر اندر سے ٹوٹ رہی تھی۔ انسانیت اور محبت و خلوص کے رشتے بوسیدہ ہو رہے تھے۔ عدل و انصاف معاشرے سے رخصت ہو رہا تھا۔ بیرونی طاقتیں برعظیم کے ساحلوں پر قدم جما رہی تھیں اور شمالی سرحدوں پر موقع کی تاک میں تھیں۔ معاشرتی رشتے بکھر رہے تھے اور مکاری و عیاری خاص اہمیت حاصل کر رہی تھی۔ جعفر نے معاشرے سے سمجھوتا نہیں کیا بلکہ طنز و ہجو کی تلوار سے اس معاشرے کے رویوں، اس کی مکاریوں، عیاریوں اور منافقتوں پر گہرا وار کیا۔ ایک ایسے دور میں ہجو ، ہزل اور طنز ہی وہ ذریعہ ہے جس سے منافقت کے چہرے سے نقاب اٹھا کر معاشرے کو آئینہ دکھایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر نعیم احمد فرماتے ہیں:

> ''زٹلی بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ ایک فحش گو تھا۔ لیکن اس کے کلام کی کچھ اور خصوصیتیں بھی ہیں۔ اس کی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے اس نے اپنے دورستمی کی صورت حال کے اثرات بیان کئے ہیں۔ اس کے یہاں جو ابتذال اور فحش نگاری ہے وہ اس عہد کی اخلاقی گراوٹ کا نتیجہ نظر آتی ہے اور اس کے شعروں میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد پیدا شدہ سیاسی اور سماجی خلفشار کے خلاف نفرت کا اظہار ملتا ہے۔'' [1]

''زٹل نامہ'' (کلیات جعفر زٹلی) میں ہجویات کے بہت سے اشعار ہیں۔ ہجو بہادر شاہ کے نام سے ایک قطعہ ملتا ہے۔

اے شاہ زناں تاج شہاں بر سر تو
یاجوج ماجوج بود لشکر تو

ا (شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ۔ ڈاکٹر نعیم احمد۔ 1979ء۔ ادبی اکادمی، علی گڑھ۔ ص 113)

آثار قیامت زجنبیت آشکار
دجال توئی و خان خاناں خر تو

'فخر النساء' 'بیگم خاں جان' کی بیٹی تھی۔جعفر نے مدحیہ اشعار لکھ کران کو بھیجے۔نواب زادی نے دیوان کو حکم دیا کہ مرزا جعفر کو تیس روپئے دے دئے جائیں۔دیوان کی نیت میں فتور آ گیا اور تیس روپئے کے بجائے پانچ روپئے تھما دئے۔جعفر کو پتا چلا تو فتح خان کی ہجو اور فخر النساء کی مدح میں یہ قطعہ لکھا۔

جو میں نے مدح بیگم کی بنائی
لکھی اور جائے کر میں پڑھ سنائی

زہے دھر ماتما کا شکر بیٹی
سخی داتا بہادر کی ہے بیٹی

زعصمت مریم و بلقیس ثانی
خدا کے ناؤں کی عاشق دیوانی

دلائے تیس لیکن پانچ نکلے
الٰہی فتح خان کی کانچ نکلے

جعفر دکن میں شہزادہ کام بخش کے سواروں میں شامل تھے اور مورچل کی خدمت پر مامور تھے۔جعفر اس خدمت سے تنگ آ گئے اور شہزادے سے عرض کی لیکن سنوائی نہ ہوئی۔پھر نوکری چھوڑ دی۔نوکری چھوڑنے کے بعد مالی حالت خراب ہوگئی اور جعفر کو وہاں سے بھاگنا پڑا جس کا اظہار ایک نظم ''حسب خود گفتہ شد'' میں کیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

در بیکسی افتادی ، با درد و غم آبادی
مفلس شدی و در بدر کہہ جعفر اب کیسی بنی

از ہجو آں سلطان خود کردی پریشاں خان خود
دا ماندۂ بے بال و پر کہہ جعفر اب کیسی بنی

دل کو ٹھکانے لاؤ اب کر صبر مت پچھتاؤ اب
ہرگز مگو بار دگر کہہ اب کیسی بنی

از لفظ بے معنی خود از حرف لا یعنی خود
متحاج از ہر خشک و تر کہہ جعفر اب کیسی بنی

جعفر کو ہمیشہ محض ہزل اور زٹلی سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ان کے کلام کا اندازہ اس وقت تاریخی ، تہذیبی ولسانی زاویئے سے لگانا چاہئے۔ان کے کلام میں نہ اس دور کے حالات کا ذکر ہے بلکہ معاشرتی اور تہذیبی زوال اورسیاسی واخلاقی گراوٹ کے بنیادی اسباب کا بھی حال شامل ہے۔ان کے یہاں اپنے دور کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے۔انہوں نے نہ صرف غزل کو وسیلہ واظہار بنایا بلکہ نظم کو بھی اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔جس معاشرے نے ذہن کے دریچے اس طرح سے بند کر لئے ہوں کہ ان کی کنڈیاں بھی زنگ آلود ہوچکی ہوں ،وہاں سنجیدہ روایتی انداز کے بجائے چیر دینے والی آواز ہی سے ''عقلمندوں'' کی حماقتوں کا راز فاش کیا جا سکتا تھا اور غزل کے ذریعے اس کام کو انجام تک پہنچانا ناممکن تھا اس لئے نظم کا سہارا لینا پڑا۔انہوں نے ہجویہ اور طنزیہ شاعری کے ذریعے اس دور کے حالات کی بھرپور ترجمانی کی۔ یہ ہجویہ شاعری ''شہر آشوب'' کی حیثیت رکھتی ہے اور اس لہجے میں آئندہ دور میں لکھے جانے والے شہر آشوبوں کی راہیں ہموار کرتی ہیں۔ ''در بیان نوکری'' کے عنوان سے فرماتے ہیں۔

بشنو بیان نوکری جب گانٹھ ہووے کھوکری
تب بھول جاوے چوکڑی، یہ نوکری کا حظّ ہے

صاحب عجب بیدار ہے ، محنت ہمہ برباد ہے
اے دوستاں فریاد ہے ، یہ نوکری کا حظ ہے

دربار دیکھا خان کا ، بیڑا نہ پایا پان کا
ٹکڑا نہ پایا نان کا ، یہ نوکری کا حظ ہے

دھنیا جلاہا طاق ہے کنجڑا قصائی چاق ہے
دیوث قرمساق ہے ، یہ نوکری کا حظ ہے

ہر صبح ڈھونڈے چاکری ، کوئی نہ پوچھے بات ری
سب قوم ڈھونڈن لاگ ری ، یہ نوکری کا حظ ہے

گھوڑا رہا بھوکا سدا ، اور فاقہ شد میاں گدّا
بیبی کہے میرا خدا ، یہ نوکری کا حظ ہے

جعفر! خدا کو یاد کر غمگین دل کو شاد کر
یہ گفتگو برباد کر ، یہ نوکری کا حظ ہے

جعفر زٹلی کی شاعری اور انداز بیان کے متعلق ڈاکٹر تبسم کاشمیری اظہار خیال کرتے ہیں :

''جعفر زٹلی مزاج کے اعتبار سے انتہائی دریدہ دہن ، انتہائی بے باک اور آتش بیان انسان تھا۔ وہ ہر قسم کے سیاسی، ریاستی، معاشرتی اور تہذیبی ادب و آداب اور رسومات سے ماورا شخص تھا اور کسی قسم کے خوف یا احتساب کو دل میں نہ لاتا تھا۔ روزمرہ زندگی کے ظاہری آداب و قواعد کو توڑ دینا اس کے لئے معمولی بات تھی۔'' [1]

جعفر زٹلی کی شاعری اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کا آغاز غزل کی روایت سے نہیں ہوا بلکہ احتجاجی شاعری نے نظموں کی شکل میں اپنے نقش درست کیے تھے۔ ان کی شدید ناگواری اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے معاشرے کی سچی تصویر کو پیش کر رہے تھے جہاں پر جھنجھلا کر آدمی بے اختیار گالی تک دے بیٹھتا ہے اور یہ عالم جس قدر شدت کے ساتھ طاری ہوگا انداز بیان میں اتنی تلخی اور گرمی بڑھتی جائے گی۔ ایسے میں ذہن گرد و پیش کی تلخ حقیقتوں کو اور غیر پاکیزہ صداقتوں کو بے تکلف بیان کرنے لگتا ہے اور سارے آداب والقاب کو بالائے طاق رکھ کر بے نقط سنانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اپنے دور کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے۔

---

[1] اردو ادب کی تاریخ (ابتداء سے 1857 تک) ڈاکٹر تبسم کاشمیری 2009 ایم آر پبلیکیشنز ص 267)

گیا اخلاص عالم سے ، عجب یہ دور آیاہے
ڈرے سب خلق ظالم سے ، عجب یہ دور آیا ہے

نہ یاروں میں رہی یاری ، نہ بھائیوں میں وفا داری
محبت اٹھ گئی ساری ، عجب یہ دور آیا ہے

بہت سے مکر جو جانے ، اُسی کو سب کوئی مانے
کھرا کھوٹا نہ پہچانے ، عجب یہ دور آیا ہے

چغل کرتے پھریں چغلے ، بھکل کرتے پھریں بھکلے
دغل کرتے پھریں دغلے ، عجب یہ دور آیا ہے

خوشامد سب کریں زر کی ، چہ بیگانہ چہ باگھر کی
ملاوے بات سب ہر کی ، عجب یہ دور آیا ہے

سپاہی حق نہیں پاویں ، نت اٹھ اٹھ چوکیاں جاویں
قرض لے لے سبھی کھاویں ، عجب یہ دور آیا ہے

جعفر کا دور معاشی اور سیاسی بحران کا زمانہ تھا جب ہندوستان ایک سنگین سیاسی کشمکش کے دور سے گزر رہا تھا۔ جونوکری کرتے تھے ان کوبھی سکون نہیں تھا اور جو بے روزگار تھے ان کا تو حال ہی برا تھا۔ادب درباروں اور نچلے طبقے کے لوگوں تک محدو ہوکررہ گیا تھا۔جعفران تمام باتوں سے ناآسودہ تھے اورکھل کران کی مخالفت کرتے ہیں۔وہ ان تمام سماجی برائیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اورتمام فرسودہ رسومات سے معاشرے کوآزادکرانے کی کوشش وسعی بھی کرتے ہیں لیکن ان کی مخالفت انقلابی شکل اس لئے اختیار نہیں کرپاتی کیونکہ انہوں نے سماج میں پھیلی برائیوں کا پردہ فاش تو کیاہے مگراس کا کوئی حل نہیں تلاش کیا اس سے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی فرماتے ہیں:

”جعفر اپنی ہجویات میں لفظوں کی تپتی ہوئی سلاخوں سے روح پر
چرکے لگاتاہے اورمعاشرے کو،حاکموں کوغیرت دلانے کے لئے
ان کے منھ پرتھوکتاہے۔اس نے اپنی شاعری سے اردوزبان کوایک

نئ توانائی دی ہے اورشاعری کاایک مقصد بھی متعین کیا ہے۔ایک ایسے دور میں جب خلوص بے معنی ہو چکا ہو،محبت،مروت، شرافت و نیکی کی قدریں مردہ ہوچکی ہوں،اورمکروفریب ،لوٹ گھسوٹ ،امرد پرستی، زنانہ پن، بے حیائی واوباشی زندہ قدریں بن گئی ہوں،جعفرکی آواز ایک سچے انسان کی زندہ آواز بن کر ابھرتی ہے اوراپنی طرف بلاتی ہے۔'' [1]

جعفرکی شاعری میں سیاسی ادبار،نظم ونسق کی خرابی،معاشرتی اوراخلاقی پستی کے رنگ اپنی تمام تر تیزی کے ساتھ نظرآتے ہیں۔اسے اپنے دورکی خرابیوں اورخامیوں کااحساس شدت سے تھا۔بعض اوقات وہ اکتاجاتا تھا کہ اس معاشرے سے راہ فرار اختیار کرلے۔اپنی طویل نظم ''دستور العمل نصیحت آمیز''میں وہ مختلف سماجی برائیوں کی طرف اشارہ کرتاہے۔وہ عورتوں کوبھی نصیحت کرتا ہےاورملاؤں کابھی مذاق اڑاتاہے۔قاضی ومنشی پربھی تنقیدکرتاہے اورسسرودامادودوستی کامعیاربھی پیش کرتاہے اورسماج میں پھیلی ہوئی جہالت سےبھی بیزارنظرآتاہےاس کی مثال مندرجہ ذیل اشعار سے دی جاسکتی ہے۔

جو نار لچے چال میں سسکی بھرے ہرحال میں
کالا تو ہے کچھ دل میں ، از قرب اور زنہار بہ

بخشی اگر بے سوز ہے ، چوکی کہ دوسہ روز ہے
وہ چاکری بھی گوز ہے ، زاں نوکری بے گار بہ

سسرا جو ہو دل تنگ جی مسک خسین و سنگ جی
داماد سے بے رنگ جی ، اس سے سگ مردار بہ

جو لالچی داماد ہو ، جب دیجئے تب شاد ہو
بانو ہنسی میں خاد ہو ، ازوے بہ پہلو خار بہ

لنگوٹیا جو یار ہو ، ہمزاد کا سا پیار ہو
دولت بڑی عیار ہو ، بر روئے او پیزار بہ

---

۱ (تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، 2013، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص 89)

جاہل سے ملنا حیف ہے اس کو جہل کا کیف ہے
ہر بات اس کی سیف ہے، زاں دیو و درخونخوار بہ

جعفر نے عشق و عاشقی، ہجر و وصال اور راز و نیاز یا مدح کی جگہ عوام وخواص کے دکھ درد اور تاریخی جبر کی پردہ دری کو موضوع سخن بنایا یہ ان کا ادبی اجتہاد تھا۔اس دور میں منھ کھولنا تو دور کوئی اپنے ذہن میں ایسے سخت موضوع کی طرف خیال بھی نہ کرسکتا تھا۔اس کی ان ادبی کوششوں میں سچائی اور پیرائیہ بیان میں اتنی تلخی اورتندی تھی کہ نفاست ونزاکت پسند اسے برداشت ہی نہ کرسکیں اور اسے ہزال،فحش گو اور ہجو نگار کہہ کر ٹال گئے۔بعض لوگوں نے تو انہیں لایعنی شاعر بھی کہا ہے اور ان کے کلام کو ادب میں کوئی اہمیت نہ دی یہ ان لوگوں کی تنگ نظری ہے جو کلام جعفر کی اہمیت سے انکار کرتے ہیں۔ان کے کلیات کے مرتب جناب رشید حسن خاں اظہار خیال کرتے ہیں:

''کلام جعفر کی یہ بڑی اہمیت ہے کہ اس کی بنیاد پر اردو زبان اس پر فخر کرسکتی ہے کہ شروع ہی سے یعنی اس زمانے سے جسے شمالی ہند میں اردو کے فروغ کا پہلا دور کہنا چاہئے،شاعری میں سماجی مسائل ومشکلات کا بے لاگ بیان موضوع سخن کے طور پر ملتا ہے۔موضوع کی مناسبت سے لہجے میں بے باکی ہے اور کھرا پن۔جعفر اس روایت کا بنیاد گزار ہے۔بگڑے ہوئے سیاسی حالات، بے کاری، بدنظمی، افلاس ان سب کے ہلکے گہرے بیانات اس کی شاعری میں محفوظ ہوگئے ہیں۔'' [۱]

یہ زمانہ مغل بادشاہ فرخ سیر کا زمانہ تھا اور اس نے تخت پر بیٹھتے ہی بہت سے لوگوں کو قتل کرا دیا تھا۔زیادہ تر لوگ تسمہ کشی (پھانسی) سے ہلاک کرائے گئے۔جب فرخ سیر کے نام کا سکہ مسکوک ہوا تو اس پر یہ شعر لکھا گیا۔

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر
پادشاہ بحر و بر فرخ سیر

۱ (زٹل نامہ، مرتب رشید حسن خاں، 2003، انجمن ترقی اردو دہلی، ص 17)

جعفر زٹلی نے اس کے جواب میں یہ ''سکہ'' لکھ کر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔

سکہ زد بر گندم و موٹھو مٹر
پادشاہ ہے تسمہ کش فرخ سیر

اور اس طرح زٹلی کو بھی نئی بادشاہت کی تضحیک پر قتل کرا دیا گیا۔ ڈاکٹر علی جاوید اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''جعفر ایک وسیع النظر شخص تھے جن کا ذہن اس کے نظام سے قطعی طور پر سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھا۔ ان کی بصیرت آمیز نظریں سماج کے ہر پہلو پر تھیں۔ انہوں نے ہر طرح کی معاشرتی برائیوں کے خلاف احتجاج کیا اور ان کی پردہ دری کی۔'' [1]

ولی کی شاعری میں بھی مزاحمت و احتجاج کے عنصر نظر آتے ہیں لیکن وہ محبوب سے چھیڑ چھاڑ تک ہی محدود رہتے ہیں۔ یہی اس دور کی شاعری کا اصل پہلو بھی ہے۔ وہ اسی مزاج کو مزاحمت و احتجاج کا ذریعہ بنا کر زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ عشق سے متعلق ان کا خیال کچھ اس طرح ہے۔

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

نہ چھوڑے محبت دم مرگ لگ
جسے یار جانی سو یاری لگے

نہ ہووے جگ میں اسے ہرگز قرار
جسے عشق کی بیقراری لگے

دیوان ولی کی آمد 1721ء سے قبل کے دور کو ریختہ گوئی کا دور کہا جاتا ہے۔ یہ ریختہ گوئی کے اس دور میں زبان محض ذائقہ بدلنے کی چیز سمجھی جاتی تھی اور فارسی گو شعراء بھی کبھی کبھار محض خوش طبعی کے لئے ریختہ میں طبع آزمائی کر لیتے تھے۔ اس فہرست میں مرزا معزالدین محمد موسوی، بیدل،

ا (جعفر زٹلی کی احتجاجی شاعری، علی جاوید، 2000، رائٹرس گلڈ دہلی، ص116)

قبول کشمیری،سعداللہ گلشن،نواب امیرخاں انجام، آرزو اور مخلص وغیرہ شامل ہیں۔ان شعراء کے کلام کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فارسی غزل کی روایت کو ریختہ میں منتقل کرنے کی ابتدائی کوشش کررہے تھے۔زبان کی اصلاح اور تہذیب کو دور بہت بعد میں شروع ہونے والا تھا۔یہ محض ایک تاریخی اور ادبی احتجاج ہے جس کا موضوع ہیئت سے انحراف ہے۔اس کے بعد ایہام گوئی کی روایت بھی شروع ہوئی۔ایہام کے لغوی معنی ''وہم میں ڈالنا'' ہے اصطلاح میں وہ صنعت جس میں شاعر اپنے کلام میں ایک ایسا لفظ لائے جس کے دو معنی ہوں۔ایک اس مقام کے قریب دوسرا بعید۔ لیکن شاعر بعید سے مراد لے۔یہ بھی تاریخی اعتبار سے ادبی احتجاج ہے جہاں ایک تحریک دوسری پر غالب ہے۔

محمد شاکر ناجی بھی ایہام گوئی کی تحریک سے وابستہ تھے یہ وہ شاعر تھے جنہوں نے عالمگیری سطوت شاہی کے دور میں آنکھیں کھولیں۔ناجی کا پیشہ سپہ گیری تھا۔وہ نادرشاہ سے کرنال کے میدان میں جنگ کے وقت محمد شاہ کا شریک حال تھا۔اس کی فوجی معلومات،شوخ مزاجی اور کرنال کی لڑائی کے مشاہدات نے اسے ایک شہر آشوب لکھنے پر مجبور کر دیا۔بند ملاحظہ ہوں۔

بڑے ہوئے نہ برس بیس اس کو بیتے تھے
دعا کے روز سے دائی ودوں کے جیتے تھے

شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے
نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ جیتے تھے

گلے میں ہنسلیاں بازو اوپر طلائی نال

ناجی کو محمد شاہی دور کے ذہنی انحطاط کا استعارہ کہا جا سکتا ہے۔وہ اس زوال یافتہ تہذیب کا نمائندہ ہے جو ذہنی اور فکری طور پر اضمحلال اور مجہولیت کی بدترین حالتوں میں گرفتار ہو چکی تھی۔اس کے دور کا تعلق صرف سیاسی،عسکری،اقتصادی اور اخلاقی پسماندگی ہی سے نہیں بلکہ ذہنی پسماندگی سے بھی ہے۔

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا
کہ میں نشان کے ہاتھی اور پر نشانا تھا

نہ پانی پینے کا پایا وہاں نہ کھانا تھا
ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا

اس نظم سے ہی دلی کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بہت عرصے سے آسائش کی زندگی بسر کررہے تھے۔ان کا بڑا مشغلہ شراب پینا تھا۔ یہ بے پناہ توہم پرست تھے اور جادوٹونے میں کافی یقین رکھتے تھے۔

شاہ حاتم اپنی طویل عمر میں اردوشاعری کی دوتحریکوں سے وابستہ رہے۔ پہلے آبرو، ناجی اور مضمون کے ساتھ ایہام گوئی کی تحریک میں پھر مرزامظہر جان جاناں کی ردعمل کی تحریک کواختیار کیا۔ انہوں نے دو دیوان ،دیوان قدیم اوردیوان زادہ تخلیق کئے۔شاہ حاتم کی زندگی کم وبیش پوری اٹھارہویں صدی عیسوی کا احاطہ کرتی ہے۔حاتم نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ زمانہ سیاسی زوال ،معاشی بدحالی،اخلاقی انحطاط،معاشرتی انتشار، باطنی اضطراب،خانہ جنگیوں اورامراء کے درمیان کشمکش کا زمانہ تھا۔ اس وقت ایسے بادشاہ تھے جوامراء کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی کی طرح آتے جاتے تھے۔نادرشاہ کا حملہ،قتل عام، دلی کی بربادی اوراحمد شاہ کے حملے،انگریزوں کا وسیع اقتدار، مرہٹوں کا عروج وزوال سارے واقعات سے وہ آشنا تھے۔

حاتم غزل کا محض عشقیہ شاعرہی نہ تھا۔وہ اپنے دورکی سماجی اورسیاسی صورت حال کی بھی بصیرت رکھتا تھا۔عالمگیر کے بعد سلطنت مغلیہ کے زوال پراس کی نظرتھی اوروہ اس المیہ کے سماجی عوامل کو بخوبی طور پرسمجھتا تھا۔اس موضوع پراس نے ایک شہرآشوب لکھا تھا۔اس شہرآشوب میں معاشرے کے اعلیٰ طبقات ایک ہمہ گیرزوال کے کرب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔حاتم نے یہ شہرآشوب 1728ء میں لکھا تھا۔عہد حاتم کے اشرافیہ کا جوالمیہ اس شہرآشوب میں ملتا ہے اس کے عقب میں مغلیہ دور کے جاگیرداری نظام، امراء اورمنصب داروں کی شکست وریخت نظرآتی ہے۔

یہاں کے قاضی و مفتی ہوئے ہیں رشوت خور
یہاں کے دیکھ تو سب اہل کار ہیں گے چور

یہاں سبھوں نے بھلائی ہے دل سوں موت اور گور
یہاں کرم سین نہیں دیکھتے ہیں اور کی اور

یہاں نہیں ہے مدارا بغیر دارو مدار

رجالے آج نشے زر کے ماتے ہیں
پہن لباس زری ہم کوں سج دکھاتے ہیں

مسی پہ جان چبا سر خرو کہاتے ہیں
کبھوں ستار کبھوں ڈھولگی بجاتے ہیں

غرور وغفلت و جوبن میں مست ہیں سرشار

حاتم کے مخمس سے نادرشاہ کے حملے کے مابعد اثرات کا پتا چلتا ہے۔ حاتم نے اس کے شروع میں معین اقدار کی درہمی اور نظم ونسق کی برہمی پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

شہوں کے بیچ عدالت کی کچھ نشانی نہیں
امیروں کے بیچ سپاہی کی قدر دانی نہیں

بزرگوں کے بیچ کہیں کوئی مہربانی نہیں
تواضع کھانے کی چاہو کہیں تو پانی نہیں

گویا جہاں سے جاتا رہا سخاوت و پیار

اس شہر آشوب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نچلے طبقے کی دولتمندی عشرت پسندی اور آرام و آسائش کا مفصل بیان ملتا ہے۔ حاتم نے جن پیشہ وروں کی خوشحالی کا حال نظم کیا ہے ان کے پیشوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ مخمس کا ایک اور شعر دیکھئے۔

کہ دور بارہ صدی کا ہے سخت کج رفتار
جہاں کے باغ میں یکساں ہے اب خزاں و بہار

اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی فرماتے ہیں:

''شہرآشوب میں حاتم نے لکھا ہے کہ اس بارہویں صدی میں بادشاہوں میں عدالت وانصاف نہیں رہا۔امیروں کے یہاں اب سپاہی کی قدر اور بزرگوں میں شفقت ومہربانی نہیں رہی۔ قاضی و مفتی رشوت خوراور اہل کارکام چور ہوگئے ہیں۔موت اور قبر کوسب نے بھلا دیا ہے۔امیر زادے مفلوک الحال ہوکر تلاش مال میں چرخے کی طرح پھرتے ہیں۔صراف، کناری باف،نہاری پز، کبابی، شمع فروش،کنجڑے،دھنئے،جلاہے،دھوبی،چمار،رفوگر، حلوائی، میوہ فروش،باورچی،بنئے،نوارباف،گھسیارے،تنبولی،کہار،آتش باز، کمان گر سرپر چڑھ گئے ہیں۔ہر چیز قدر زیر وزبر ہے۔ستار اور ڈھولک، بھڑوے،لولی اور کنچنیاں معاشرے پر چھا گئے ہیں۔''[1]

اس نظم کے آخری دو بندان تاریخی واقعات کے عکاس ہیں۔جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شرفاء رذیلوں سے مدد کے درخواست کرنے پر ترک دنیا کو ترجیح دیتے تھے۔حاتم نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا ہے۔

کرے ہے چرخ اگر تجھ اوپر جفا حاتم
تو سفلے پاس نہ کر جا کے التجا حاتم

ترے ہے رزق کا ضامن سدا خدا حاتم
تو انقلاب زمانے سے غم نہ کھا حاتم

کہ تجھ کو رزق بہت اور روزگار ہزار

---

[1] (تاریخ ادب اردو جلد دوم۔ڈاکٹر جمیل جالبی 2013۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ص344)

اشرف علی فغاں نے بھی اردو شاعری کی تاریخ میں کچھ شہرآشوب تخلیق کئے ہیں۔انہوں نے ایک نظم ''ہجوراجہ رام نرائن'' کے عنوان سے لکھی ہے۔یہ نظم قصیدے کی ہئیت میں ہے۔یہ عوام و خواص کی فاقہ زدگی کی دکھ کی دکھ بھری حکایت ہے۔فغان کا شاہی خاندان سے خون کا رشتہ تھااور وہ اپنے وقت کاایک ناموراميرتھالیکن اسے بھی تنگدستی درپیش آئی اوروہ مسلسل فاقہ کشی سے عاجز آکر کہتاہے۔

کیوں کر کٹیں گے یا رب یہ بے شمار فاقہ
مجھ کو تو دوسرا ہے نفروں کو چار فاقہ

فغاں نے مختلف اشخاص کی ناگفتہ بہ حالت کی تصویرکشی اس انداز میں کی ہے۔

کوئی اگر سپاہی سردار سے کہے ہے
لے اپنا خبر شتابی مرتے ہیں یار فاقہ

کل سے نفر نے میرا گھوڑا نہیں ملا ہے
مقدور نہیں بشر کا کاٹے ہزار فاقہ

سن کر اسے یہ کہنا یکساں ہے حال سب کا
تیرا نفر ہے بھوکا میرے کہار فاقہ

مرزامظہرجان جاناں کی شناخت ایک شاعرکی حیثیت سےتو ہے ہی اس کے علاوہ ایہام گوئی کی تحریک کی مخالفت اوراس کے خلاف آواز بلند کرنے میں ان کا خاص کردارتھا۔ابتدامیں وہ خود ہی ایہام گوئی کی تحریک میں شامل تھےلیکن بعدمیں انہیں جب یہ محسوس ہواکہ ایہام گوئی کے باعث شعراء کی تخلیقی صلاحیتیں اسی نقطہ پرمرکوزہوکررہ گئی ہے توانہوں نے اس تحریک کے خلاف ردعمل ظاہرکیا۔مزاحمت واحتجاج ان کی شاعری کے ساتھ شخصیت میں بھی نظرآتاہے۔اس دورمیں مرزا مظہرکی ادبی شخصیت ایہام گوئی کے خلاف ایک علامت کی حیثیت رکھتی ہے اوراپنے عہد کے نئے شعری اورلسانی اسالیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ڈاکٹرتبسم کاشمیری ان کوردعمل کاپہلاشاعر مانتے ہیں۔

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

میرؔ اور سوداؔ کا دور آتے آتے اردو شاعری کا نصف صدی سے زیادہ کا سفر مکمل ہو جاتا ہے۔ ہر طرف سیاسی و معاشی زوال کے بادل چھائے تھے جو پورے ملک کو لپیٹ میں لے رہے تھے۔ یہ تاریخی دور تاریخ، سماجی و تہذیبی لحاظ سے بڑا مضطرب ہے اور محمد شاہ، احمد شاہ، عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی کے ادوار تک پھیلا ہے۔ نادر شاہی لوٹ اور قتل و غارت بھی اسی دور میں ہوئی۔ جاٹوں، مرہٹوں، سکھوں، روہیلوں اور احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں دہلی کی تباہی و بربادی کو بھی برداشت کیا۔ مغل بادشاہوں کی نااہلی اور بزدلی کے مظاہرے بھی دیکھے گئے۔ اس سارے سیاسی عمل نے برعظیم کے انتظامی ڈھانچے اور معاشی، معاشرتی اور اخلاقی نظام کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ اس بہت بڑے تاریخی آشوب سے اس دور کی شاعری متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور اپنے مزاج کے مطابق اثرات کو قبول کیا۔ کہیں یہ میرؔ اور دردؔ کی شاعری میں عشق حقیقی و عشق مجازی کی شکل میں ظاہر ہوا تو کہیں سوداؔ کے یہاں شہر آشوب کی شکل میں نمودار ہوا۔

سوداؔ کی یہ خوبی ہے کہ انہوں نے اپنے فنی شعور کے ذریعے اردو شاعری کے دامن کو کافی وسیع کیا اور یہ خوبی ان کے قصائد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ انہوں نے قصائد کے ساتھ ہجو گوئی میں بھی بڑا نام کمایا ہے اور دفتر کے دفتر لکھ دئے اور طنز و مزاح کے ایسے ایسے گوشے تلاش کئے جنہیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف سے بھی انہیں خلقی مناسبت بلکہ قدرتی خصوصیت تھی۔ عملی زندگی میں سوداؔ نے پہلے پہل سپاہ گری کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ شاید مزاج کی عدم مطابقت یا پیشہ کی ناقدری کی وجہ سے ترک کر دیا۔ جس کی تصدیق سوداؔ کے قصیدے کے ان اشعار سے بھی ہوتی ہے۔

کہی جاتی نہیں وہ مجھ سے جو اس ظالم نے
جس طرح کی مرے اوقات میں ڈالی ہلچل

لا بیٹھایا مجھے گھر بار چھڑا لشکر میں
بال بے چوب تلے اپنے بغیراز پر تل

سوؔدا کا شہر آشوب ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی زوال پر لکھا جانے والا پر درد نوحہ ہے۔ یہ شہر آشوب سودا کی سماجی بصیرت کی ایک یادگار ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے زوال کی پستیوں کے جو مشاہدے کئے تھے، وہ اس نظم میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے ہیں۔

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانوا ڈول
پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول

نگاہ وہ کہے کہ اس کے جواب میں دو بول
جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کہے یہ ٹھٹھول

بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

مولانا محمد حسین آزاد اپنی تصنیف آب حیات میں سوؔدا کی ہجویات کے متعلق فرمایا ہے:

''بے درد ظاہریں کہتے ہیں کہ بادشاہ اور دربار کی ہجو کی ہے غور سے دیکھو تو ملک کی دل سوزی نے اپنے وطن کا مرثیہ کہا ہے۔'' [۱]

سوؔدا نے چار شہر آشوب لکھے ہیں۔ ایک قصیدے کی شکل میں، دوسرا مخمس کی ہئیت میں، تیسرا مثنوی کے فارم میں اور چوتھا بھی قصیدے کی ہیئت میں ''تضحیک روزگار'' کے عنوان سے ہے۔ قصیدے کے ہئیت میں جو شہر آشوب ہے اس میں مغلیہ سلطنت کے زوال سے پیدا ہونے والی خرابیوں اور کمزوریوں کو پیش کیا گیا ہے اور عوامی زندگی کی پستی کو مدنظر رکھا ہے۔ اس قصیدے میں مختلف مشاغل اور پیشے کے لوگوں کی سماجی اور اخلاقی گراوٹ کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

اب سامنے میرے جو کوئی پیرو جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منھ میں زباں ہے

میں حضرت سوؔدا کو سنا بولتے یاروں
اللہ رے اللہ رے کیا نظم بیاں ہے

---

۱ (آب حیات۔ محمد حسین آزاد۔ ۲۰۰۳ء اتر پردیش اکادمی لکھنؤ۔ ص 142)

قاضی کو جو مسجد ہے گدھا باندھ کے اس میں
بیٹھا ہوا اس شکل سے ہر پیر و جواں ہے

ملا جو اذاں دیوے تو منھ موند کے اس کا
کہتے ہیں کہ خاموش، مسلمانی کہاں ہے

کوئی سر پہ خاک کوئی چاک گریباں
کوئی روئے ہے سر پیٹ ، کوئی نالہ کناں ہے

ہندو و مسلماں کا پھر اس پالکی اوپر
ارتھی کا تو وہم ہے جنازے کا گماں ہے

سوؔدا نے ہجو بھی کی ہے اور یہ زیادہ تر مثنوی کی شکل میں ہے۔مثنوی در ہجو پیل راجہ نر پت سنگھ، مثنوی درہجو شدی فولا دخاں کوتوال شاہ جہان آباد،مثنوی درہجو امیر دولت مند بخیل،مثنوی درہجو میر ضاحک،مثنوی درہجو حکیم غوث،مثنوی بطور ساقی نامہ درہجومیاں فوقی،مثنوی حکایت ڈومنی،مثنوی درہجو کوکی یعنی دختر دار یہ سودا کی ہجو گوئی کے نمونے ہیں۔ان کی ہجویات سے متعلق جناب خلیق انجم اظہار خیال کرتے ہیں:

''جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ سودا کے یہ شہرآشوب اس عہد کی سیاسی وسماجی زندگی کا آئینہ ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سوؔدا کے زور بیان اور قوت متخلیہ نے ان میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ آرائی کی ہے لیکن ہجو گوئی کی بنیاد اسی مبالغہ پر ہوتی ہے۔'' [1]

سوؔدا کے شہر آشوب کی ایک کڑی ''تضحیک روزگار'' بھی ہے جس میں ایک گھوڑے کا علامتی پیرایہ اختیار کیا گیا ہے لیکن اس کے در پردہ مغلیہ سلطنت اور اس کے نظام کی خرابی ،فوجی بدنظمی اور بادشاہ ،امیر ورئیس کی ناخوش اندیشی کو پیش کیا گیا ہے۔سوؔدا کے عہد کا یہ مذکورہ بالا ''گھوڑا'' سلطنت کے ہمہ گیر زوال کی علامت ہے۔اس ایک علامت کے حوالے سے مغلیہ سلطنت کے ضعف خستگی اور آشوب کی واردات ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

---

1 (مرزا محمد رفیع سوؔدا خلیق انجم ۲۰۰۳ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی ص354)

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دست عناں بیک کا قرار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی کے کفش پا کو گھٹائے ہیں وہ ادھار

نہ دانہ وانہ کاہ نہ تیمار نہ سئیں
رکھتا ہو جسے اسپ گلی طفل شیر خوار

نا طاقتی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

اس شہرآشوب کا جائزہ لیتے ہوئے عقیل احمد لکھتے ہیں:

''تضحیک روزگار'' سوؔدا کے مشہور قصائد میں سے ایک ہے۔ بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ قصیدہ گھوڑے کی ہجو ہے۔ یہ صحیح بھی ہے لیکن جیسا کہ قصیدہ کا عنوان بتلاتا ہے کہ سوؔدا نے اپنے زمانے کی مغلیہ سلطنت اور اس کے امراء کی روز بروز ابتر ہوتی ہوئی اقتصادی و انتظامی حالت کا مذاق اڑایا ہے۔ اس طرح یہ ہجو یہ قصیدہ ایک طرح کا ''شہرآشوب'' ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہاں افسوس کرنے کے بجائے پوری صورت حال کا طنزیہ اور مزاحیہ خاکہ اڑایا گیا ہے۔ غالبًا اس لئے کہ یہ صورت حال خود حکومت اور اس کے امراء کی پیدا کی ہوئی ہے۔'' [۱]

اس دور میں موجودہ حالات کا تقاضہ یہ تھا کہ دل اور دلی کے مرثیے لکھنے والے میر تقی میر بھی شہر آشوب اور ہجو کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چونکہ میرؔ عشق کے شاعر تھے خواہ وہ حقیقی ہوں یا مجازی لیکن انہوں

---

۱ (ادیب، ۱۹۸۲ء جلد ۶، شمارہ ۲، جامعہ اردو علی گڑھ، ص: 48)

نے شہر آشوب بھی تخلیق کئے ہیں۔لیکن ان کے شہر آشوب اس پایہ کے نہیں ہیں جتنا کے سوؔدا کے یہاں ہے۔دونوں کا دور تقریباً ایک ہی تھا اس لئے سماجی،سیاسی،معاشی ومعاشرتی حالات بھی وہی تھے۔ حالات کے مطابق طنز وظرافت کے نمونے بھی پیش کرتے ہیں۔میؔر کی ہجویات جو کہ احتجاجی شاعری کے زمرے میں آتی ہے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

ہجو خانہ خود(اول) ہجو خانہ خود(دوم) ہجو ہیچ مداں،اجگر نامہ،مذمت دار آئینہ دار،ہجو آکول، ہجو عاقل خانہ،مذمت دنیا وغیرہ۔ان کے علاوہ کچھ مخمس بھی ہیں۔ہجو بلاس رائے،ہجو لشکر اول، ہجو لشکر دوم،حسب حال خود،دستخطی فرد،ہجو خواجہ سرا۔

میر اپنے زوال پذیر معاشرے میں ایک انقلابی کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔وہ خود بھی عہد کی گراوٹ اور انحطاط کے نمائندے تھے۔ان کا حساس دل بیشک گرد وپیش کے انسانوں کی مصیبتوں پر خون کے آنسوں رویا۔انہوں نے اپنے زوال پذیر معاشرے پر طنز تو کیا ہے لیکن ان کا مذاق نہیں اڑایا۔انہوں نے اپنے زمانے کے معیار واقدار کے خلاف طنز کی بوچھار کی ہے اور ان کے طنز میں بعض اوقات ظرافت بھی پیدا ہوگئی ہے مگر ایسے موقع بہت کم ہیں اس میں سوؔدا ان سے بہت آگے ہیں۔کبھی کبھی میؔر خود بھی ہجو کا موضوع انتخاب کرتے ہیں اور اس طرح کی ہجو میں وہ اپنی ہجو سب سے اچھی کرتے ہیں۔کلام میر میں اس قسم کی ہجو سے بہتر مثالیں اپنے گھر کی ہجو ہیں۔چند مثالیں دیکھئے۔

کل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے سب
پاکھے رہنے لگے ہیں گیلے سب

واں جو ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا
ناں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا

کہیں صحنک رکھوں کہیں پیالا
کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے لالا

علم لعنت کے متعلق کہتے ہیں۔

علم لعنت میں عمر بھر اس کی کوئی ہے صرف
کرتا سوال اس سے جو جا کر میں ایک حرف

مثلاً کہا کہ ''نخل'' ہے کیا اس کو کر بیاں
وہ در خواب اس کے وہیں کھولتا زباں

بولا کہ اک جزیرہ ہے سمت فرنگ کو
مارا تھا ان فرنگیوں نے اس نہنگ کو

اسی طرح مختلف علوم و فنون کو لے کر میؔر نے اس ہجو میں رنگ ظرافت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ہجو اپنے انداز طرز اور مزاج میں ان کی دوسری ہجویات سے بالکل الگ ہے۔ اس ہجو میں میؔر کا طیش اور اشتعال نظر نہیں آتا اور وہ ایک ذی علم فن کی طرح طنز و ظرافت کا لطف پیدا کرتے چلتے ہیں۔

پیری ؎

جوانی گئی موسم شیب ہے
شہود ایک دو روز کا غیب ہے

نہ وہ ذائقہ ہے ، نہ وہ ہے شام
مزا کچھ نہیں ، ہو چکی صبح و شام

بلا ارتعاش تن راز ہے
کہ ہر عضو ملنے کو تیار ہے

ہجو یہ مثنوی، اجگر نامہ، میں اہانت کا پہلو زیادہ ہے اسی لئے اپنے زمانے میں بہتوں کی خفگی کا باعث بنی۔ اپنے عہد کے بیشتر شعرا کو کیڑے مکوڑے کہہ کر میؔر نے خود کو اژدہا ثابت کیا ہے اور جب وہ مشاعرے میں جاتے ہیں تو ان سب کو نگل جاتے ہیں۔

میؔر کے ایک شہر آشوب میں میؔر کے لشکر میں جانے اور وہاں سب کو محتاج اور بھوک کا شکار دیکھنے کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہے:

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش
آئے لشکر میں ہم برائے تلاش

آں کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش
ہے لب نان پہ سو جگہ پر خاش

نہ دم آب ہے نہ چمچہ آش

اس دور میں لشکر کی تنظیم اور سامان رسد کی فراہمی کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی۔اس لئے لشکر میں قحط پڑ جاتا اور ہر فرد خواہ پیشہ ور ہو یا بادشاہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو جاتے۔

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال
کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال

پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال

بادشاہ و وزیر سب قلاش

اپنے عہد کے ان حالات کو پیش کرنے میں میؔر کو کہاں تک مہارت حاصل تھی اس پر ڈاکٹر حامدی کاشمیری اظہار خیال کرتے ہیں:

''وہ اپنے عہد کا گہرا اور مکاشفانہ شعور رکھتے ہیں اپنے کمرے کی پائیں باغ کی کھڑکی کو بند رکھنے کے باوجود وہ اپنے عہد کے آشوب کا چشم نگراں سے مشاہدہ کرتے ہیں اور اپنے دنشورانہ ذہن اور گہری تاثر پذیری کا ثبوت دیتے ہیں تاہم وہ اپنے عہد کے حالات ہی کے اسیر ہو کر نہیں رہ جاتے، وہ معاشرت کی حد بندیوں سے ماورا ہو کر ایک کائناتی آگہی پیدا کرتے ہیں اس سے ان کی شاعری میں ان کے عہد میں سانس لیتے ہوئے انسان کے دکھ کا اظہار نہیں

ملتا، بلکہ انسانی تاریخ کے تناظر میں وسیع تر انسانی المیے کا ادراک
بھی ہوتا ہے اور یہ ادراک زمان ومکان کی پابندیوں کی نفی کرتا
ہے۔ یہ ایک ایسے انسان کا المیہ ہے جو پیدائش ،حیات، زوال،
مرگ، درد اور تقدیر کی اندھی حریت کے سامنے نقش فریادی بن
جاتا ہے۔'' [1]

ایک مخمس میں ایک ''شیخ جی'' کی ہجو کی ہے، جن کے پاس دستخطی فرد، اجرا کے لئے لے گئے ہیں اور انھوں نے جھوٹے وعدے کر کے میرؔ کو خوب دوڑایا ہے۔ ذیل کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔

عمدے جو ہیں دنوں کو بھرتے ہیں
سو بھی اسباب گروی دھرتے ہیں

ہیں سپاہی سو بھوکے مرتے ہیں
لو ہو پی پی کے زیست کرتے ہیں

ایک تلوار نیچے ہے اک ڈھال

چونکہ میرؔ غزل کے شاعر تھے اس لئے ان کی غزل میں لاتعداد مزاحمتی واحتجاجی شاعری کی بھی بھرمار ہے۔ کہیں وہ خدا سے شکوہ کر رہے ہیں تو کہیں محبوب سے۔

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا

واعظ نہیں ہے کاشف میخانے سے آگاہ
یک جرعہ بدل اپنا مندیل دھر آوے

مرے سلیقے سے مری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میر جب دلی آئے تو ان کے دل کی کیفیت کو کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

---

[1] (انتخاب غزلیات میر۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری۔ 2003۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی۔

’’ میں ایک دن ٹہلتا ہوا شہر کے تازہ ویرانوں سے گزرا۔ ہر قدم
پر روتا اور عبرت حاصل کرتا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھا، حیرت بڑھتی
گئی۔ مکانوں کو شناخت نہ کرسکا۔ آبادی کا پتہ تھا نہ عمارتوں کے
آثار۔ نہ ان کے مکینوں کی خبر۔‘‘ [۱]

1753ء میں جب صفدر جنگ کی حماقت سے مرہٹوں نے پھر دلی کو تاراج کیا اور عماد الملک نے احمد شاہ کو قید کر کے آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر اندھا کر دیا۔ میؔر کا یہ مشہور شعر اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھی

میؔر نے واسوخت بھی تخلیق کئے۔ ان کے واسوخت کا موضوع بھی وہی بے وفائی اور عاشق کا اپنے معشوق پر کئے ہوئے احسانات کو جتانا اور اس کے خلاف احتجاج کرنا، عشق سے نفرت کرنا، پرانی دوستی کے احسانات کو بھول کر معشوق کا غیروں سے مل جانا اور اپنے پہلے عاشق سے نظر نہ ملانا وغیرہ تھا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

طرز اے رشک چمن اب تری کچھ تازی ہے
ساتھ غیروں کے مرے حق میں سخن سازی ہے

کہا سنتے تو کاہے کو کسو سے دل لگاتے تم
نہ جاتے اس طرف تو ہاتھ سے اپنے نہ جاتے تم

میؔر نے اپنے محبوب سے یہ شکایت کی ہے کہ اس سے پہلے میرا محبوب اپنے حسن سے آگاہ نہیں تھا۔ میؔر نے ہی اسے اس کی زیبائش کا احساس دلایا۔ میؔر نے ہی یہ بتایا کہ اس سے پہلے کون تیری گلیوں کا طواف کرتا تھا اور کون تیرے دروازے پر کھڑا ہو کر تیرے نکلنے کا انتظار کرتا تھا۔

آگہی حسن سے اپنے تجھے زنہار نہ تھی
اپنی مستی سے تیری آنکھ خبر دار نہ تھی

---

۱ (میر تقی میر۔ نثار احمد فاروقی۔ 2004۔ قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو۔ ص 15)

چاؤں بے ڈول نہ پڑتا تھا یہ رفتار نہ تھی
ہر اس طور کمر میں ترے تلوار نہ تھی

خون یوں کا ہے کوکوچے میں ترے ہوتے تھے
دل زدے کب تری دیواروں تلے روتے تھے

میؔر نے دلی کے اجڑنے کا ذکر بھی بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ان کے اشعار سے دلی کے متعلق عشق کی جو کیفیت ہے وہ ظاہر ہوتی ہے۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

دل وہ نگر نہیں ہے جو آباد ہو سکے
پچھتاؤگے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں اے کاش مرجانا سراسیمہ نہ آتا یاں

دلی جو ایک شہر تھا رشک نعیم آہ
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

میؔر کے ہم عصر خواجہ میؔر درد تھے اس لئے ان کے زمانے کے حالات بھی وہی تھے جن سے متاثر ہوکر درد نے شعر گوئی کی لیکن درد کے یہاں میؔر اور سوداؔ کی طرح مزاحمت واحتجاج جو کہ معاشرے کے خلاف تھا وہ کم نظر آیا ہے بلکہ ان کے یہاں ایسے اشعار موجود ہیں جو عشق حقیقی اور وحدت الوجود کی ایک الگ شناخت قائم کرتے ہیں۔درد نے عشقیہ شاعری بھی کی ہے اوران میں بھی بلا کا طنز نظر آتا ہے۔اردو شاعری کی تاریخ میں وہ ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔جوانی کے زمانے میں وہ فوجی خدمات انجام دیتے رہے مگر یہ پیشہ انہوں نے اسی دور میں ترک کردیا۔جناب تبسم کاشمیری صاحب ان کے زندگی کے بعض اہم پہلو کواس طرح پیش کرتے ہیں:

''میر درد کی عمرعزیز کا یہ انتیسواں برس تھا کہ وہ اپنے فوجی گھوڑے سے نیچے اترے۔تلوار،ڈھال اور خنجر اٹھا کر ایک طرف رکھے۔اپنا سپاہیانہ لباس اتار کر پھینکا اور اس کی جگہ لباس درویشی زیب تن کر لیا اور اس کے ساتھ ہی ان کا عسکری کروفر بھی ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔اس کے بعد انہوں نے نہ کبھی تلوار اٹھائی اور نہ ہی میدان کا رخ کیا۔ان کی سپاہیانہ شناخت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی اور صوفیانہ شناخت ان کا امتیاز واکرام بن گئی۔'' [1]

خواجہ میر درد کا آستانہ اٹھارہویں صدی کی دلی میں تہذیبی ،روحانی اور ادبی لحاظ سے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ایک ایسے دور میں جب دلی کے شعراء گردش روزگار سے عاجز آ کر شہر ہجرت کر رہے تھے اور محفلیں اجڑ رہی تھیں،خواجہ میر درد کی خانقاہ صاحبان ذوق کے لئے ایک ادبی اور روحانی پناہ گاہ بنی ہوئی تھی۔اور انہوں نے اپنے صوفیانہ طرز عمل اور طرز فکر سے اس معاشرے کے وجود باطنی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

نظر جب دل پہ کی دیکھا تو مسجود خلائق ہے
کوئی کعبہ سمجھتا ہے کوئی سمجھے ہے بت خانہ

شعر میں میرے دیکھنا مجھ کو
ہے میرا آئینہ صفائے سخن

یا رب یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں
دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ آسکے

ہو وے کب وحدت میں کثرت سے خلل
جسم و جاں گو دو ہیں پر ہم ایک ہیں

زنہار ادھر کھولیو مت چشم حقارت
یہ فقر کی دولت ہے کچھ افلاس نہیں ہے

---

[1] (اردو ادب کی تاریخ ابتداء سے 1857ء تک، تبسم کاشمیری، 2009، ایم آر پبلی کیشنز، ص:352)

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

میر درد کا احتجاج اپنے آپ میں ایک منفرد طبیعت کا مالک ہے۔ان کا مقصد کسی کی مدح یا ہجونہیں تھا بلکہ اس سے صلہ حاصل کرنا بھی ان کا شیوہ نہیں تھا۔درد کے نزدیک شاعری ایک نہایت سنجیدہ سرگرمی ہے جس کا مقصد مدح یا مذمت نہیں بلکہ وہ اپنے واردات کواس طرح بیان کرتے ہیں جو شعر سننے والے کے دل میں گھر کر جائیں۔ان کے یہاں سطحی ہجو یا شہرآشوب کا ذکر اس طرح نہیں ملتا جیسا کہ ان کے ہم عصر سوؔدا اور میؔر کے یہاں ملتا ہے۔ بلکہ اس کے باطن میں ایک ایسی حقیقت کارفرما ہوتی ہے جو انسان کی شخصیت میں شامل ہوکر گہرائی میں اتر جاتی ہے اور متاثر کرنے والی ایک خاص شناخت چھوڑ جاتی ہے جو پل بھر میں فوت نہیں ہوتی بلکہ دیرپا نقش کے ساتھ آہستہ آہستہ لطف اندوزی کی کیفیت میں ضم ہوتی جاتی ہے۔

نا وجود یہ کہ پر وبال نہ تھے آدم کے
پہنچا واں تک کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا

وائے ناکامی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

درد کے بعد قائؔم کا ذکر آتا ہے۔قائم کی شاعری اس عہد میں پراوان چڑھی جب دورمغلیہ کے آخری زمانے میں سلطنت اندرونی سازشوں،عمال کی بدعنوانیوں، بیرونی حملہ آوروں، مرہٹواور جاٹوں کے ہاتھ تباہ وبرباد ہورہی تھی۔اس وقت قائم بھی شاہی توپ خانے میں ملازم تھے اور اس

دوران انہوں نے دہلی کے آشوب کو بہت قریب سے دیکھا ہوگا۔اوراس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ملازمت ترک کردی جس کی وجہ سے بہت دنوں تک بے روزگاری کی مشقتوں کا سامنہ کرنا پڑا۔قائم کا شہرآشوب مخمس کی ہئیت میں ہے اور یہ سکرتال کی لڑائی سے متعلق ہے جس میں شہر کی پریشانی اور ویرانی کا بیان کیا گیا ہے۔ابتدا بادشاہ وقت کی سخت ہجو سے کی گئی ہے کہ وہی ملک کی تباہی اور رعایا کی بدحالی کا ذمہ دار ہے۔

کیسا یہ شہ کہ ظلم پر اس کی نگاہ ہے
ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں دار خواہ ہے

لچّا اک آپ ساتھ لٹیری سپاہ ہے
ناموس خلق سایے میں اس کے تباہ ہے

شیطان کا یہ ظلّ الٰہ ہے

شاہ عالم ثانی جس وقت آلہ آباد میں تھا لوگ تخت خالی ہونے کی وجہ سے دلی کی ثقافتی زندگی میں ایک کمی سی محسوس کرتے تھے کیونکہ شاہ جہاں کے زمانے سے لال قلعہ کومرکزیت حاصل تھی۔اورانہیں یہ امید تھی کہ بادشاہ کے دلی آنے کے بعد سارا نظام سلطنت ٹھیک ہوجائے گا اور وہ عیش وعشرت کے دن پھرلوٹ آئیں گے۔قائم ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

رہتی تھی ایک خلق کے جی میں یہ آرزو
ہو وے گا بادشاہ بھی پھر ہند میں کبھو

نا زمزمہ وئی ہو سر نووئی غلو
سو آسماں نے لا کے مسلط کیا تو تو

جس کے ستم سے چارطرف آہ آہ ہے

ان کے قصیدے اور مثنویاں سودؔا اور میرؔ کے مقابلے میں نہ تھے۔قائم کے یہاں وہ بلند خیالی اوراسلوب نہ تھا جوخاص کوسودؔا کے یہاں تھا۔اپنے مخمس میں انہوں نے فوج کے انتظام اور

رسد کی کمی کی وجہ سے جو مذمت ہوئی اس کا ذکر کیا ہے۔

مردوں کے ہر طرف ہیں پڑے سینکڑوں اٹم
جس کے ہے کوئی راہ میں نکلے کسی کا دم

ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھے ایک سر شکم
مانند چوب پاؤں میں خشکی سے پیچ و خم

چہرہ کا ڈول فاقہ کے اوپر گواہ ہے

ایک بند میں شہر کی ویرانی اور حملہ آوروں کی لوٹ کھسوٹ اور ضروریات زندگی کے سارے سامان مہیا نہ ہونے کی وجہ سے جو پریشانیاں تھیں یہاں تک کہ حکیم لقمان جو مریض کا علاج کرتے تھے اس دوا کا بھی باقی نہ رہنا سب کچھ بڑے حیرت انگیز طریقے سے پیش کرتے ہیں۔

جو شہر میں تھے مصر سے ہر چیز میں خراج
ٹھیکے دوا کے گنج میں رہتے تھے جوں اناج

واں درد سے شکم کے کوئی مر نہ جائے آج
کس چیز سے حکیم کرے بیٹھ کر علاج

نہ زیرہ ہے نہ سونف ہے نہ نانخواہ ہے

روزی کمانے کا دروازہ بند ہے اور سرکاری ملازمت نایاب ہے۔

حاکم کو جو اس ضلع کا ہے راجہ کلاب رائے
روزی ہزارہا کی تھی واں بلکہ کچھ سوائے

سو اب جو نوکری کو کوئی اس کے پاس جائے
کہتا ہے رکھ تو لوں میں پہ چھٹا کہاں سے آئے

نے ملک ہے نہ مال نہ دولت نہ جاہ ہے

مفلسی نے سب اخلاق خراب کردئے ہیں یہ ایسا دور آیا ہے کہ روزی بھی کمانے کے لالے پڑے ہیں۔ یہ زبوں حالی اور بداخلاقی شہروں سے گزر کر قصبوں میں پہنچ گئی ہے۔ جب لوگ بھوک و افلاس سے پریشان ہوگئے تو بداخلاقی اور بدانتظامی کا ماحول بھی پیدا ہوگیا۔مختلف فرقوں، طبقوں اور پیشہ ور اپنے اپنے پیشے سے پریشان ہوکر ملک کی امن و چین میں دخل اندازی کرنے لگے۔ چونکہ شاعر ہرایک چھوٹی بڑی چیز سے متاثر ہوتا ہے تو وہ اس خاص موضوع کو اپنے کلام کا حصہ کیوں کر نہ بناتا۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں دلی میں تہذیبی، سیاسی اور معاشی زوال کا وقت شروع ہو چکا تھا1739ء میں نادرشاہ کا حملہ، لوٹ گھسوٹ، قتل و غارت پھر اس کے بعد 1757ء سے 1761ء کے درمیان احمدشاہ ابدالی اور روہیلوں نے دلی حکومت کی مدد کے نام پر اس سے بھی زیادہ وحشیانہ سلوک کیا۔ تاریخ کی اس بدترین تباہی اور ظلم میں جاٹوں اور مرہٹوں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ شرفاء اور امراء کا وہ طبقہ بالکل برباد ہوگیا تھا جو کبھی اہل فن کا قدر دان ہوا کرتا تھا۔ اس صورت حال میں دلی کے لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے ایسے دور میں انہوں نے اودھ کی زمین پر پناہ لی۔ اول اول فیض آباد اور بعد ازاں لکھنؤ اودھ کا ثقافتی وتہذیبی اور پھر ادبی مرکز بن گیا۔ دلی کے آشوب سے نکلنے کے بعد فیض آباد ایک سکون اور تسکین کی جگہ سمجھی جانے لگی۔ وہ شعراء جنہوں نے ابتدائی دور میں دلی سے اودھ میں ہجرت کی ان میں سرفہرست سراج الدین علی خاں آرزو ہیں۔ یہ شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد حسرت ، میر، انشا، رنگین، مصحفی ، میرحسن جرات جیسے شعراء ترک وطن کرنے پر مجبور ہوگئے۔

دلی کے شہر آشوب سے مصحفی بھی اچھوتے نہ رہے انہوں نے بھی ہجوگوئی اور شہر آشوب کی ایک چھوٹی فہرست تیار کی۔ ان کے شہر آشوب میں ایک قصیدے کی ہئیت میں ہے اور دوسرا غزل کی۔ قصیدہ شہر آشوب میں انہوں نے مہاوَجی سندھیاکے زمانۂ وزارت کے واقعات نظم کئے ہیں۔ اس میں شاہ عالم ثانی کی دست و پائی، سندھیا کے نظم ونسق کی خرابی اور دلی میں چوری، لوٹ مار، ڈاکہ زنی کا تذکرہ کیا ہے۔ بادشاہ کی بےبسی کو کچھ یوں بیان کیا گیا ہے۔

کہتی ہے اسے خلق جہاں سب شہ عالم
شاہی جو کچھ اس کی ہے سو عالم پہ عیاں ہے

اس وقت کیے گئے قتل وغارت پرکوئی پابندی نہ تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو بے حد پریشانی سے گزرنا پڑا۔ بے روزگاری سے پریشان لوگ اپنا وطن ترک کرنے پرمجبور ہوگئے اس سیاسی انتشار اورمعاشی بدحالی کے باعث اخلاص اورمحبت کی جگہ خودغرضی اورخوں ریزی نے لے لیا۔

انسان کی صورت نظرآتی نہیں مطلق
اور ہے تو جوں سوزن گم گشتہ نہاں ہے

گو گاؤ کشی شہر میں موقوف ہوئی ہے
اب اس کی جگہ خون رعیت کا رواں ہے

مصحفی اس وقت دلی میں پہنچا جب گلشن دلی میں خزاں کا عمل زورشور سے جاری تھا۔ چاروں طرف بربادی کا ماحول تھا۔ سلاطین کی فاقہ کشی اور پریشانی کا ذکراس انداز میں کیا ہے۔

گل جائے زباں میری کروں ہجو اگر ان کی
یہ تنگ معاشی کا سلاطیں کے بیاں ہے

اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک
ہے صاف تو یہ گلشن دہلی میں خزاں ہے

مصحفی اس وقت لکھنؤ پہنچے جب لکھنؤ کا عروج اپنے شباب پر تھا۔ ابتدائی دورمیں انہیں لکھنؤ میں شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ معاشی پریشانیوں کے باعث اکھڑے اکھڑے سے نظرآتے ہیں۔ ناقدردانی کا احساس شدت سے پریشان کرتا ہے اس کے مقابلے میں وہ دلی کے خرابے کو برابر یاد کرتے ہیں۔

کیا لکھنؤ کو چھوڑتے لگتا ہے مصحفی
جب ہم نے دلی شہر سا گلزار تج دیا

اے وائے شہر اپنا یوں چھڑایا تونے
ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تونے

میں اورکہاں یہ لکھنؤ کی خلقت
اے وائے یہ کیا کیا خدایا تونے

اس وقت دلی کے حالات بہت دردناک تھے اور اس کے سیاسی انتشار کا پورا فائدہ انگریز نہایت خاموشی اور چالاکی سے اٹھارہے تھے۔ شاہ عالم ثانی کا عہد آنے تک وہ سلطنت میں پوری طرح داخل ہو چکے تھے اور بادشاہ ان کا وظیفہ خوار بن کر رہ گیا تھا۔ مصحفی اس احساس کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

نواب الحسن نقوی ''مصحفی کی ہجوگوئی'' کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں اظہار خیال کرتے ہیں:

> '' مطبوعہ دیوان قصائد میں چھیاسی قصیدے شامل ہیں۔ہجویہ اشعار ان کے کلام میں کم ہیں مگر ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صنف کی طرف توجہ کرتے تو ہجوگوشعرا کی صف میں بھی نمایاں مقام حاصل کرتے۔شہرآشوب دہلی اور قصیدہ تیغ برّ اں میں انھوں نے معاصر شخصیات کونہیں بلکہ اپنے عہد کی انسانی کمزوریوں کو نشانہ بنایا ہے۔اعلیٰ درجہ کی ہجو میں یہ خصوصیت ضروری ہے۔ قصیدے کے عنوان تیغ براں سے گمان ہوتا ہے کہ اس زمانے کی معاشرتی خرابیوں کے خلاف انھوں نے تیغ بے نیام بلند کی ہوگی۔ مگر وہ صرف ان کا سرسری بیان کرکے رہ جاتے ہیں۔'' [1]

اس دور میں انشاء بھی ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن ان کی شاعری میں اس طرح کا مزاحمت واحتجاج نظر نہیں آتا جیسا کہ ان کے دور کے دوسرے شعراء میں نظر آتا ہے۔ان کے لکھنوی مزاج اور دلکش آرائیاں تھوڑے وقت کے لئے لطف اندوز کرتی ہیں۔ان کے

---

1 (غالب نامہ، شیخ غلام ہمدانی مصحفی نمبر، جنوری 2005 جلد نمبر 26 شمارہ نمبر 1، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی

دور میں ان کے ہم عصر مصحفی سے ان کا معرکہ رہا۔اوراس میں مصحفی بہت رنجور ہو گئے۔معرکہ کا پلڑا انشاء کے حق میں جھکا تھا۔لکھنؤ میں مصحفی سے معرکے کے باعث آصف الدولہ کے حکم سے انشاء کو لکھنؤ بدر ہونا پڑا جس کا انشاء کو بے حد رنج تھا۔اوراس کے بعد انشاء نے اپنے غضبناک غصے کا حال ایک نظم میں کیا ہے جس میں مصحفی کو بے دریغ گالیاں سنائی گئی ہیں۔ یہاں اس نظم کا ذکر بے جا ہے جو کہ ان کا نجی معاملہ تھا۔ یہ کوئی واجب ہجو نہیں اور نہ ہی شہر آشوب ہے۔ انشاء کے بہ نسبت جرات نے البتہ ہجو یہ شاعری کی ہے۔انہوں نے ایک مخمس کی ہئیت میں ظہوراللہ خاں نوا کی مذمت کی ہے۔لیکن اس کا موضوع محض ایک فرد نہیں بلکہ پورا سماج ہے اس لئے اسے شہر آشوب کہنا بہتر ہوگا۔جس کا مصرعہ ترجیع ''حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی'' لازمی قرار دیتا ہے کہ ہر بند کسی ایسی بات پر ختم کیا جائے جو اس مصرعے سے مناسبت رکھتی ہو۔رذیلوں کی شان وشوکت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ۔

اب ان کو دے شفق چرخ شال نارنجی
بنا جو کرتے تھے لیل و نہار شطرنجی

یہ دیکھ کیوں کر نہ الجھے بجانۂ تن جی
ظہور حشر نہ ہو کیوں جو کلچڑی گنجی

حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

یہ پابندی اس مخمس کا خاص عیب ہے، لیکن اس میں شہر آشوب کی شان پوری طرح موجود ہے۔ متعدد دوسرے شہر آشوبوں کی طرح اس میں بھی شاعر کو زمانے سے شکایت ہے کہ اس نے امیروں کو مفلس اور غریبوں کو تونگر کر دیا ہے،اور شریفوں کو زوال سے دوچار کر کے کمینوں کو عروج دے دیا ہے ۔

جو گل فروش تھے اب ہیں وہ مالک صد باغ
جو مفلس ازلی تھے رکھیں ہیں عیش و فراغ

جو خاک روب تھے ان کا عرش پر ہے دماغ
یہ کاؤں کاؤں خوش آوے کسے جو مادہ زاغ

حضور بلبل بستان کرے نوا سنجی

اس زمانے میں سعادت یار خاں رنگین نے بھی شہر آشوب لکھے جو کہ مثنوی کی شکل میں ہیں۔ کہتے ہیں کہ رنگین وہ شاعر تھا کہ جس نے اپنے دیوان میں ''شیطان'' کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا اور اس کا آغاز بسم اللہ سے نہیں بلکہ نعوذ باللہ سے کیا تھا۔ اسے بدنامی کا کوئی خوف نہیں تھا وہ اردو ادب کا ایسا گناہ گار شاعر تھا کہ جسے اپنے گناہوں کے اقرار میں کوئی عار محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس دور کی معاشی بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ایک دن مجھ کو سوچ یہ آیا
یعنی زمانے نے ہے ستایا

اس دنیامیں آئے ہیں جب سے
چین نہیں مطلق تب سے

دولت اپنے پاس نہیں ہے
کچھ آمدنی کی آس نہیں ہے

فکرمعیشت نے ہے مارا
کیجئے کس صورت سے گزارا

ہوا بہت صاحب میں مضطر
تب یہ کہا دل سے گھگھیا کر

کیوں رے دل کیا مرضی ہے تیری
فکر تجھے کچھ ہے بھی میری

مجھ کو تو یہ بات یقیں ہے
کوئی دنیا میں کسی کا نہیں ہے

چیز بڑی دنیا میں ہے دولت
بن اس کے ہوتی ہے ذلت

کام یہی دنیا میں ہے آتی
اس لئے سب کو ہے بھاتی

جس سے اس پر ہو کر شیدا
کر اس کو اے جان تو پیدا

کھیتی کر یا کر تو تجارت
نوکری کر یا باندھ کے ہمت

اس میں آگے چل کر رنگین نے بارہ پیشوں درپیش دشواریوں کا ذکر کیا ہے۔ سپاہی دہقانی کا بھی تذکرہ ہے۔ سپاہیوں کو اپنے نفس سے لڑنے کا مشورہ دیتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ایک ایسے شاعر کا نام آتا ہے جس نے اردو شاعری کی روایت اور اقدار کے بندھنوں کو توڑ کر ایک الگ شناخت قائم کی اور اردو شاعری کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ نظیر اکبرآبادی تھے جنھوں نے اردو شاعری کو امراء کے دیوان خانوں، اعلیٰ مجلسوں اور ادبی خواص کے حلقوں سے نکال کر لوک معاشرت پر لے آئے، جہاں عام انسان کے جذبات و احساسات اور اس کی عمومی زندگی کی نمائندگی کی گئی تھی۔ اس وقت دلی کا جو حال تھا اور کسی طرح لوگ ترک وطن کرنے پر مجبور ہو رہے تھے اس کا احساس نظیر کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔ انہوں نے اس وقت موجود اردو شاعری کے رخ کو ہی موڑ دیا تھا۔ ان کی شاعری نے ذہن کی توجہ خواص سے عام کی طرف کی۔ انہوں نے دنیا کے منظروں، موسموں، تہواروں، میلوں، بازاروں اور گلی کوچوں کی متنوع زندگی کو اردو شاعری کے کینوس پر اتارنے کا عزم کیا تھا۔ وہ ہر شئے، ہر موضوع، ہر خیال پر روانی کے ساتھ شاعری کر سکتا تھا۔ نظیر کے مخمس میں شہر آشوب نمایاں ہیں جس میں آگرے کے پیشہ وروں، سپاہیوں اور امیر زادوں کی پریشانی بیان کی گئی ہے۔

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے کاروبار بند
رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند

دریا سخن کی فکر کا ہے موج دار بند
ہو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند

جب آگرے کے خلق کا ہو روزگار بند

ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرح آگرہ میں بھی بے روزگاری چھائی ہوئی ہے۔نظیر نے ایسے چھتیس پیشے والوں کا ذکر کیا ہے جو بیکاری کے باعث ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

مارے ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار
اور جتنے پیشہ دار ہیں روتے ہیں زار زار

کوٹے ہے تن لوہار تو پیٹے ہے سر سنار
کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار

چھتیس پیشہ والوں کے ہیں کاروبار بند

نظیر کے پیشہ وروں کے جو سرکاری ملازم ہیں ان کا بھی احوال بیان کیا ہے۔فوجیوں کی بدحالی ان کی ذلت خواری اوران کے پاس ناکارہ ہتھیار کے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہے۔اس دور میں معاشی پریشانیوں کے باعث فوجی نوکری کی تلاش میں دردر بھٹک رہے تھے۔نظیر کے شہرآشوبوں کے متعلق سید مسعود حسن رضوی ادیب فرماتے ہیں:

''اب تک جس شہرآشوبوں کا ذکر کیا گیا ہے،ان میں سے ابتدائی مفہوم کے شہرآشوبوں کو چھوڑ کر باقی سب شہرآشوب نادرشاہ اور احمد شاہ درانی کے حملوں سے دہلی کی تباہی اوراہل دلی کی بدحالی کے اثر سے وجود میں آئے ہیں ان میں شہرآشوب کے ابتدائی مفہوم کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔یعنی ان میں مختلف طبقوں اور

پیشہ وروں کا حال بیان کیا گیا ہے۔'' [1]

نظیر کے دوسرے شہر آشوب میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی اختلال کا تفصیلی بیان ہے۔ وہ دور تبدیلی کا دور تھا ہر طرف انسانی اقدار بدل رہے تھے۔ اور یہ تبدیلیاں اتنی غیر متوقع، تکلیف دہ اور حیران کن تھیں کہ لوگ ان کے تجزیے اور تحلیل سے قاصر تھے۔

یہ جتنا خلق میں اب جا بجا تماشہ ہے
جو غور کی تو یہ سب ایک کا تماشہ ہے

نہ جانو کم اسے یارو بڑا تماشہ ہے
جدھر کو دیکھو ادھر ایک نیا تماشہ ہے

غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

نظیر اس دنیا کو ایک تماشہ گاہ سمجھتے ہیں جہاں ہر روز ایک نئ مصیبت کھڑی رہتی ہے۔ اس وقت حسب ونسب کو جو اہمیت دی جاتی تھی اور پشتینی امراء کو کس قدر حیثیت حاصل تھی اور اس کے اس ناز و فخر کو بھی بڑی سلیس انداز میں پیش کیا ہے۔ نااہلوں کے عروج اور باکمالوں کی خواری کو بھی خوب جانتے تھے۔ اس دور کی معاشی بدحالی، سیاسی زوال کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے کلام میں حسب معمول بیان کیا ہے۔ اور اس کے مثبت اور منفی اثرات سے بھی آ گاہ کیا ہے۔

چونکہ نظیر کے شہر آشوب کے علاوہ اور بھی بہت سی نظمیں کہی ہیں جن میں انہوں نے عام لوگوں کی عام چیزوں کا بڑے عام اندازِ بیان میں ذکر کیا ہے۔ انہوں نے زندگی میں کسی بھی شئے کو چھوٹا قرار نہیں دیا بلکہ ہر چیز کی اہمیت کو متعین کیا جس کے تحت یہ رائے قائم کی کہ ہر چیز اپنے قد کے اعتبار سے بڑی یا چھوٹی نہیں ہوتی بلکہ ضرورت کے اعتبار سے اس کا معیار طے ہوتا ہے۔ ان کی اس طرح کی نظمیں بھی مزاحمتی واحتجاجی شاعری کے ضمرے میں آئیں گی۔ ان کی نظموں کے عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے مثلاً، روٹی نامہ، آدمی نامہ، مفلسی، بنجارہ نامہ وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو عوامی زبان میں عوامی موضوع اختیار کر کے عوام کے لئے ہی لکھی گئی ہیں۔ نظم ''مفلسی'' میں مفلسی اس آخری

---

[1] (اردو شاعری کا فنی ارتقاء، فرمان فتحپوری، 2014، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ص 460)

منزل تک جا پہنچی ہے جہاں اب پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے لوگ کس حد تک جا رہے ہیں ۔

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر
دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر

ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر
جس طرح کتے لڑتے ہیں ایک استخوان پر

ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہیں روٹیاں

نظیر کی شاعری اور ان کے مزاج کو دیکھتے ہوئے پروفیسر عبدالستار دلوی یہ رائے قائم کرتے ہیں:

''نظیر اکبرآبادی صوفیانہ مزاج رکھتے تھے اور انسانی دکھ درد کا واقعاتی بیان کرنے پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ وہ عصری زندگی کو اپنی شاعری کا جزبنا لیتے تھے، مشاہدہ کی یہ باریکی ان کے معاصرین میں کسی حد تک سوداؔ کی شاعری کا حصہ ہے، لیکن جس انداز سے نظیر نے اپنی شاعری میں عصری زندگی، میلوں، ٹھیلوں، خوشیوں اور غموں کی نقش نگاری کی ہے، قومی یکجہتی کو ایک مقصد حیات کے طور پر پیکر شاعری میں پیش کیا ہے۔ مختلف مذاہب کے تئیں جس احترام کو اپنی شاعری میں ملحوظ رکھا ہے، وہ نظیر کی شاعری کے تقریباً نصف صدی گزر جانے کے بعد ہی تک ہمارے شعری منظر نامے پر ابھر نہیں سکا۔'' [1]

نظیر نے اپنی نظم ''آدمی نامہ'' میں متعدد آدمیوں کا ذکر کیا ہے۔ آدمی کی ہر شکل اور اقسام سے نظیر نے ہم کو روشناس کرایا ہے۔ انہوں نے اٹھارہویں صدی کے سیاسی واقتصادی زوال میں پیدا ہونے والے آدمی کے اعمال کی اچھی اور بری مثالیں پیش کی ہیں۔ یہ نظم محض ایک آدمی کو سمجھنے کی کوشش نہیں ہے بلکہ اس سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اس وقت ہمارا معاشرہ کہاں ہے اور ہم کس آدمی کی

ا (ایوان اردو، نومبر 2015، اردو اکادمی دہلی ص 6,7)

صف میں کھڑے ہیں۔آدمی کے اقسام نظیر نے اس طرح بیان کئے ہیں ؎

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور
یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور

کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور
شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور

اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس طرح نظیر کی نظم ''بنجارہ نامہ'' میں بنجارہ ،انسان کی مادی ثقافت کی علامت ہے۔ انیسویں صدی میں وحشت اور لالچ میں غرق آدمی کو یہ استعارے اس کے انجام کی خبر دینے کے لئے استعمال کیے گئے ہیں لیکن آج کے دور میں بھی اس کی وہی حالت ہے۔آج بھی اسے ہوش نہ آیا کہ صدیوں پہلے جو نظیر نے آدمی کو علامت بنا کر پیش کیا تھا جو اپنی زندگی کو پورے اطمینان اور سکون سے جی رہا تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے عقب میں کیا ہے۔اگر وہ آگے کی سوچتا تو بس موت ہی نظر آتی ہے۔''بنجارہ نامہ'' ان ہی استعاروں کی بار بار یاد دلاتا ہے اور آدمی کو باخبر کرتا ہے کہ اس دنیا کی ہوا اور حرص سے باہر آجائے کیونکہ اس کا آخری انجام موت ہی ہے۔ایک بند پیش نظر ہے ؎

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جاوے گی
ایک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے آوے گی

یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھی ، پوت، جنوئی، بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آوے گی

سب ٹھاٹھ دھرا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

زندگی سے کشمکش اور جھنجھلاہٹ کی کیفیت ناسخ کے کلام بھی نظر آتی ہے۔اس وقت کے شعراء کا یہ خاص انداز رہا ہے کہ انہوں نے اس ماحول میں رہتے ہوئے اپنے دور کی مایوسی اور ناامیدی

کوبھی پیش کیا جس سے وہ خوش نہیں تھے۔ وہ کبھی زندگی سے احتجاج کرتے اور کبھی اپنے محبوب سے اور کبھی زمانہ اور مزاج کو اپنی شاعری کا اہم موضوع منتخب کرتے ہیں۔کبھی سیاستدانوں کے خلاف لکھتے ہیں تو کبھی حکمرانوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ان کا احتجاج بھی ایک خاص رنگ میں ڈوبا ہوا ہے جس میں تلخی کے ساتھ ساتھ شیرینی کا بھی لطف ہے۔

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں
دل پر داغ کو کیونکر ہے عشق اس زلف پیچاں کا

کافی بس اس کو نشہ ہے بوئے شراب کا
ہو بوجھ جس کے ہاتھ میں ساغر حباب کا

ہر صبح وہ ہی صبح ہے ہر شام وہ ہی شام ہے
انسان پر ہے زور فقط انقلاب کا

آتش بھی اپنے دور کے خاص شعرامیں شمار کئے جاتے ہیں۔ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی سادہ بیانی ہے۔اس وقت لکھنؤ میں تصنع و مسجع آرائی کی محفلیں سجتی تھیں اور لوگ اسی کے مطابق زندگی بسر کررہے تھے۔شاعر ہونے کے ناتے آتش کے کلام اوران کی شخصیت پراس کا اثر ہونا چاہئے تھا مگر وہ بہت سادہ مزاج انسان تھے انہوں نے عام انسانوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا کیونکہ وہ خود بھی اس کا حصہ تھے، انہیں عام آدمی کے چال چلن کا دورس تھا۔آتش سماج اور معاشرے سے وابستہ تھے اوراپنے دور میں ہورہی تبدیلیوں کا خاص علم رکھتے تھے۔ان کے یہاں اخلاق اورانسانی اقدارا اپنے عروج پرتھا اور زمانے کی ریاکاری اور مکاری کے خلاف انہوں نے ہمیشہ احتجاج کیا۔انہیں اپنے زمانے کی مطلب پرستی سے ناآسودگی ہے جس کے باعث لوگ چند دن تو آشنا رہتے ہیں مگراس کے بعد ایسی تلخی پیدا ہوجاتی ہے کہ پھرایک دوسرے کی صورت سے

بھی نفرت کرنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں کسی کے محتاج نہیں رہے سوائے اللہ کے، کیونکہ وہ ہمیشہ قناعت پسند لوگوں کی صحبت میں تھے اور مفلسی اور گدائی کو زندگی کا حصہ تسلیم کرلیا تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

حباب آساں میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

تعلق روح سے مجھ کو حسد کا ناگوارا ہے
زمانے میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا

ہوئی منظور محتاجی نہ مجھ کو اپنے سائل کی
بنایا کاسۂ سرو اژگوں کاسہ گدائی کا

آتش نے مذہبی ظاہر پرستی اور ریاکاری کے خلاف بھی متعدد احتجاجی اشعار کہے ہیں زمانے میں پھیلے فریب ومکاری کو اپنا لینے سے مسلمان کا چلن خراب ہو گیا ہے۔اس میں انہوں نے مذہب پر بڑا گہرا طنز کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی کی تقلید کرنے سے وہ شخص اس کی مانند نہیں ہو پاتا جس طرح سے کبک دری نے ٹھوکریں کھائی اور حالات کا سامنہ کیا کہ جب جانور انسان کی چال چلتا ہے تو اپنی چال بھی بھول جاتا ہے۔

فریب حسن سے گبرو مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ تب سے برہمن بگڑا

تری تقلید سے کبک دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اس کا چلن بگڑا

جب کبھی ہندوستان کی تاریخ کا ذکر آتا ہے تو 1857ء کے انقلاب کا نام بے ساختہ آجاتا ہے۔ 1857ء کی خونی بغاوت میں یہ مدعا آج بھی زیر بحث ہے کہ یہ محض فوجی غدر ہے یا قومی بغاوت۔اس موضوع پر بہت سے محققوں اور مورخوں کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ اس سلسلے میں پی۔سی۔ جوشی لکھتے ہیں:

''یہ بحث پہلے خود برطانوی حکمران طبقے میں چھڑی۔ایسٹ اینڈیا کمپنی کے حامیوں نے ہندوستانی بغاوت کو محض فوجی غدرقرار دے کر اس کی وقعت کو گھٹایا تاکہ کمپنی کی حکومت کی کمزوریوں کو چھپایا جائے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے مخالفوں یعنی برطانیہ کے صنعتی، شہری متوسط طبقے کے نمائندوں نے مذکورہ بالانقطۂ نظر کی خامیوں کو فاش کیا اور دعویٰ کیا کہ یہ ایک قومی بغاوت تھی نتیجہ انہوں نے یہ اخذ کیا کہ کمپنی کی حکومت کو ختم کر دیا جائے اور برطانوی حکومت ہندوستان کو اپنے تحت کر لے۔'' [1]

اس خیال کی روشنی میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ یہ مدعا محققوں اورمورخوں سے قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے حامیوں اورمخالفوں کے درمیان زیر بحث رہا ہے۔ایک گروہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا حمایتی ہے وہ اس بغاوت کو محض اس لئے فوجی غدر قرار دیتا ہے تاکہ کمپنی کی حکومت کی کمزوریاں ظاہر نہ ہوں اوراس کی حکومت اسی طرح برقرار رہے۔اوردوسرا گروہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا مخالف ہے وہ اسے قومی بغاوت تسلیم کرتا ہے جس کے نتیجے میں وہ کمپنی کی حکومت کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔

یہ بغاوت صرف دو گروہوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق دو طبقوں سے بھی ہے۔ایک تو برطانوی حکمراں طبقہ جو کمپنی کی طرفداری کرر ہا تھا تو دوسرا برطانیہ کا صنعتی، شہری متوسط طبقہ اور اس کے نمائندہ لوگ جو کمپنی کی مخالفت کرر ہے تھے۔حالانکہ نقصان اس میں انہیں کا تھا کیونکہ برطانوی حکومت سے پہنچنے والا فائدہ یا مدد صرف چند دنوں کی مہمان تھی۔اس کے بعد انہیں بھاری نقصان کی بھرپائی کرنی تھی۔یہ دونوں طبقے اپنے اپنے مقاصد کو لے کر ایک دوسرے کی ضد پر تھے اور ایک دوسرے کے خلاف احتجاج کرتے نظر آتے تھے۔متوسط طبقے کے کچھ لوگ برطانوی حکمران طبقے کی حمایت میں تھے۔اس کے پیچھے یہ سبب تھا کہ اس کی معاشی حالت کمزور تھی اوراعلیٰ طبقے سے کچھ معاشی مدد فراہم ہو جاتی تھی۔اسی لالچ وجاہ کے سبب وہ اعلیٰ طبقے کی نمائندگی کرر ہے تھے۔اس کے برعکس متوسط طبقے کے لوگ اس سے خلاف تھے کیونکہ ان کی یکجہتی بری طرح منتشر ہورہی تھی۔اس

---

[1] (انقلاب 1857ء، پی سی جوشی، 1998، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ص 133)

طرح برطانوی حکومت نے اپنے اصول ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' (Divide and Rule) کو صحیح ثابت کردیا۔

یوں تو 1857ء کی بغاوت کے بہت سے اسباب ہیں مگر اصلی سبب برطانوی حکومت کے ہاتھوں اہل وطن کی اقتصادی راہزنی تھی۔ جب پرتگالی، ولندیزی اور فرانسیسی کمپنیاں ہندوستان کی تجارت سے کافی منافع کما رہی تھیں تو اس وقت برطانوی سوداگر بھی اسی مقصد کے تحت ایک تجارتی کمپنی قائم کرنے پر مستعد ہوئے۔ 1600ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام اسی مقصد کے تحت کیا گیا تھا۔ تاکہ وہ ہندوستان کے تجارتی معاملوں میں دخل اندازی کر کے ان پر پوری طرح سے قبضہ کرلیں۔ کمپنی نے ملکہ الزبیتھ اول سے ہندوستان اور مسالوں کے جزیروں کے ساتھ تجارت کرنے کے لئے ایک اجازت نامہ حاصل کیا۔ اس زمانے میں اہل ہندوستان کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں اور دوسری قیمتی اشیاء خریدنے اور بیچنے کو تجارت کہتے تھے۔ ہندوستان کے کاریگر چونکہ بازار میں اپنے مال کی قدر و قیمت سے انجان تھے اس لئے چالاک غیر ملکی ان کے مال کو سستے داموں پر خرید کر اسے اپنے ملکوں میں زیادہ داموں پر بیچتے تھے اور اس طرح منافع حاصل کرتے تھے۔ انقلاب کے اسباب سے متعلق شیخ حسام الدین وضاحت کرتے ہیں۔

> ''1857ء کا انقلاب جن اسباب کی بنا پر ہوا ان کی روداد بہت بڑی تفصیل پر مشتمل ہے۔ ہندوستانیوں کی غرض اس سے یہ تھی کہ ہندوستان کو انگریزی راج کی بدترین غلامی سے نجات دلا کر اپنی عظمت و وقار، آزادی و خودداری کو پھر سے حاصل کیا جائے مگر انگریز اس بات کو چھپاتے ہیں کیونکہ اس سے انہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نت نئے مظالم، توسیع سلطنت کے لئے ریاستوں کا الحاق، ڈلہوزی کی حکمت عملی، حکومت کی بدعہدی اور اسی طرح دوسری مکارانہ غداریوں کے راز کے انکشاف کا یقین ہے۔'' [1]

1765ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کی دیوانی حاصل کرلی جس سے ہندوستان کے

---

[1] انقلاب 1857ء تصویر کا دوسرا رخ۔ شیخ حسام الدین۔ 2006۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ ص 9

اقتصادی حالات بہت متاثر ہوئے۔انگلستان کےصنعتی انقلاب کے ذریعے ہندوستان کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت ہی تبدیل ہوگئی۔ ہندوستانوی صنعت ابھی اپنی ابتدائی صورت میں تھی اوراتنی مربوط نہ تھی جتنی کہ برطانوی صنعت۔ چنانچہ برطانوی مصنوعات نے ترقی کر کے ہندوستان کی صنعت پر فوقیت حاصل کر لی اورآہستہ آہستہ اسے برباد کردیا۔اس طرح ہندوستان کچے مال کی منڈی بن کر رہ گیا۔اس سے متاثر اجڑے ہوئے صنعت کاروں اور کاریگروں کی حالت بہت خراب ہوگئی اور ہندوستان برطانوی مال کی کھپت کے لئے سب سے بڑی مارکیٹ بن گیا۔اس بغاوت کی تہہ میں حب الوطنی کا کوئی جذبہ کارفرمانہ تھا بلکہ اس میں غرض مندی کا پہلونمایاں تھا۔

ہندوستانیوں کوکہیں نہ کہیں یہ گمان ہوگیا تھا کہ انگریز ہندوستان کو فتح کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے مذہبی معاملوں میں بھی مداخلت کرنے کی کوشش کررہے تھے۔لندن سے برطانوی مشنریوں کو یہ ہدایت ہندوستان بھیجا گیا تا کہ وہ یہاں کے کونے کونے میں مسیحی جھنڈا لہرائیں۔ملک میں عیسائیت کی اشاعت ان کا بڑا مقصد تھا۔وہ سارے ہندوستان کو دین عیسوی قبول کرنے پر مجبور کر رہے تھے ہندو اوراسلام مذہب کوردکرنے کی کوشش کررہے تھے۔ایک طرف انگریزوں نے اپنی اپنی کوششوں سے سماج کی اصلاح کی مثلاً ستی وجوہر کی رسم کاانسداد، بیوہ کی دوبارہ شادی وغیرہ۔ حالانکہ اس میں‌ان کوصرف اپنا پروپگینڈا دنیا کے سامنے لانا تھا۔اوراس اصلاح کی شروعات ہندوستانی مصلحین کر چکے تھے۔مشنریوں کےتبلیغ کا کام کافی متشدد اوروسیع پیمانے پر تھا بلکہ اسے سرکار کی محافظت بھی حاصل تھی۔اس درمیان ایک ایسا حادثہ بھی ہوگیا جس نے چنگاری کا کام کیا۔ پنڈت کنہیالال لکھتے ہیں:

> ’’جب سرکار نے انفیلڈ رائفل کے استعمال کا حکم دیا تو موزوں کارتوس کی تیاری کے لئے ٹھیکے دار مقرر کئے۔سنا ہے کہ انگلینڈ میں ایسے کارتوس گائے کی چربی کے بغیر تیار ہوتے ہیں، مگراس ملک ہندوستان میں ٹھیکہ دینے کے وقت کوئی متبادل چربیلی شئے استعمال کرنے کا نہ سوچا گیااور یہ امر ٹھیکے دار کی مرضی پر چھوڑ دیا

گیا تھا۔الغرض دمدم کے مقام پران کارتوس کی تیاری کا فیصلہ ہوا
اور وہاں سپاہیوں کو یہ رائفل چلانے کی تربیت دینے کے لئے
ایک تعلیم گاہ بھی بنائی گئی۔ابھی سپاہیوں نے رائفل لوڈ کرنے کی
مشق بھی شروع نہیں کی تھی کہ ایک اور کارخانے کے ایک خلاصی
کی ملاقات ایک برہمن سپاہی سے ہوئی جو تعلیم گاہ میں تربیت
حاصل کررہا تھا۔سپاہی کے ہاتھ میں ایک لوٹا تھا اور خلاصی نے
اس سے پینے کا پانی مانگا۔سپاہی نے انکار کیا کیونکہ خلاصی کی
ذات سے واقف نہ تھا۔ جواب میں خلاصی نے اس سے کہا:
''ذات کی کیا پوچھتے ہو، چندروز میں تمہاری ذات بھی نشٹ ہو
جائے گی، کیونکہ جو کارتوس تم کو ملیں گے انہیں رائفل لوڈ کرتے
وقت دانتوں سے کاٹو گے،اوران کارتوس میں گائے کی چربی لگی
ہوئی ہے۔''[1]

برطانوی حکومت میں مذہب میں بھی قانون کو مداخلت تھی۔انگریز قانونی طور پر مذہب میں دخل اندازی کررہے تھے اس کے پیچھے ان کا مقصد لوگوں کو عیسائی بنانا تھا۔وہ اس طرح کے قانون بناتے جو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے لئے مضر تھا۔ان پر زبردستی حکومت کرنے اور نئے نئے قانون کو ماننے کے لئے مجبور کیا جاتا تھا۔ذات پات کے نام پر وہ لوگوں میں تعصب پیدا کرنا چاہتے تھے۔اور بہت حدتک وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ چربی دار کارتوس کا استعمال کرکے انہوں نے ہندو اور مسلم کے درمیان حجت پیدا کردی۔اسی شک وشبہ میں آپسی تکرار کی نوبت آ گئی۔اس حادثے نے ایک دیاسلائی کا کام کیا جس سے نفرت کی آگ بھڑک اٹھی جو مدت سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔

ابتداء میں بھلے ہی یہ بغاوت محض فوجی غدر کی شکل میں ہمارے سامنے رونما ہوئی لیکن اس کا اصل مقصد قومی بغاوت ہی تھا جو فوجیوں کی ناآسودگی، سیاسی ریاکاری،قومی شورش، مذہبی تعصب

---

[1] (جنگ آزادی1857ء تاریخ بغاوت ہند (مسمی) محاربۂ عظیم۔ پنڈت کنہیالال (مرتب) 2008

اور ہندوستان پر برطانوی حکومت کے خلاف احتجاج کا امتزاج تھا۔ باغی رہنما برطانوی حکومت سے نفرت کرتے تھے کیونکہ انہوں نے بے جا اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی اور اس طرح اس بغاوت کا مقصد برطانوی سلطنت کی حکومت کا خاتمہ اور اس کی جگہ ہندوستانی حکومت قائم کرنا تھا۔

1857ء کی یہ بغاوت پورے طور پر ناکام رہی اور اس کے اثر انگیز نتیجے بھی سامنے آئے۔ انگریزوں نے ایک معاشی نظام کی بربادی کر دی۔ اٹھارہویں صدی کے بعد ہندوستان ایک صنعتی دیش بھی تھا اور خوشحال زراعتی ملک بھی۔ کرگھے پر بنے ہوئے ہندوستانی کپڑے اور دوسری ہندوستانی مصنوعات دنیا بھر میں مشہور تھیں اور ہندوستان کا مال ایشیا اور یورپ کی منڈیوں کو جاتا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان کی صنعت وحرفت کو تباہ کر دیا اور انہیں بالکل مختلف سمت میں ڈال دیا۔ ہمارے ملک کی دولت کو باقاعدگی کے ساتھ نکال کر اپنے ملک میں لے گئے اور ہماری معیشت کی پیداوار کے سرچشموں کو خشک کر دیا۔ یہ شورش محض ایک فوجی غدر ہی نہیں بلکہ ایک طرح سے قومی بغاوت تھی جس کو دنیا کی تمام جنگ آزادی میں برابر کا درجہ ملنا چاہئے۔ اس کو وہ مقام دلانے میں ان لوگوں کا ہاتھ ہے جنہوں نے آزادی کی لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نہ جانے کتنے مجاہدین آزادی اس غدر میں بڑی بے رحمی سے قتل کر دئے گئے۔ نہ جانے کتنوں نے حالات سے عاجز آ کر خودکشی کر لی کچھ اغوا بھی کر لئے گئے اور کچھ تو ایسے لاپتہ ہوئے کہ آج تک ان کی کوئی خبر نہیں۔ یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کرنے میں کوتاہی نہیں کی گئی۔ یہ ایک ایسا دردناک واقعہ ہے جس سے متعلق انسانوں کے خون کے قطروں سے تاریخ کے صفحات میلے ہوگئے ہیں۔ اس بغاوت کے نتائج سے متعلق محمد حسن اپنے ''مضمون 1857 کی ادبی اہمیت'' میں فرماتے ہیں:

> ''1857 کی جدوجہد اور اس کی ناکامی کی ایک اور دین بھی ہے
> اس نے پہلی بار گورے اور کالے کا تصور اس شکل میں پیدا کیا کہ
> اس سے قومی احساس بیدار ہوا اور ایک ملی یگانگت کا شعور پیدا ہوا۔
> لڑائی کے دوران میں صرف ایک تقسیم روا تھی اور یہ گورے اور
> کالے کی تقسیم تھی۔ مذہب، نسل، صوبہ اور فرقہ کی ساری تقسیمیں اٹھ

گئی تھیں اور قومیت کا دھندلا سا احساس پیدا ہو چلا تھا۔'' [1]

1857ء کی بغاوت کے ذریعے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس وقت ملک میں کیسے حالات رونما ہو رہے تھے اور اس وقت کے سماجی ، سیاسی حالات کا ان پر کیا اثر پڑ رہا تھا۔ اس وقت لوگ کھلے طور پر احتجاج کر رہے تھے۔ خواہ وہ احتجاج سماجی، سیاسی ، مذہبی، معاشی، تہذیبی و ثقافتی وغیرہ کی شکل میں ہی کیوں نہ رہا ہو۔ زندگی کے ہر پہلو میں لوگوں کو احتجاجی رویہ اپنانا پڑ رہا تھا۔ ہر کوئی اپنی ناآسودگی کے خلاف اظہار خیال کر رہا تھا۔ بس اس انقلاب میں ایک خامی یہ رہ گئی کہ اہل وطنوں نے یکجہتی کے جذبے کو ترک کر دیا تھا اگر وہ یکجا ہو کر ایک ساتھ اپنے حق کے لئے آواز بلند کرتے تو شاید انہیں کامیابی حاصل ہو جاتی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کے نصب العین بھی مختلف تھے۔ سب اپنے اپنے خاص مقصد کے تحت لڑ رہے تھے اور ان میں یکجہتی کے جذبے کا فقدان تھا۔ یہ بات اس کی ناکامی کی ایک خاص وجہ تھی۔ لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے جس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ یہ بغاوت بھلے ہی ناکام رہی ہو لیکن اس نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف براہ راست پہلی بار آواز اٹھائی اور 1947ء کی جنگ آزادی کے لئے مشعل ہدایت بنی۔ اس کے ذریعے آزادی کے مجاہدین کے لئے نئے راستے ہموار ہوئے اور ان کے دلوں میں قومی یکجہتی کا جذبہ جاگ اٹھا۔

1857ء کی ناکام بغاوت کے بعد لوگوں کی سوچ میں بہت تبدیلی آئی اور لوگوں نے اس دور کے حالات کو اپنے کلام کا حصہ بنایا۔ اس دور کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے دہلی کی تباہی و بربادی اور انگریزوں کی جارحیت کے بیان پر احتجاجی اشعار نہ کہے ہوں یا شہر آشوب نہ لکھے ہوں یا غزل میں ایسے اشعار نہ شامل کئے ہوں جس میں دہلی کی تباہی و بربادی کا ماتم نہ کیا گیا ہو۔ اکثر شعرا کے یہاں ایسی صورت میں مزاحمت و احتجاج ملتا ہے۔ اس دور میں غالب کی شاعری پڑھ کر بھی دلی کی تباہی و بربادی کا حال آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نہ صرف شاعری پڑھ رہے ہیں بلکہ اس وقت کے وہ ہولناک منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ غالب کی شاعری کو پڑھ کر اس وقت کی دلی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے بے اختیار آجاتا ہے۔ غالب کا ایک قطعہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں اس وقت کی دلی کا عکس نظر آتا ہے۔ گھر سے باہر جب جاتے ہیں تو

---

[1] (ذہن جدید، جلد 16، شمارہ 47، مارچ تا مئی 2007، ص: 30)

انسان نظر نہیں آتے بلکہ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے اور چوک جس کو ہم کہیں وہ مقتل ہے اور گھر ایک جیل سا بن گیا ہے اور دلی کا ذرہ ذرہ خاک ہو گیا ہے۔ وہ مسلمانوں کے خون کا پیاسا بن گیا ہے یہاں کا آدمی وہاں اور وہاں کا آدمی یہاں آ اور جا نہیں سکتا ۔

بسکہ فعال ما یرید ہے آج ہو سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دلی کا ذرہ ذرہ خاک تشنہ خون ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کیا کئے باہم ماجرہ دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

غالب کی شاعری کے متعلق ابوالکلام قاسمی رقم طراز ہیں:

''مرزا غالب کی شاعری، اردو کے پورے شعری سرمایے کے درمیان اس اعتبار سے خاصی ممتاز اور منفرد نظر آتی ہے کہ غالب کے یہاں موضاعات، مسائل اور واقعات اپنی موضوعاتی اور واقعاتی سطح سے اکثر بلندی اور تصوراتی ارتفاع حاصل کر لیتے ہیں۔ اس رویے میں موضوعات کی پیش کش کے بجائے پیش کش کے طریق کار کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اسی طریق کار میں غالب کے یہاں پائے جانے والے انشائیہ اور استفہامیہ لہجے کا جواز بھی موجود ہے اور اسی فنی کاریگری کے باعث وہ عمومی موضاعات کی سطحیت کے بھی شکار نہیں ہوتے اور واقعاتی اکہرے پن تک کو اسلوب کی تہہ داری میں تبدیل

کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔'' [1]

جہاں تک مزاحمت واحتجاج کی بات ہے تو ضروری نہیں کہ اس کے لئے مسائل زمانہ یعنی کسی انقلاب یا بغاوت سے دوچار ہونا پڑے۔ کہتے ہیں شاعری میں بڑی وسعت ہے اگر ہم زمانے کی بغاوت سے متاثر ہوتے ہیں تو پہلے خود داخلی احتجاج سے روبرو ہونا پڑتا ہے اور یہ داخلی کیفیت سب سے زیادہ تصوف کے انداز میں نظر آتی ہے۔ غالب کے تصوف نے روایتی تصوف سے انحراف کیا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ غالب نے شاعری کو دماغ دیا اور سوچنے پر مجبور کر دیا کہ عشق کے معنی کیا ہیں خواہ وہ عشق حقیقی ہو یا مجازی۔ غالب کے تصورِ عشق نے عشق کی قدیم روایت کو تبدیل کر کے اس کی جگہ نئی روشنی کو ترجیح دی جس سے متعلق وزیر آغا وضاحت کرتے ہیں:

> ''غزل میں صوفیانہ تصورات کی آمیزش اس دور کے آخری شاعر غالب کے ہاں بہت توانا ہے۔ لیکن غالب کے ہاں صوفیانہ مسلک مقصود بالذات نہیں بے شک ان کی غزل میں تصوف کے رموز و نکات عام طور سے بیان ہوتے ہیں لیکن یہ سب کچھ ایک بے قرار اور متجسس طبیعت کا ردِعمل ہے۔ غالب نروان حاصل کرنے لئے تصوف کی طرف مائل نہیں ہوا بلکہ کائنات کے عقدہ لانیحل کے پیش نظر اس کی طبیعت مچل سی گئی ہے۔ اور اس نے اسے حل کرنے کی دھن میں تصوف کے نظریات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ صوفی ہرگز نہیں تھے البتہ تصوف کو ایک حربے کے طور پر ضرور استعمال کرتا ہے۔ گویا تصوف کی طرف اس کا جھکاؤ زیادہ تر طالب علمانہ اور کاروباری ہے۔'' [2]

چند اشعار پیش نظر ہیں۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

---

[1] (غالب نمبر۔ فکر و نظر۔ مارچ 2000۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ ص 23)

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نا بادہ خوار ہوتا

مومن خان مومن اردو شاعری کی تاریخ میں عشقیہ شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں نازک مزاجی جا بجا نظر آتی ہے ان کے اس شعر کی نازک مزاجی کو دیکھتے ہوئے مرزا غالب نے کہا تھا کہ مومن میرا پورا دیوان لے لیں اور بدلے میں مجھے اپنا یہ شعر دے دیں۔شعر یہ ہے ۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

فی الحال یہاں بات عشقیہ شاعری کی نہیں بلکہ مزاحمتی اوراحتجاجی شاعری کی ہورہی ہے۔ مومن کی نازک مزاجی میں بھی احتجاج تھا جوایک خاص انداز میں بیان کرتے ہیں ۔

شب جو مسجد میں جا پھنسیں مومن
رات کاٹی خدا خدا کر کے

پیہم سجود پائے صنم پر دم و دا
مومن خداکو بھول گئے اضطراب میں

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

چل دیا سوئے حرم کوئے بتاں سے مومن
جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

مون کی ایک مثنوی ''جہاد'' جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مومن سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل کی تحریک کے خلاف تھے اور کبھی ان کی تقلید نہیں کی لیکن سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل کی شان میں شعر کہنے والا مومن دلی کے کوچہ ہائے عشرت میں اہل نشاط کے ساتھ مصروف رہا۔ جن دنوں سید احمد کے قافلۂ جہاد کی تیاریاں ہو رہی تھیں مومن عشق و عاشقی میں سرگرم ہو رہے تھے اور یوں جہاد پر مثنوی لکھنے والا شخص عشق پیشہ بنا رہا۔

مومن تمہیں کچھ بھی ہے جو پاس ایماں
ہے معرکہ جہاد چہل دیجئے وہاں

جیسا کہ دوسرے شعراء کے یہاں عشق حقیقی اور عشق مجازی کے اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں اسی طرح ذوق بھی کلاسکی شاعری کی اس تہذیب سے وابستہ تھے۔ ذوق کی شاعری مجلس میں شوق سے سنی وسنائی جاتی رہی۔ لوگ ان کے اشعار موقع و محل کی مناسبت سے یاد کرتے تھے لیکن نئی نسلوں کو میر اور غالب کے اشعار اپنی معنویت کی وجہ سے یاد ہیں مگر ذوق کے مجلس اشعار ان نسلوں کے حافظے سے محو ہوتے جا رہے ہیں۔ بہر کیف چند اشعار پیش نظر ہیں جن میں مزاحمت و احتجاج کی جھلک نظر آتی ہے۔

ہر اک سے ہے قول آشنائی کا جھوٹا
وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا

نشہ دولت کا بد اطوار کو جس آن چڑھا
سر پہ شیطان کے اک اور بھی شیطان چڑھا

ذوق بیمار محبت ہے خدا خیر کرے
کہ یہ آزاد ہوا جس کو وہ جانبر نہ ہوا

انیسویں صدی کے وسط میں انگریزی اقتدار پوری طرح ہندوستان میں مستحکم ہوگیا۔ غدر 1857ء کے بعد ملک کی صبح و شام بدل گئی۔ دہلی کی صورت تبدیل ہوگئی۔ بہادر شاہ ظفر یہ کہتے ہوئے مقید ہو کر رنگون لے جائے گئے ۔

اے وائے انقلاب زمانے کے جود سے
دلی ظفر کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی

ظفرکو اپنے خاندان کا سیاسی اقتدار ختم ہوجانے کا بہت افسوس تھا۔وہ اپنے باپ دادا کی طرح انگریزوں کا وظیفہ خوار تھااوراس صورت حال پر وہ اپنے غم کا اظہار کرتا ہے ۔

کیا پوچھتے ہو کجروی چرخ چنبری
ہے اس ستم شعارکا شیوہ ستم گری

کرتاہے خوار تر انہیں جن کو ہے برتری
اس کے مزاج میں ہے یہ کیا سفلہ پروری

کھائے ہے گوشت زاغ فقط استخواں ہما
کیا منصفی ہے زاغ کہاں اور کہاں ہما

اس نظم کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے مطالعے سے دلی پر انگریزی قبضے کے دوران یہاں کے باشندوں کی بے بسی اور بے چارگی کا علم ہوتا ہے۔ظفر نے اس بات کو زمانے کی مروجہ قدریں الٹ جانے سے تشبیہ دی ہے۔اپنی زندگی کے آخری وقت میں ظفر قلعہ معلیٰ میں ایک بے بسی کی زندگی بسر کررہے تھے۔انگریزوں نے جس طرح انہیں قید کرکے رکھا تھا اس سے ان کے زوال کا خطرہ بھی ظفر کو محسوس ہورہا تھا۔یہی وجہ تھی کہ ان کی شاعری میں قفس بلبل،زنجیر،صیاد وغیرہ علامت کے طور پر نظر آتے ہیں۔

میں وہ مجنوں ہو کہ زنداں میں نگہ بانوں کو
میری زنجیر کی آواز نے سونے نہ دیا

جہاں میں اور تو ڈرتے ہیں غیر سے لیکن
ظفر رہے ہے مجھے اپنے آشنا کا خوف

ان کے حالات کے متعلق اسلم پرویز لکھتے ہیں:

”مخصوص سیاسی حالات میں گھرے ہوئے آخری مغل تاج دار

ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی المخلص بہ ظفر کا ذہنی کرب جب
ان کے شعروں میں جھلکتا ہے تو اردو شاعری کی بعض وہ علامتیں جو
صدیوں سے پامال ہو رہی تھی، اچانک جاگ اٹھتی ہیں۔ چنانچہ یہ
علامتیں تشبیہوں، اشعاروں اور کنایوں کی شکل میں ایک نئی تازگی
اور توانائی کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہیں۔'' ۱

---

۱ (بہادر شاہ ظفر، اسلم پرویز، 1986ء، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ص:352)

جدید اردو شاعری میں مزاحمت واحتجاج کی ابتدائی صورتیں

ہندوستان میں انگریزوں کے قابض ہونے کے بعد اہل وطن کا ان کے خلاف ردعمل شروع ہوگیا تھا اور ہر محاذ پر ہر شئے جو انگریزوں سے وابستہ تھی یا ان کی ایجاد کردہ تھی اسے نفرت کی نظر سے دیکھا گیا اور اس کی مخالفت کی گئی۔ انگریزوں نے ملک میں جو بھی تبدیلیاں کیں یا کرنے کے خواہاں تھے اس کو حقارت کی نظر سے دیکھا گیا اور خوب مخالفت کی گئی۔ اب وہ تبدیلی خواہ سیاسی، سماجی، مذہبی، معاشی، تہذیبی اور ثقافتی ہی کیوں نہ ہو ہندوستانی اسے ماننے کو تیار نہ تھے۔ اس دور کے ہر ہندوستانی کی یہ خواہش تھی کہ وہ انگریزوں کی اس حکومت سے ملک کو آزاد کرائیں۔ 1857ء کی علم بغاوت ایک ابتدائی اور مضبوط کوشش تھی لیکن بہت جلد یہ کوشش ناکام ہوگئی۔ انگریزوں نے پوری شدت سے اس بغاوت کو ناکام کیا اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ ملک پر چھا گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اس بغاوت کا بدلہ ہندوستانیوں پر بے انتہا ظلم وستم ڈھا کر لیا اور ایسی سختی برتی کہ اہل ملک کے احتجاج کی کمر ہی ٹوٹ گئی انہوں نے ملک میں ایسے حالات پیدا کردئے کہ اہل ملک اپنے ہی وطن میں اسیر ہوکر رہ گئے اور پھر بغاوت کرنے کی ہمت نہ کرسکے۔ اس سلسلے میں تاراچند جی لکھتے ہیں:

> ’’ہندوستان کے لوگوں پر ایک صدی تک کی جانے والی اس قسم کی حکومت کا نتیجہ تباہ کن ہونا ضروری تھا جس کی لپیٹ میں پورا ملک آگیا۔‘‘ [1]

انگریزوں کی آمد کے بعد سے ہی ہندوستانیوں کی زندگی مغربی ممالک کی سائنسی ایجادوں سے آشنا ہوچکی تھی۔ مغرب کے صنعتی انقلاب سے ہندوستان بے حد متاثر ہوا اور یہاں بھی صنعتی کارخانے قائم کئے گئے۔ جس کے باعث گھریلو دستکاروں کے لئے میدان اور بھی تنگ ہوگیا۔ جو ہندوستان کے قدیم عہد کی شناخت کے طور پر تھی وہ تباہ وبرباد ہوکر رہ گئی جس کی خاص وجہ انگریزوں کی عوام مخالف پالیسیاں تھیں۔ انگریزوں نے یہ پالیسیاں اپنی سہولت کے لئے بنائی تھی

---

۱ (تاریخ تحریک آزادی ہند، جلد دوم، تاراچند، مترجم غلام ربانی تاباں، 2001، قومی کونسل

اوراس کو برتنے کے لئے بڑی سختی سے کام لیا۔وہ ہندوستانیوں کے خون کی ایک ایک بوند نچوڑ لینا چاہتے تھے۔انگریزوں نے بہت سے اشیاء ایجاد کیں،آمدورفت کے جدید طریقے رائج ہوئے۔ بڑی بڑی شاہراہیں بنائی۔ریل،موٹراورہوائی جہازوں سے سفراورتجارت کے طریقوں میں انقلاب پیداہوا۔ساتھ ہی ہندوستان کی دوری کی دیوارگرگئی۔جہازی تجارت کوبھی ترجیح دی گئی جس سے تجارت کوزیادہ توسیع اورفروغ ملا۔پھرہندوستان سے مغرب کی دوری کم کرنے کے لئے 1869ء میں سویزنہرکھول دی گئی توہندوستان اورانگلستان کا بحری راستہ اوربھی مختصرہوگیا۔ان حیرت انگیز سائنسی ایجادات کے باعث ہندوستانیوں کی زندگی میں بڑی تبدیلی آنے لگی ۔یہ تبدیلی کچھ حدتک ٹھیک بھی تھی جواہل وطن کی تہذیب کوبھی متاثر کررہی تھی ۔اس بات کی وضاحت سید عابد حسین کچھ یوں کرتے ہیں:

> ''انگریزاپنی تہذیب کوہندوستان پرمسلط کرنانہیں چاہتے تھے۔اس کے برعکس وہ خود ایک حدتک ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کواختیارکرنے کی کوشش کرتے تھے۔وارن ہیسٹینگز کی تہذیبی اور تعلیمی پالیسی نے لوگوں کے دلوں میں یہ امید پیداکردی تھی کہ انگریزہندوستانی تہذیب کومٹانانہیں چاہتے بلکہ اس میں عملی وعلمی روح پھونک کراسے نئی زندگی بخشناچاہتے ہیں لیکن بیسویں صدی کے چوتھے عشرے سے انگریزحکومت کی پالیسی میں زبردست تبدیلی ہوئی۔انگریزی زبان پہلے ذریعۂ تعلیم اور پھرسرکاری زبان بنادی گئی۔مشرقی تعلیم پائے ہوئے لوگوں پر روزی اورعزت کے دروازے بند ہونے لگے۔''[1]

جب ہندوستان میں برطانوی حکومت قائم ہوئی تووہ اپنے ساتھ اپنی تہذیب کوبھی لائی۔ ان کی ایجادکردہ تمام اشیاءحسب ضرورت تھیں جس کو کام میں لانے کے لئے انگریزی پڑھے لکھے لوگ درکار تھے۔اسی غرض سے انہوں نے ہندوستان میں ایک انگریزی پڑھالکھاطبقہ قائم کیا جو

---

[1] (قومی تہذیب کا مسئلہ، سید عابد حسین، 1998، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ص:125)

وقت پر ان کی مدد کرتا۔انگریزوں کا مقصد کلرک اور دفتر کا بابو تیار کرنا تھا جوان کو ہندوستانی کاموں میں مدد دے سکے لیکن انہیں پڑھے لکھے طبقے سے کچھ حساس، دانشور، انسان دوست اور ملک وقوم پرست لوگ بھی سامنے آئے۔ جب انھوں نے ہندوستانی ادب کا مغربی ادب سے تقابلی مطالعہ کیا تو یہ نتیجہ نکلا کہ ابھی ہندوستانی ادب ان سے بہت پیچھے ہے لہٰذا اہل وطن نے انگریزی نظام اور تعلیم کوفروغ دیا جس کے باعث ان کے فکرونظر میں خاصی تبدیلیاں آئیں۔اب ہندوستان محض ایک خطے یا علاقے تک محدود نہ رہا بلکہ ایک ملک بن گیا اور دنیا کے تمام حالات وواقعات پر اس کی نظر جانے لگی۔انگریزی ادب کے ذریعہ ہی خودانہوں نے مغربی ممالک میں جمہوریت اوراس کی ضرورت کے اسباب، انسانی مساوات اور جذبہ حریت کی تعلیم حاصل کی۔جس کے زیراثر ہندوستان میں بھی اسی نظام کو قائم کرنے کی بات ہونے لگی اوراہل وطن کو برطانوی حکومت کی غلامی سے آزاد کرانے کی کوشش کی جانے لگی۔انیسویں صدی کے شمالی ممالک میں بھی علم و بیداری کی لہراٹھنے لگی تھی۔روس اورایشیاکے بہت سے ملک جیسے چین وغیرہ میں عوامی تحریک پھیلنے لگی اور ایشیا کاعظیم ملک جاپان مغربی ممالک کے مدمقابل آ کھڑا ہوا۔ ہرطرف جمہوریت کی لہرزور پکڑنے لگی اوران سب کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا۔

اس دوران اہل وطن کے ذہنوں میں قومی، وطنی اورمشترکہ سیاسی بے داری اور دنیا کے تمام ممالک میں روزمرہ کی ہونے والی وارداتیں اورایجاداتیں اس زمانے میں اخباراور دیگر وسائل کے ذریعے لوگوں تک پہنچنے لگیں۔جدید آمدورفت کے وسائل نے دوریوں کوکم کردیا اوراس طرح انیسویں صدی کے نصف آخر میں زندگی، مذہبی اخلاق اورسیاست کے پرانے روابط کی شکست و ریخت نے پورے ملک کوالجھن میں ڈال دیا۔1885ء میں ہندستانیوں کی سیاسی بیداری میں ایک سیاسی انجمن ''انڈین نیشنل کانگریس'' شکل پذیر ہوئی۔جس کے قیام میں منفرد انگریزوں کی بلاواسطہ اورانگریزی حکومت کی بالواسطہ تائید شامل تھی۔

1857ء کی ناکام بغاوت کے بعد انگریزوں کے عتاب وبدلے کا نشانہ مسلمان بنے۔ان کے برعکس ہندوؤں نے انگریزوں کی حمایت کی اورانگریزی تعلیم حاصل کرنا شروع کردیا۔جس سے

انگریزی حکومت کا رحم وکرم ان پر بنا رہا۔اس طرح وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز کیے گئے اور مسلمانوں کو سرکاری ملازمت سے نکال دیا گیا۔1857ء کی بغاوت میں جن باغیوں نے حصہ لیا انہوں نے اپنے مزاحمتی اوراحتجاجی روّیے سے برطانوی حکومت کو یہ احساس دلایا تھا کہ مسلمان بھی بغاوت کے حامی ہیں چنانچہ فرنگیوں نے پوری کوشش کی کہ ان مسلم مجاہدوں کو اس طرح کچل دیا جائے کہ ان کا وجود مٹی ہو جائے اور آئندہ یہ بغاوت میں شامل تو دور کی بات اس کا خواب بھی نہ دیکھ سکیں۔ ان وجوہات کے باعث مسلمان بھی انگریزوں کے ظلم وستم کا شکار تو ہوئے ہی ساتھ ساتھ غلط تعلیم و تربیت گمراہ کن تہذیبی تصورات اور کم علمی کی وجہ سے نئے دور اور جدید تعلیم سے استفادہ نہ کر سکے۔ اس دور میں مسلم قوم کے سرپرست کٹر ملاّ اور مولوی تھے۔ جونئی تہذیب وتمدن اور تعلیم کے خلاف تھے۔ یہ تعلیم ان کے لئے باعث کفر تھی جس کے زیر اثر مسلمان قدیم تہذیبی اور ثقافتی چہروں کو تبدیل کرنے کے لئے قطعی تیار نہ تھے اور اپنی محدود سی دنیا میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ادھر انگریزی قوم پورے ملک پر اپنی مضبوط پکڑ بنائے جا رہی تھی۔ وہ سیاسی،سماجی،معاشی،تہذیبی وثقافتی زندگی میں دخل اندازی کر رہی تھی اور عملی زندگی میں روز بروز تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ ملک ایک عجیب انقلاب کے دور سے گزر رہا تھا۔ چاروں طرف تباہی و بربادی کا منظر تھا۔ایسے میں مسلمانوں کو ایسے ناخدا کی ضرورت تھی جو ان کی ڈوبتی کشتی کو اس باروباراں کے طوفان سے نکال سکے ۔اس وقت سرسید احمد خاں اپنی ہمہ گیر شخصیت کے ساتھ منظر عام پر ابھرے ۔علی گڑھ تحریک ان کی کوشش وکاوش کا نتیجہ تھی جس کے ذریعے مذہب، تعلیم وتربیت ،معاشرت اور ادب ایک نئے انقلاب سے روشناس ہوا۔

سرسید نے ہنگامہ غدر کے بعد اپنے ملک وقوم کے خاطر جو سماجی، سیاسی، مذہبی، علمی وادبی خدمات انجام دی ہیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔علاوہ ازیں انہوں نے ہندوستان کے لئے اور خاص طور پر مسلمانوں کے لئے اصلاح کی جوجدوجہد کی شروعات کی وہ ناقابل فراموش تھی۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھ کر مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ کی بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی۔ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں جس سے اہل وطن اس کا مطالعہ باآسانی کر سکیں۔ ملک کے حالات دیکھتے ہوئے انہوں نے سیاست میں بھی حصہ

لیا۔1866ء میں علی گڑھ میں ایک انجمن 'برٹش انڈین ایسوسی ایشن' کے نام سے قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کریں اور اس ایسوسی ایشن کے ذریعے اپنے تمام مقاصد کو پارلیمنٹ تک پہنچاسکیں۔انھوں نے ایک صحافی کی حیثیت سے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔1866ء میں ہی سائنٹفک سوسائٹی سے ایک اخبار' علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' جاری کیا جواب مسلم یونیورسٹی گزٹ کے نام سے مشہور ہے اورایک رسالہ 'تہذیب الاخلاق، 1870ء میں جاری کیا جس کا مقصد قوم و مذہب کی خدمات تھا۔اس کے ذریعے سے اردو صحافت میں' انشاپردازی میں، اخلاق ومعاشرت میں، عام معلومات میں اس قدر ترقی اوراتنا انقلاب پیدا ہوا کہ اس زمانے کے دیگراخبارات ورسائل سے نہ ہوسکا۔سرسید نے جدید تعلیم کے لیے علی گڑھ میں ہی محمڈن اینگلواورینٹل کالج قائم کیا جوآج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے اپنی علمی وادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔

علمی وادبی سطح پر سرسید نے جو خاص کام کیا وہ ان کی سادہ اور سلیس نثر ہے۔انھوں نے ہر موضوع وموقع کی مناسبت سے زبان وبیان اختیار کیا ہے۔الفاظ کی متانت، لطافت، شوخی ورنگینی کوموقع ومحل کے اعتبار سے اختیار کیا ہے۔بعد میں ان کے رفقاء نے ان کی اس روش پر چل کر بڑے بڑے کام انجام دئے ہیں لیکن اس نثر نگاری جسے جدید نثر نگاری کہا جاتا ہے اس کے تنہا بانی سرسید ہی تھے جن کی کوشش وکاوش سے ہی جدید نثر وجود میں آئی جس کے ذریعے اہل وطن کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی۔اس سے پہلے ادب محض تفریح کا ذریعہ بن کر رہ گیا تھا اور لاتعداد نقائص سے پر تھا۔اس سلسلے میں پروفیسر نورالحسن نقوی فرماتے ہیں:

> '' شعروادب کے بارے میں اپنے نظریات کوربط وتسلسل کے ساتھ
> کسی ایک جگہ پیش کرنے کا سرسید کوموقع نہ مل سکا اس لئے باضابطہ
> تنقید نگاروں میں ان کا شمار نہیں لیکن وہ ہمارے پہلے بزرگ ادیب
> ہیں جنھوں نے شعراورنثر کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا، اس کی
> خامیوں اورخرابیوں کی طرف اشارہ کیا، ان کے دورکرنے کی تدبیریں

بتائیں اور اہل قلم کو ان پر عمل کرنے کی ترغیب دلائی۔'' [1]

سرسید کی تحریک کے تحت اردو زبان میں اور بھی وسعت پیدا ہوئی جہاں تک نثر کی بات ہے تو جدید نثر کے لئے انھوں نے اپنی تصانیف نمونے کے طور پر پیش کیں جو آئندہ نسلوں کے لئے مشعل ہدایت تھیں لیکن شاعری کا میدان اب بھی محدود تھا اور خاص طور پر غزل کی حالت زیادہ خراب تھی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کی فضا میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں تھیں۔ مغربی تہذیب اور ادب نے ذہن کو اور بھی متحرک بنا دیا تھا۔ اس وقت کے سیاسی ،سماجی وثقافتی حالات کو پیش کرنے لئے غزل میں مروّج روایتی تصورات اور علامات ناکافی تھیں۔ ایک نئ فضا وسعت اور تبدیلی کا تقاضہ کر رہی تھی۔ حالانکہ ہر دور میں ہی شعروادب نے اس وقت کے حالات کا ساتھ دیا ہے اور بدلی ہوئی کیفیت کو بھی اپنے احاطہ میں شامل کیا ہے۔ غالب نے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ''کچھ اور وسعت'' کی طلب اور پھر غزل کے ظروف کی تنگ دامانی کا شکوہ بھی کیا۔ لیکن ہر دور میں ہی غزل نے زمانے کے مختلف موضوعات کو خود میں سمیٹ لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس دور میں بھی غزل نئ صورت حال سے نپٹنے اور نئے سماجی وحساسی شعور کو گرفت میں لینے کے لئے کوشاں ہو گئی تھی۔

سرسید کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر غزل کی اصلاح کا رجحان بھی پیدا ہوا اور اس سلسلے میں پہلا قدم حالی نے اٹھایا۔ حالی نے غزل کے متعلق کہا تھا کہ

وہ شعر اور قصائد کے ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

''دیوان حالی'' کے مقدمے میں رشید حسن خاں ان کے متعلق فرماتے ہیں:

''حالی نے جب یہ دیوان مرتب کیا تھا اس وقت وہ قدیم رنگ سخن سے اپنا رشتہ گویا توڑ چکے تھے اور اصلاحی شاعری کو اپنا نصب العین بنا چکے تھے۔ پوری ایمانداری کے ساتھ وہ اس بات کو مان چکے تھے کہ شاعری کا اصل مقصد قومی اصلاح ہونا چاہئے۔ جو

---

[1] (فن تنقید اور اردو تنقید نگاری۔ پروفیسر نورالحسن نقوی۔ 2007، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ ص:107)

> شاعری سماجی افادیت کے کام نہیں آسکتی، وہ قابل التفات نہیں۔
> یہ اندازنظر کی تبدیلی تھی، جس نے بالآخر عقیدے کی شکل اختیار کر
> لی۔ انہوں نے عالم باعمل کی طرح اسی اندازنظر کے تحت بہت کچھ
> کیا، گویا ایسی شاعری کے نمونے بھی پیش کردئے اور اس انداز
> شاعری کو برحق ثابت کرنے کی خاطر مقدمہ شعروشاعری میں طویل
> بحثیں کیں۔'' ۱

حالی نے غزل کو نئے موضوعات اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش وسعی کی۔ اپنی تصنیف، مقدمہ شعروشاعری ، میں انہوں نے غزل کے لئے زاویے سے بحث کی اوراس کے روایتی انداز سے انحراف کیا۔انہوں نے خوب سے خوب تر کی تلاش کی اورغزل کوایک نئے انداز میں پیش کیا۔ یہ کوشش کوئی غلط مقصد کے لئے نہیں کی گئی تھی بلکہ غزل کے لئے کوئی موضوع ممنوع نہیں ہے لیکن حالی کوغزل کے اس مزاج کا علم تھا اور جب انہوں نے غزل میں نئے مضامین کو داخل کرنا شروع کیا توان کے یہاں غزل اور نظم کا فرق مدھم پڑ گیا اور حالی کی غزلیں نظموں کی صورت اختیار کرتی گئیں۔شاعری سے جھوٹ اورمبالغے کو دور کرنے لئے نیچرل شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ نیچرل شاعری سے مراد یہ کہ شعر میں جو کچھ کہا جائے وہ نیچرل یعنی فطرت کے مطابق ہوتا کہ سامعین کو بھی اس کے فطری ہونے کا احساس ہو۔اس طرح غزل کے بجائے نظم کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی اور جیسا کہ ہر نیا دور اپنے ساتھ نئی اشیاء ، نئے محرکات اور نئے مسائل لاتا ہے جس کا اثر اس دور کے شعروادب پر بھی پڑتا ہے اسی طرح جدید نظم بھی حالات سے متاثر ہوکر وجود میں آئی اور پھر سے ملک وقوم میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔انجمن پنجاب لاہور اوراس میں منعقد مشاعرے اس کی ایک اہم کڑی ہیں۔

محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کی رہنمائی اور کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں جدید مشاعرے کی داغ بیل پڑی۔آزاد نے جدید شاعری کے سلسلے میں ایک زوردار لیکچر دیا اوراس میں انہوں نے اپنے قدیم شعروادب سے بیزاری اور مغربی علوم وفنون خصوصاً انگریزی ادب سے متاثر ہونے کی

---

۱ (دیوان حالی ، مولانا الطاف حسین حالی، مقدمہ رشید حسن خاں ، 2006 ، اردو اکادمی دہلی ص:۲)

دلیل دی۔آزاد کہتے ہیں :

''نئے انداز کے خلعت اور زیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی کے صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔یاں صندوق کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔ہماری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے اس کو آزاد کرنے میں کوشش کرو۔'' [۱]

انجمن پنجاب لاہور کے مشاعروں سے پہلی والی نشست میں آزاد نے اپنے لیکچر کے بعد نمونے کے طور پر مثنوی ''شب قدر'' سنائی۔اس کا آغاز آفتاب سے ہوتا ہے۔جب رات آتی ہے تو لوگ اپنے اپنے خوابوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔دن بھر کی مشکلات کے بعد ہر انسان رات میں نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔آزاد کے تخیل کی پرواز دیکھئے۔

گھوڑے پہ اپنے اونگھ گیا ہے سوار بھی
چوکاء ہی بلکہ راہزن نابکار بھی

القصہ ہے امیر کوئی یا فقیر ہے
عورت ہے یا کہ مرد جواں ہے کہ پیر ہے

بچہ کہ ماں کی گود میں ہے یا کہ پیٹ میں
سب آ گئے ہیں نیند کے اس دم لپیٹ میں

جس کو پکارو وہ سوئے خواب عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا

ہونا وہ بعد شام شفق میں عیاں ترا
اڑنا وہ آبنوس کا تخت رواں ترا

اے رات سنتا ہوں کہ ترے سر پہ تاج ہے
ہر گوہر اس میں ملک حبش کا خراج ہے

---

۱) اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔ منظر اعظمی 2009 اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ

دنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر چشم
کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم

یہ نظم مشاعروں سے پہلے نمونہ کے طور پر پیش کی گئی تھی۔جس میں کوئی خاص جان نہیں تھی لیکن قدیم شاعری سے موضوع میں بڑی تبدیلی تھی جو کہ اس مشاعرے کا مقصد تھا کہ پرانے فرسودہ روایت کوترک کر کے کچھ نئ اور فطری زبان میں شاعری کا لطف لیا جائے۔زبان کے چٹخاروں سے آشنا ذہن ان سے بھلا کیا لطف لیتے۔

انجمن پنجاب لاہور کا پہلا مشاعرہ جو 30 مئی 1874 کو منعقد ہوا اور کرنل ہالرائڈ کی تجویز کے مطابق اس کا موضوع ''برسات'' رکھا گیا۔آزاد نے ''ابرکرم'' کے عنوان سے نظم پڑھی۔اس میں آزاد نے سارا زور برسات کی منظرنگاری پر ہی لگا دیا۔یہ نیچرل شاعری تو تھی لیکن اس کا مقصد محض بیرونی عکاسی تھا اور اس کی رسائی اندرونی سطح تک نہ ہو پائی۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں
اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں

وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلک رہے
وہ کیاریاں بھری ہوئی تھالے چھلک رہے

آب رواں کا نالیوں میں لہر مارنا
اور روئے سبزہ زار کا دھوکر سنوارنا

کوئل کا دور دور درختوں پہ بولنا
اور دل میں اہل درد کے نشتر گھنگھولنا

طاؤس کا وہ دم کو چنور کرکے ناچنا
اور مورنی کا اشک کے موتی کو جانچنا

املی کے اک درخت میں جھولا پڑا ہوا
اور ساتھ اس کے آم کا ٹپکا لگا ہوا

جھولوں میں نوجواں ہیں پینگھیں بڑھا رہے
اور بچے آم کے ہیں پپیے بجا رہے

ساون کے گیت اٹھا رہے طوفاں دلوں میں ہیں
پردیسیوں کی یاد سے ارماں دلوں میں ہیں

ہر تان میں ملہار کی مستی کا شور ہے
بادل گرج کے پردے میں دیتا ٹکور ہے

نیچرل شاعری کے جو عنصر حالی کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں وہ آزاد کے یہاں نہیں ہیں۔ آزاد کے یہاں حقیقت نگاری تو ہے لیکن ظاہری طور پر۔ حالؔی نے ''برکھا رت'' کے عنوان سے نظم پڑھی جس میں برسات کی بیرونی نہیں بلکہ اندرونی کیفیت بھی موجود ہے جو شاعری کا حسن بھی ہے اور اس دور کی نئی فضا کا تقاضہ بھی۔ ان کے اشعار محض معنی کو بیان نہیں کرتے بلکہ فن شاعری پر کھرے اترتے ہیں۔ ان کی اس نظم میں برسات کی عکاسی بڑے ہی خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔ چند اشعار پیش ہیں جن میں ہر کوئی گرمی سے بے حال ہے اور خاص طور چھوٹے بچے زیادہ پریشان ہیں.....

بچوں کا ہوا تھا حال بے حال
کملائے ہوئے تھے پھول سے گال

آنکھوں میں تھا ان کا پیاس سے دم
تھے پانی کو دیکھ کرتے مم مم

ہر بار پکارتے تھے ماں کو
ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو

پانی دیا گر کسی نے لا کر
پھر چھوڑتے نہ تھے منھ لگا کر

اور پھر برسات کی آمد پر یوں منظر کشی کی ہے۔

پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار
دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار

پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل
ہے گونج رہا تمام جنگل

کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو
اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو

کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی
گویا کہ ہے دل میں بیٹھ جاتی

مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے
سنسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے

دوسرا مشاعرہ 30 جون 1874ء کو منعقد ہوا جس کا موضوع ''زمستان'' تھا۔ آزاد نے اس مشاعرے میں ''زمستان'' کے عنوان سے نظم پڑھی۔ اس نظم میں موسم سَرما میں مختلف لوگوں کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ برف سے ڈھکے پہاڑوں، برف پر پھسلنے کا مزہ وغیرہ کا ذکر ہے۔ سردی کے رات دن، پان کھانے اور چبانے، گانے بجانے کے نقشے پیش کیے گئے ہیں۔ بوڑھے کس طرح اپنے ماضی سے لطف اندوز ہیں اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اے زمستاں کہوں کس طرح تری رات کا لطف
تیری شب ہائے دراز اور وہ ہر بات کا لطف

ہے جواں لیتا اسی شب میں جوانی کا مزہ
اور جو بڈھا ہے تو لیتا ہے کہانی کا مزہ

شب سرما ہی میں ہے گانے بجانے کا مزہ
پان کھانے کا گلوری کے چبانے کا مزہ

اس مشاعرے میں شاہ انور حسین ہماؔ نے بھی نظم پڑھی۔حمد سے نظم کی ابتدا کی اس کے بعد گرمی کا حال پیش کیا پھر برسات کا ذکر کیا۔اور پھر سردی کی کیفیت اس طرح پیش کی۔

کیا لکھوں حال خوبیِ سردی
گئی گرمی کی صاف سر دردی

عیش و آرام ہے امیروں کو
غم و آرام ہے فقیروں کو

ہے برانڈی برانڈے میں موجود
کان میں آتی ہے صدائے سرور

رکھی مسکوٹ میں ہے اغذیہ گرم
بہر شربت شراب میں سر گرم

کیوں نہ کمروں میں آکے کھولیں کمر
رخت نرم گرم شام و سحر

ساقی و جام و شیشہ ہے اور وین
دیتے ہیں داد عیش و عشرت و چین

اس مشاعرے میں مولوی مرزا اشرف بیگ خان اشرف اسٹیٹ مترجم ڈائریکٹری پنجاب، منشی الٰہی بخش رفیق،مولوی اموخان ولی دہلوی(جو غالب کے شاگرد تھے)مولوی عطاء اللہ اور مولوی علاؤ الدین محمد کاشمیری وغیرہ نے بھی نظم پڑھی۔تیسرا مشاعرہ 3اگست 1874ء کومنعقد ہوا۔ اس کا موضوع ''امید'' تھا۔حالی نے ''نشاط امید'' کے عنوان سے نظم پڑھی۔نظم ولولوں سے بھر پور تھی۔حالی نے تاریخ کے پس منظر میں امید کی کارفرمائیوں کا نقشہ کھینچا ہے۔وہ امید جو کبھی کشتیِ نوحؑ کا سہارا بنی اور چاہ کنعاں میں یوسفؑ کے دل کوسکون پہنچاتی تھی۔وہ امید جس نے رام اور پانڈو کا بھی ساتھ دیا اور قیس کا دل بہلایا اور فرہاد کو ہمت دی ،رانجھے کی دل جوئی کی اور رومیو میں جوش و

ولولہ بھر دیا ۔

نیکیوں کی تجھ سے ہے قائم احساس
تو نہ ہو تو جائیں نہ نیکی کے پاس

کان میں پہنچی تیری آہٹ جو ہیں
رخت سفر یاس نے باندھا وہیں

ساتھ گئی یاس کے پژمردگی
ہو گئی کافور سب افسردگی

تجھ میں چھپا راحت جاں کا ہے بھید
چھوڑیو حالی کا نہ ساتھ اے امید

چوتھا مشاعرہ یکم ستمبر 1874ء کو ہوا۔اس کا موضوع حب وطن تھا۔حالی اور آزاد دونوں نے اس موضوع پر نظمیں پڑھیں۔دونوں کی نظمیں عمدہ تھیں لیکن حب وطن کا ایک محدود دائرہ پیش کیا گیا اگرچہ اس کے خلاف وہ اور زیادہ لکھ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ یہ لوگ انگریزی حکومت کے ملازم تھے اور یہ مشاعرہ انہیں کی سرپرستی میں ہورہا تھا۔انہوں نے اپنے ملک کی ہر شئے سے محبت کا پیغام دیا اور وقت بہ وقت ایک دوسرے کی مدد کرنے کی گزارش کی ہے۔آزاد کہتے ہیں۔

اب میں تمہیں بتاؤں کہ حب وطن ہے کیا
وہ کیا چمن ہے اور ہوائے چمن ہے کیا

وہ نور مہر جس سے زمانے میں نور ہے
وہ نور ذرے ذرے میں جس کا ظہور ہے

حب وطن ہے جلوہ اسی نور پاک کا
اور روشن اس کے نور سے عالم ہے خاک کا

لبریز جوش حب وطن سب کے جام ہوں
سرشار ذوق وشوق دل خاص وعام ہوں

اس کے برعکس حالی کے یہاں مناظر قدرت کی بہت عمدہ مثال پیش کی گئی ہے۔

اے سپہر بریں کے سیارو
اے فضائے بریں کے گلزارو

اے پہاڑوں کی دلفریب فضا
اے لب جو کی ٹھنڈی ہوا

اے نسیم بہار کے جھونکو
دہر نا پائیدار کے دھوکو

تم ہر ایک جاں میں ہو یوں عزیز
تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو
اٹھو اہل وطن کے دوست بنو

انہیں جذبوں نے آگے جاکر قومی اور وطنی شاعری کو فروغ دیا۔ پانچواں مشاعرہ اکتوبر 1874ء کو ہوا اس کا موضوع ''امن'' تھا جس میں بہت سے شعراء نے حصہ لیا۔ آزاد نے اس میں اپنی نظم ''خواب امن'' پڑھی۔ چھٹا مشاعرہ ''انصاف'' کے موضوع پر ہوا۔ آزاد نے اس میں ''داد انصاف'' اور حالی نے ''مناظرہ رحم وانصاف'' کے عنوان سے نظمیں پڑھیں۔ ساتواں مشاعرہ ''مروت'' کے عنوان سے ہوا اور آزاد نے اس میں ''وداع انصاف'' کے عنوان سے نظم پڑھی۔ مولانا حالی اس وقت لاہور سے جا چکے تھے اس لئے وہ اس مشاعرے میں اور بعد کے مشاعروں میں شریک نہ ہو سکے۔ آٹھواں مشاعرہ جنوری 1875ء کو منعقد ہوا جس کا موضوع ''قناعت'' تھا۔ آزاد نے ''گنج قناعت'' پڑھی جو کہ ایک بیانیہ نظم ہے جس میں تمثیلی رنگ بھی کارفرما تھا۔ نواں مشاعرہ مارچ 1875ء میں ہوا اس کا موضوع تہذیب تھا۔ آزاد نے اس میں ''مصدر تہذیب'' کے عنوان سے نظم پڑھی۔ آزاد، حالی اور مشاعرے کے

دیگر شعرائے کرام نے قدیم روایت سے بغاوت کرتے ہوئے شاعری کو بامقصد بنانے پر زور دیا۔ نظم نگاری کے لئے مثنوی کی ہیئت کو منتخب کیا گیا جس میں صرف دو ردیف وقوافی ہر شعر کے لئے ضروری ہوتے ہیں اور پوری نظم میں اس کا التزام نہیں ہوتا۔ اس طرح سے اشعار میں تسلسل بنا رہتا ہے اور کسی موضوع پر بات کہنے میں کوئی بندش نہیں ہوتی۔ اس مشاعرے کے سبب مثنوی کے موضوع میں بھی تبدیلی آئی، مافوق والفطری اور قصہ کہانیوں کے بجائے نیچر اور فطرت کی عکاسی کی جانے لگی۔ اس طرح اردو شاعری میں عشق و عاشقی روایتی باتوں کے علاوہ افادیت کو جگہ دی گئی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''بایں ہمہ اس بات سے انکار مشکل ہے کہ غزل کے بجائے نظم کو مرکزی حیثیت تفویض کرنے کی تحریک کا آغاز یقیناً حالی کے دور میں ہوا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ اول یہ کہ اس زمانے کی غزل جسم اور اس کے لوازم کی عکاسی کر رہی تھی اور نظم کی تحریک غزل کے اس رجحان سے نجات پانے کی ایک کوشش تھی، دوم یہ کہ حالی کا موقف شعر کو قومی اصلاح کے لئے استعمال کرنا تھا اور غزل اپنے محدود کینوس کے باعث اس اصلاحی تحریک کا پوری طرح ساتھ نہ دے سکتی تھی۔ اس کے مقابلے میں نظم کا تسلسل موضوع کی تمام منطقی کڑیوں کا بآسانی احاطہ کر سکتا تھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ حالی کا دور سماجی اور سیاسی تحریک کی ابتدا کا دور تھا۔ یہ تحریک ایک بڑی حد تک ریل، تار، برقی، دیہات سے شہر کی طرف آبادی کا انتقال، پریس کی ترقی اور مغربی تہذیب کے نفوذ کے باعث تھا اور اس تحریک کو پوری طرح گرفت میں لینے کے لئے نظم کا حربہ ہی زیادہ کار آمد تھا۔'' [1]

---

[1] (اردو شاعری کا مزاج۔ وزیر آغا۔ 1965ء جدید ناشرین لاہور۔ ص:320-319)

وطن پرستی اور انگریزی حکومت کے خلاف جذبات کا اظہار

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ 1857 کی ناکام بغاوت کے بعد انگریز ہندوستانیوں پر پوری طرح قابض ہو چکے تھے۔ برطانوی حکومت نے اہل وطن پر بے حد ظلم کیے اور اس کے سماجی، سیاسی، معاشی، مذہبی، تہذیبی وثقافتی زندگی میں دخل اندازی تو کر ہی رہے تھے ساتھ ساتھ ان پر اپنی پالیسیاں اور طریق کار بھی مسلط کر رہے تھے اور ان کو برتنے میں بھی وہ بہت سختی سے کام لے رہے تھے۔ کہیں کالے اور گورے کے درمیان فرق کرتے تو کہیں ہندو اور مسلم کے نام پر مذہبی فرقہ پرستی کو فروغ دیتے ان کا اصل مقصد اہل ملک میں پھوٹ ڈال کر اپنی حکومت کو قائم رکھنا تھا لیکن ہندوستان میں کچھ ایسے شخص بھی تھے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے برطانوی حکومت کے منصوبوں کو سمجھ رہے تھے اور اپنی قوم کو ان کے چنگل سے آزاد کرانے کی کوشش و کاوش میں تھے۔ حالانکہ یہ کوشش بڑے پیمانے پر ابھی نہیں تھی لیکن ہندوستانیوں میں وطن پرستی کے جذبات کو جگانے میں بہت حد تک کامیاب رہی۔ اس سے پہلے قوم میں یکجہتی کے جذبے کا فقدان تھا جس کے تحت اہل وطن کبھی متحد نہ ہو سکے تھے لیکن قوم کے رہنماؤں نے ملک کی سیاسی وسماجی تحریکوں میں شرکت کے باعث اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ جب تک ہم متحد نہیں ہوں گے تب تک انگریزی حکومت ہمارے منتشر ہونے سے استفادہ کرتی رہے گی۔ چنانچہ قوم کے سرپرستوں اور رہنماؤں نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا اور اس سے نپٹنے کے لئے کچھ تدبیریں نکالیں جو آگے چل کر کامیاب ہوئیں۔ اس طرح انہوں نے سب سے پہلے قوم میں وطن پرستی کے جذبات کو جگایا جس سے اہل وطن اپنے ملک سے اس طرح محبت کریں کہ انگریزی حکومت کے خلاف جذبات کا اظہار کریں اور اسے کسی دوسری قوم کے قبضے سے آزاد کرائیں۔ چونکہ شاعری ہر دور کے حالات کا احاطہ کرتی ہے چنانچہ اس دور میں بھی اس نے اپنے فرائض کو انجام دیئے۔

قومی رہنما سرسید نے اپنے ملک کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ملک کے سیاسی، سماجی، تعلیمی اور تہذیبی صورت حال میں اصلاح کی کوشش وسعی کی۔ جس کے زرخیز نتائج بھی سامنے

آئے۔ اس طرح انہوں نے ہمہ گیر اصلاحی تحریک کے ذریعے ادب کی معاشرتی اور تہذیبی اہمیت کو سامنے رکھ کر اردو میں مقصدی شعر و ادب کی تخلیق کی بنیاد ڈالی۔ انجمن پنجاب کی نظم نگاری کی تحریک کو سرسید کے افادی نقطہ نظر نے اور واضح کیا۔ اس طرح اردو شاعری حیات و کائنات کے بھرپور مسائل کے قابل ہو سکی۔ ادھر مولانا حالی لاہور سے جدید نظم کی روایت لے کر دہلی پہنچے جہاں ان کے ذہن میں مقصدی شاعری کے ساتھ شاعری کے آداب والقاب اور اس کے لئے ضروری لوازمات کو واضح کرنے کے خیالات امڑ رہے تھے جس کو انہوں نے ''مقدمہ شعروشاعری'' کے نام سے عملی جامہ پہنایا۔ اس طرح ''مقدمہ شعروشاعری'' سرسید کے خیالات کی تفصیلی تفسیر اور ''مسدس مدوجزر اسلام'' ان کے خواب کی شعری عملی تعبیر ہے۔ یہ نظم ایک بدلتے ہوئے ماحول کی بدلتی ہوئی کیفیت اور اس ماحول میں رہنے والے افراد کے حالات کو بہتر طور پر بدلنے کی خواہش کی پیداوار ہے۔ گویا زندگی کے افادی زاویہ نظر نے اس کی تخلیق کی ہے۔ سرسید کی تحریک کی بنیاد جن خیالات پر استوار تھی، وہی اس نظم کا موضوع ہے۔ حالی نے مسدس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

> ''اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی اس حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا۔ پھر کوکب اسلام کا طلوع ہونا اور نبی امی کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعتاً سرسبز شاداب ہو جانا اور اس ابر رحمت کا امت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا، اور مسلمانوں کا دینی و دنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے اس کے بعد ان کے تنزل کا حال لکھا۔ اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آ کر وہ اپنے خط و خال دیکھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔'' [1]

اس بیان کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حالی نے دور جاہلیت سے لے کر اس

---

[1] (مسدس حالی، الطاف حسین حالی، 2002، رام نرائن لال اران کمار، الہ آباد، ص:16-15)

وقت تک کی زندگی کے سارے مدوجزرکواس نظم میں سمیٹ دیا ہے ۔ یہ مسلمانوں کی قومی زندگی کے انحطاط وزوال کا ایک مرثیہ ہے ۔

نہیں قوم میں گرچہ کچھ جان باقی
نہ ہے اس میں اسلام کی شان باقی

نہ وہ جاہ و حشمت کے سامان باقی
پر اس حال میں بھی ہے اک آن باقی

بگڑنے کا گو ان کے وقت آ گیا ہے
مگر اس بگڑنے میں بھی اک ادا ہے

حالی نے اپنی نظم میں انسانیت ، تعلیم کی قدر و قیمت ، مغرب کی آمد سے برکت اور تجارت وغیرہ پر زور دیا ہے ۔ انہوں نے قوم کی فلاح و بہبود کے لئے تعلیم پر زور دیا ہے ۔

جنہوں نے کی تعلیم کی قدر و قیمت
نہ جانی مسلط ہوئی ان پہ ذلت

ملوک اور سلاطین نے کھوئی حکومت
گھرانوں پہ چھائی امیروں کی نکبت

رہے خاندانی نہ عزت کے قابل
ہوئے سارے دعوے شرافت کے باطل

نہ قوموں میں عزت نہ جلسوں میں وقعت
نہ اپنوں سے الفت نہ غیروں سے ملت

مزاجوں میں سستی دماغوں میں نخوت
خیالوں میں پستی کمالوں سے نفرت

عداوت نہاں دوستی آشکارا
غرض کی تواضع غرض کی مدارا

یہ سرسید کے خیالات ہی کے زیر اثر تھا کہ اردو شاعری میں سماجی بلکہ سیاسی موضوعات پر شعر کہنے کا رجحان پیدا ہوا اور دھیرے دھیرے ملک وقوم سے محبت کا جذبہ پیدا ہوا اس طرح قومی شاعری کی داغ بیل پڑی جو آگے جا کر براہ راست احتجاجی شکل اختیار کر لیتی ہے اور پھر انقلابی۔ لیکن قومیت کا یہ تصور کوئی نئی بات نہیں تھی اس سے قبل بھی قومی اور وطنی شاعری تخلیق کی جا چکی تھی بس ان شعراء کے یہاں ایک نیا ذہن، نیا احساس اور نیا جذبہ نہیں تھا جو اس دور کے شعراء میں ملتا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر آل احمد سرور فرماتے ہیں:

''وطن سے محبت، وطن کے ماضی کی سنہری تصویریں، اس کی تاروں بھری راتیں اور ٹھنڈی ہوائیں، ان کے لہلہاتے ہوئے میدان اور گنگناتے ہوئے دریا۔ ہر شاعر کے دل میں بسے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کو جو صدیوں سے یہاں موجود تھیں لوگوں نے پہلی دفعہ دیکھا ہے اور واقعی اس ملک کے باسیوں کو اپنے وطن کی محبت کا یہ احساس پہلی دفعہ اتنی شدت سے ہوا تھا کہ اس کی ایک مشت خاک کے بدلے بہشت بھی لینے کو تیار نہ تھے یہ احساس مغربی تعلیم کا بھی نتیجہ تھا اور ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کا بھی۔'' [1]

حالی نے براہ راست انگریزوں کی پالیسیوں سے احتجاج تو نہیں کیا لیکن انہوں نے وطن سے محبت اور اس کے لئے کچھ کر گزرنے کا جذبۂ حریت اہل وطنوں میں ضرور جگایا تھا گویا اس دور میں پڑھے لکھے طبقے کے دل میں حب وطن اور قومیت کی لہریں جوش مارنے لگیں تھیں اور حالی کا دل بھی وطن پرستی اور قومیت سے سرشار تھا۔ اردو شاعری میں باضابطہ طور پر پہلی بار کوئی شاعر وطن کی محبت سے اس طرح سرشار تھا۔ اپنی نظم ''حب وطن'' میں لکھتے ہیں ؎

1(اردو شاعری کا ارتقاء، فرمان فتحپوری، 2014، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص: 135)

اے وطن اے مرے بہشت بریں
کیا ہوئے ترے آسمان و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمین اور وہ آسماں نہ رہا

تری دوری ہے مورد آلام
تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے
گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے

مٹ گیا نقش کامرانی کا
تجھ سے تھا لطف زندگانی کا

جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا
ان کو کیا ہوگا زندگی کا مزا

ان اشعار میں کتنا احساس ہے جذبات کا کتنا شدید رنگ ہے۔انھوں نے بس انفرادی نقطۂ نظر سے چند جذبات کو ہی بیان کیے ہیں لیکن ان کو محض اپنی ذات تک محدود نہیں کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں آفاقی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔انھوں نے بغض اور نفرت جو اس وقت وطن میں موجود تھی اس کو ختم کر کے محبت و امن کا پیغام دیا ہے۔وہ براہ راست افراد کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!
اٹھو اہل وطن کے دوست بنو!

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ پیو ، چلے جاؤ

جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ
تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ

ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر
لو ، جولی جائے کو رو کر کی خبر

قوم پر اگر کرتے ہو احساں
تو دکھاؤ کچھ اپنا جوش یہاں

قوم کی عزت اب ہنر سے ہے
علم سے یا کہ نیم و زر سے ہے

کوئی دن میں وہ دور آئے گا
بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا

نہ رہیں گے سدا یہی دن رات
یاد رکھنا ہماری آج کی بات

گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

حالی کی طرح آزاد کے یہاں بھی حب الوطنی کے جذبات نظر نہیں آتے۔اس دور میں اہل وطن کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبات کا فقدان تھا اور آزاد کو اس بات کا اچھی طرح احساس تھا۔

اب میں تمھیں بتاؤں کہ حب وطن ہے کیا
وہ کیا چمن ہے اور ہوائے چمن ہے کیا

وہ نور مہر جس سے زمانے میں نور ہے
وہ نور ذرے ذرے میں جس کا ظہور ہے

جب وطن ہے جلوہ اسی نور پاک کا
اور روشن اس کے نور سے عالم ہے پاک کا

لبریز جوش حب وطن سب کے جام ہوں
سرشار ذوق و شوق دل خاص و عام ہوں

پھر آگے کتنے درد انگیز انداز میں کہتے ہیں ؎

جب وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں
حیران ہوں آج کل ہے پڑا اس کا کال کیوں

اس دور میں شبلی نعمانی بھی شاعری کی دنیا میں ہنگامہ برپا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ ماضی کی عظیم روایات کے پاسباں بھی ہیں اور عصری تقاضوں سے آشنا بھی۔جیسا کہ سیاست اور قومیت اس دور کی شاعری کا ایک اہم موضوع تھا لیکن مولانا شبلی سیاست میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ مذہبی نقطۂ نظر کو زیادہ اہمیت دیتے تھے لیکن اس زمانے کے ملکی اور بین الاقوامی حالات ایسے تھے کہ کوئی شاعر وادیب اس سے نظر چرا کر نہیں جا سکتا تھا چنانچہ ان کا رجحان بھی اس طرف بڑھا۔ اور انھوں نے اس موضوع پر ایسی ایسی نظمیں کہیں جن کی نظیر مشکل سے ملے گی۔مولانا شبلی ترکوں کے بڑے ہمدرد تھے۔1912 میں جنگ بلقان میں جب ترکوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو شبلی نے کہا ؎

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تاکے ، یہ حشر انگیزیاں کب تک

اس جنگ میں انگریز ترکی کو اپنی سیاسی بساط کا مہرہ بنانا چاہتے تھے جس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بے چینی پھیلنی لازمی تھی۔انگریزوں کے اس رویے کی مخالفت کی گئی۔ پر جوش مضمون لکھے گئے جوش وولولہ سے بھری نظمیں لکھی گئیں۔جس کے ذریعہ اپنے غم وغصہ کو ظاہر کیا گیا ؎

یہ جوش انگریزی طوفان بیدار و بلا تاکے
یہ لطف اندوزی ہنگامہ آہ و فغاں کب تک

1906ء میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا لیکن شبلی نے یہ دیکھا کہ مسلم لیگ ہندوستان کی آزادی میں مددگار ہونے کے بجائے اوراس کی راہ کی

مصیبت بن رہی ہے۔شبلی کواس کااحساس اچھی طرح تھاوہ آزادی کے خواہاں تو تھے لیکن ایسے سمجھوتے پر تیار نہ تھے جو ہندوستان کو غلام بنائے رکھے۔شبلی نے نظم میں اس طرح اپنے غم و غصے کا اظہار کیا ۔

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں
ملک میں غلغلہ ہے ، شور ہے ، کہرام بھی ہے

ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ
نظر لطف رئیسان خوش انجام بھی ہے

مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ
سال بھر حضرت والا کو کوئی کام بھی ہے

شبلی نے مسلمانوں کے ذہنی افق کو نئی وسعتیں دیں انہیں سیاست کی طرف مائل کیا اس وقت مسلمان اس قابل نہ تھے کہ ملک کی سیاسی پالیسیوں کو پوری طرح سمجھ سکتے وہ پوری طرح انڈین نیشنل کانگریس پر منحصر تھے۔ان کا خیال تھا کہ ملک ابھی پوری طرح مکمل آزادی کے لئے اہل نہ تھا۔کانگریس مسلم لیگ کے مقابلے میں مطالبات میں آگے تھی اوران کے رویے میں سختی بھی تھی۔شبلی کے مطابق مسلمان بہت کمزور تھے اوروہ چاہتے تھے کہ کانگریس جدوجہد کرکے آزادی حاصل کرے اوراس کے طفیل میں مسلمانوں کوبھی آزادی نصیب ہو۔فرماتے ہیں۔

یعنی جاکر شیر جب جنگل سے کر لائے شکار
لومڑی پہنچے کہ کچھ مجھ کو بھی اے سرکار من

مسلم لیگ جس مقصد کے تحت وجود میں آئی تھی اس مقصد سے وہ دور جارہی تھی وہ بغیر جدو جہداورقربانی کے ہی اپنانام تاریخ کے صفحات پرروشن کرناچاہتی تھی۔اس کے مطالبے میں جو مناسب سلف گورنمنٹ تجویز ہوئی تھی وہ اس کے ابتدائی دور کا مسلک تھی اس کا ذکر شبلی کو کچھ یوں کرتے ہیں ۔

لیگ نے سن کے یہ سب مجھ سے بآہستہ کہا
آپ سمجھے بھی کہ اس لفظ کا کیا تھا محل

ہم نے گو سلف گورنمنٹ کی خواہش کی تھی
شرط یہ بھی تو لگادی تھی کہ ہو ''سوٹ ایبل''

یہ وہ باتیں ہیں جومخصوص ہیں یورپ کے لئے
آپ طے پہلے غلامی کی تو کریں منزل

اردوشعروادب کی تاریخ میں اکبرالہ آبادی کی شناخت اس شاعر کی حیثیت سے ہے جنھوں نے طنزومزاح کواپنی تخلیق اوراظہارخیال کا وسیلہ بنایا۔طنزومزاح کے پیرائے میں انہوں نے زندگی اورسماج کی ایسی تلخ حقیقتوں کوپیش کیاہے جس سے ہماراملک اس وقت دوچارہورہاتھا۔ اکبرکی شاعری اپنے دور کے حالات کی ترجمان اوراس وقت کے ماحول کی پیداوارتھی۔ جب ہندوستان پر برطانوی حکومت اورنئ ایجادات سے متاثرہوکرتغیروتبدل کی جانب بڑھ رہاتھا۔مشہورنقاد پروفیسرسیدمحمدعقیل رضوی اپنے مضمون ''اکبراوران کاپیغام''میں اس دورکا جائزہ لیتے ہوئے رقم طرازہیں:

''یہ دورہندوستانی سماج اورہندوستانی سیاست میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ہندوستان اس وقت ایک تحیرکن خلفشاری دورسے گزررہاہے۔ ایک طرف تو سائنسی ایجادات،اختراعات،اصول اورتجربے تھے، دوسری طرف غیرملکی قبضہ اوران سے نفرت ومحکومیت کاجذبہ کارفرما تھا۔ایک طبقے کواگر اپنی ثروت وجاہ کے مٹنے کاالم تھاتودوسرے کو اپنی روایات واعتقادات کے باطل وشکست ہونے کاغم پریشان کررہا تھااورنتیجے کےطورپردونوں طبقے اس نئ اورجابرحکومت سے بیزارنظر آرہے تھے۔ اقتدارکے گھٹنے کااحساس ،ریل گاڑی،بنگلہ،پاٹ، صابون،اخبار،تار،ڈاک،ٹیلیفون لوگوں کے لئے خواب پریشاں سے

کم نہ تھے۔'' [1]

اکبر کے یہاں ایسے لاتعداد اشعار ہیں جو انگریزوں کی ایجاد کردہ اشیاء کی مخالفت کرتے ہیں مگر طنز و مزاح کی شکل میں۔ اگر ان کا یہ اظہار سیدھے سادے انداز میں کیا جاتا تو انگریزی حکومت اس کی سخت مخالفت کرتی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

دھن دیسی کی تھی جس میں گاتا تھا ایک دیہاتی
بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

الٰہی خانۂ انگریز گرجا
یہ گرجا ہے ، یہ گرجا ہے ، یہ گرجا

یہاں بسکٹ پوری اور چپاتی علامت کے طور استعمال کیا گیا ہے۔ پوری ہندوؤں اور چپاتی مسلمانوں کی طرف اشارہ کرتی ہے اور بسکٹ انگریزوں کی طرف۔ اس طرح قومیت کے جذبے کو مدنظر رکھتے ہوئے اکبر نے انگریزوں کی مخالفت کی ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں بھی اکبر نے گرجا کو دو معنی میں استعمال کیا ہے ایک تو عبادت خانہ گرجا اور دوسری طرف گرجا گھر کا کرنا مثلاً وہ گرجا پر لعنت بھیج رہے ہیں کہ یہ گر جائے اس طرح ان کے یہاں بہت سے اشعار ہیں جن میں انہوں نے اہل وطن کی حمایت کی ہے اور انگریزوں کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ طنزیہ شاعری بھی احتجاجی شاعری کے زمرے میں شامل ہے جس کا مقصد سماجی وسیاسی ناپسندیدگی کے خلاف آواز بلند کرنا ہے۔ اکبر کے یہاں اس طرح کا احتجاج نہیں جیسا ترقی پسندوں کے یہاں ہے بلکہ ان کا احتجاج ان کی طنزیہ شاعری کے پیچھے مخفی ہے جس کو وہ بڑے ہی بذلہ سنجی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ چند اشعار پیش نظر ہیں ۔

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی کلر کی کر خوشی سے پھول جا

عقل سپرد ماسٹر ، مال سپرد آنجناب
جان سپرد ڈاکٹر ، روح سپرد ڈارون

---

[1] (نئی فکریں، سید محمد عقیل رضوی، 1953، خیال پبلشرز الہ آباد، ص: 165/166)

آگے انجن کے دین ہے کیا چیز
بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز

شیطاں عربی سے ہند میں ہے بے خوف
لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

اس طرح اکبر کے یہاں ایسے اشعار کی بھرمار ہے جس میں وہ انگریزی حکومت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔انہوں نے مذہب اور تعلیم کے متعلق بھی احتجاج کیا ہے کیونکہ اس وقت انگریز ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتے تھے اوراس لئے وہ ملک میں انگریزی زبان کو ترجیح دے رہے تھے۔ یہ تبدیلی کچھ حدتک ٹھیک بھی تھی کیونکہ انگریزی ایک ایسی زبان تھی جس کی تعلیم حاصل کرکے انگریزوں کے منصوبوں اوران کے ادب کا مطالعہ کرسکتے تھے اور بعد میں کچھ تعلیم یافتہ طبقہ آگے آیا جنہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی اوراس سے استفادہ بھی کیا۔اس سلسلے میں اکبر کا احتجاج بلاوجہ تھا کیونکہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے کوئی عیسائی نہیں ہوجاتا۔ بہرحال اکبرنے ''برٹش راج'' نظم میں برطانوی حکومت کونشانہ بنایاہے اورطنزیہ انداز میں اپنے غم وغصے کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں برٹش راج
کہ ہرطرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے

جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو
کہ تیل پیچ میں ڈھیلی اس کی چول بھی ہے

جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبل کی
جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے

اکبر کے یہاں قومیت کا تصور اتناوسیع نہیں ہے لیکن وہ بھی انقلاب کے خواہاں تھے۔ان کے یہاں وطن پرستی کا خواب کچھ دھندلا سا ہے وہ وطن کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد تو کرانا چاہتے ہیں لیکن اس کے لئے ہم وطنوں کوورغلانے والی نظمیں بہت کم ہیں۔ وہ انگریزی حکومت کے خلاف مزاحمت واحتجاج تو کرتے ہیں لیکن قوم کومتحد ہوکرلڑنے کے لئے کوئی ایسی تدبیرنہیں دیتے

کہ جس سے ان کی وطن پرستی کوفروغ ملے۔اپنی نظم ''گاندھی نامہ'' میں انہوں نے ایک نئے انقلاب کا ذکر کیا ہے اوراس میں ان کی وطن پرستی کے جذبات اُبھر کر سامنے آتے ہیں لیکن ان کے یہاں اس طرح کی نظمیں بہت کم ہیں۔اشعار ملاحظہ ہوں۔

انقلاب آیا ، نئی دنیا ، نیا ہنگامہ ہے
شاہنامہ ہو چکا ، اب دور گاندھی نامہ ہے

گاندھی کے ساتھیوں میں جو ہیں وہ نیک ہی ہیں
''مہراج'' اور''مہاجر'' کے حرف ایک ہی ہیں

لشکر گاندھی کو ہتھیاروں کی کچھ چاہت نہیں
ہاں ! مگر بے انتہا صبر و قناعت چاہئے

کمر باندھی بھی یاروں نے جو راہ حب قومی میں
وہ بولے تو نہیں چلتا ، وہ بولے تو نہیں چلتا

ملو گاندھی سے اے اکبر اگر سڑکوں پہ جے پاہو
جھکو سلطان کے آگے ، اگر فرمان رے چاہو

اسماعیل میرٹھی بھی ایک محبّ وطن اورآزادی کا پیغام دینے والے شعراء کی صف میں موجود ہیں۔ایک طرف وہ آزادی کا پیغام دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

ان کا یہ شعر ان کی وطن پرستی اورآزادی کی خواہش کو پیش کررہا ہے۔انہوں نے بڑے حوصلے اورہمت کے ساتھ ان طاقتوں کی بھی حمایت کی جو یکجہتی کے علمبردا تھے۔

جب تک سبق ملاپ کا یاد رہا
بستی میں ہر ایک شخص دل شاد رہا

جب رشک و حسد نے پھوٹ ان میں ڈالی
دونوں میں سے ایک بھی نہ آباد رہا

اسماعیل میرٹھی بھی اوروں کی طرح برطانوی حکومت سے اہل ملک کوآزادکرانے کا خواب دیکھ رہے تھے لیکن یہ تبھی ممکن تھا جب اہل وطن پوری طرح متحد ہوکرایک مقصد کے لئے آواز بلند کریں اورفرقہ واریت اورتعصب کی جودیوارانگریزوں نے ہندوستانیوں خاص کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کھڑی کردی تھی، اس کوگرادیں۔

اردوشاعری کی تاریخ میں شاعرمشرق کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرنے والے اور شاعری کوقابل رشک بلندی پر پہنچانے والے ڈاکٹرسرمحمداقبال نے بھی اپنی قومی اوروطنی شاعری کے ذریعے ہندوستان میں قومیت کی روح پھونکی۔ملک میں اس وقت کی سیاسی صورت حال دیکھ کو انہوں نے اہل وطن کوآنے والی مصیبت سے پہلے ہی خبردارکردیا تھا۔''تصویردرد'' میں اپنے اس خیال کو کچھ یوں کہتے ہیں۔چنداشعارملاحظہ ہوں۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ملک کی غلامی کا ذمہ داراقبال نے خوداہل ملک کوہی ٹھہرایا ہے۔

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

اقبال کے ایسے کتنے لاتعداداشعار ہیں جن کے ذریعے انہوں نے اہل وطنوں کوغلامی کی ذلت اورآزادی کی اہمیت سے روشناش کرانے کی کوشش کی ہے۔انقلاب اقبال کے یہاں کسی توڑ پھوڑ ،نعرے بازی اورمختلف طبقات میں آویزش بپا کرنے کا نام نہیں بلکہ یہ انسان کے رویے اور ذہن ودل کی تبدیلی کاعمل ہے جوایک پورے معاشرے کوایک متحرک اورفعال قوت منقلب کردیتا

ہے۔اقبال کے اسی فلسفۂ انقلاب نے قوموں کے لئے آزادی کے تصور کواور بھی واضح کر دیا جن سے قوموں کو اپنے ذہنی،فکری اور سماجی نظامات کوسنوارنے کے مواقع فراہم ہوئے ۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

آزادی کی رگ سخت ہے مانند رگ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانند رگ تاک

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

اقبال کی قومی اور وطنی شاعری کے متعلق گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''اقبال کی شاعری میں سرسید،حالی اور شبلی کی روایات کا امتزاج ملتا ہے لیکن نہایت اعلیٰ ،ارفع،منفرد اور ممتاز سطح پر۔یہ شاعری تقریباً نصف صدی کے عرصے میں پھیلی ہوئی ہے۔اس کے ابتدائی حصہ میں وطن دوستی کا جذبہ خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔'' [۱]

اقبال نے اپنی شاعری میں حب وطن کی جس روایت کوقائم کیا ہے اس میں ماضی کی عظمت کا احساس،سیاسی بحران،فرقہ واریت کومٹانے کا جذبہ،خواہ وہ رنگ ونسل کے اعتبار سے ہو یا مذہب کے سب سے اعلیٰ طور پر ہے۔ان کے یہاں قومیت کوپیش کرنے کا بڑا گہرا شعور ہے اور اقبال تو ویسے بھی نئے لب ولہجے کا شاعر ہے ان کے قومی جذبے میں بڑا اخلوص ہے ان کی وطن پرستی صداقت پرمبنی ہے اور وہ ملک کے سیاسی حالات کا بہت گہرا شعور رکھتے ہیں ۔شاید اسی لئے ان کے قومی اور وطنی جذبات اپنی طرف زیادہ متوجہ کرتے ہیں۔ان کی نظم '' ترانہ ہندی'' یوں تو ایک عام اور سادہ سی نظم ہے لیکن مزید اس کی عمق میں جایئے تو کتنی سطحیں ہیں جو بحرے بیکراں کو کوزے میں سمیٹے ہوئے ہے۔ان کو اپنا وطن کچھ یوں عزیز تھا ۔

۱(ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، گوپی چند نارنگ، 2003، قومی کونسل برائے فروغ اردو

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

قومی سفینے کے تحفظ کے لئے اقبال نے پرخطر راہوں میں اتحاد اور یکجہتی کے چراغ روشن کئے۔اوراس اتحاد کا واحد ذریعہ عوام کی دلی قربت کو قرار دیا۔اسی راستے پر چل کر نہ صرف اہل وطن بلکہ پورے عالمگیر متحد ہو سکتے ہیں اوراس طرح پوری دنیا میں یکجہتی کا جذبہ قائم ہو پائے گا۔

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی
جرس بھی ، کارواں بھی ، راہبر بھی ، راہزن بھی ہے

اجاڑا ہے تمیز ملت و آئیں نے قوموں کو
میرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے؟

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

دوا ہر دکھ کی ہے مجروح تیغ آرزو رہنا
علاج زخم ہے آزاد احسان رفو رہنا

اقبال کی شاعری میں وطن دوستی کے جذبات سے متاثر ہوکر جناب نورالحسن نقوی فرماتے ہیں:

''حبِّ وطن اقبال کی زندگی کا پہلا پیار تھا اورفطرت کے دلکش مناظر انہیں بے حد عزیز تھے۔چنانچہ شعر کہنے شروع کئے تو پہلے ان ہی دونوں کوموضوع سخن بنایا۔جن نظموں میں یہ دونوں چیزیں

گھل مل گئی ہیں وہ بہت جاذب نظر ہیں۔'' [1]

اقبال نے بھلے ہی اپنی شاعری میں قومی وطنی اور آزادی کے جذبوں کو جگہ دی لیکن اس کے ساتھ وہ سیاسی شعور کی عکاسی بھی کرتے ہیں تہذیبی اور سماجی معاملات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی سوچ انقلابی تھی اور زندگی کے ہر شعبے میں وہ انقلاب کے خواہاں تھے اس لئے ان کی شاعری میں انقلابی رنگ ملتا ہے۔ان کی نظموں میں جو وطن پرستی ہے وہ جوش اور چکبست کی طرح جذباتی نہیں ہے بلکہ اس کا ایک سیاسی نصب العین ہے جو غلامی سے نفرت اور آزادی سے محبت کا خواہش مند ہے۔انہوں نے اپنے زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کو محسوس کیا اور اس موضوع پر بہت سی نظمیں لکھیں جس سے مسلم قوم میں جوش وولولہ پیدا ہو گیا۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر گوشۂ گندم کو جلا دو

نسل ، قومیت ، کلیسا ، سلطنت ، تہذیب ، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

اٹھ کے اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اقبال کی وطن پرستی سے متاثر ہو کر عبادت بریلوی اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

---

[1] (اقبال شاعر و مفکر، نور الحسن نقوی، 2015، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ص:16)

''اقبال نے حب وطن کی جس روایت کو پیش کیا ہے اس میں قومی
اور ملکی تصورات کو بڑی نمایاں جگہ حاصل ہے۔اس کی نوعیت اس
طرح تمام تر سیاسی اور سماجی ہو جاتی ہے۔اوراس میں شک نہیں کہ
اقبال کی وطنی شاعری درحقیقت وطنیت کی اس عام تحریک کا نتیجہ
ہے جوان دنوں ساری دنیا کے ممالک میں تیزی کے ساتھ پھیل رہی
تھی اقبال نے اس تحریک کی ترجمانی کی ہے۔'' [1]

سرور جہاں آبادی نے بھی اپنی شاعری میں قومی اوروطنی رنگ بھرنے کی کوشش وکاوش کی ہے۔اپنی شاعری کے ذریعے انہوں نے بھی ہندوستانیوں کوخواب غفلت سے بیدار کرنے کی سعی کی ہے۔

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو
پستی میں کیوں پڑے ہو اونچے نشان والو

کب تک یہ آہ و ذلت و عز و شان والو
کب تک یہ خواب غفلت ہونے کی کان والو

سرور نے وطن دوستی کی آئینہ دار نظموں میں ''خاک وطن'' اور ''پھولوں کا کنج'' خاص اہمیت کا حامل ہے۔جس میں انہوں نے قدیم روایات اورموضوعات،انسانیت کی فلاح ،عدل وانصاف، وطن پرستی،یکجہتی وغیرہ کوہم آہنگ کیا ہے۔

پھولوں کا کنج دلکش بھارت میں اک بنائیں
حب وطن کے اس میں پودے نئے لگائیں

خون جگر سے سینچیں ہر نخل آرزو کو
اشکوں سے بیل بوٹوں کی آبرو بڑھائیں

جب وطن کے لب پر ہوں جاں فزا ترانے
شاخوں پہ گیت گائیں پھولوں پہ چہچہائیں

---

[1] (روایت کی اہمیت،ڈاکٹر عبادت بریلوی 1953 انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ص:438)

حب وطن کا مل کر سب ایک گیت گائیں
لہجہ جدا ہو گرچہ مرغان نغمہ خواں کا

مل مل کے ہم ترانے حب وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں

ہندوستانیوں کی اندرونی کشمکش سے فائدہ اٹھا کرلارڈ کرزن نے ملکی اورعوامی اتحاد کو تہہ وبالا کرنے کے لئے 1905 میں بنگال کی تقسیم کا منصوبہ تیار کیا۔تقسیم بنگال کے خلاف انڈین نیشنل کانگریس نے ملک بھر میں تحریک چلائی۔عوام نے ہڑتالیں کیں ، جگہ جگہ جلسے منعقد ہوئے ، ہندو مسلم سبھی نے ان جلسوں میں شریک ہوکر احتجاج کیا۔اس طرح قومی یکجہتی کے اس احتجاج سے سامراجیوں کو خطرہ محسوس ہوا۔حکومت نے کانگریس کے ممتاز رہنماؤں کو گرفتار کرلیا۔اردو شعراء نے بھی سمراجی حکومت کے ان اقدامات کی سخت مخالفت کی ۔سرور نے بھی کہا ہے کہ

آہ! اے بنگال آلام و مصائب کے شکار!
آہ! اے کرزن کی پالیسی کے صیاد بے قرار

آہ! اے محنت کش و حرماں نصیب و درد مند
آہ! اے برگشتہ ایام و پریشاں روزگار

آہ ! اے بنگال اے ذلت نصیب و مبتذل
کیا ہوئی وہ تیری عظمت ؟ کیا ہوا تیرا وقار

اب نہ وہ تو ہے نہ تیری سر زمین عشق ہے
نہ وہ دن ہیں نہ راتیں ہیں نہ دور روزگار

کر کے دو ٹکڑے کلیجے کے ترے یہ آہ! کون؟
چل دیا تجھ کو تڑپتا چھوڑ کر بے گانہ وار

پھر گئی کرزن کی تجھ سے آہ کیوں چشم کرم
جاں فروشی تیرا شیوا ، جاں نثاری تھا شعار

تحریک آزادی کے علم بردار شعراء میں ایک نمایاں نام حسرت موہانی کا بھی ہے۔انہوں نے اپنے موئے قلم سے حریت کی چنگاری کو بھڑکانے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ خود عملی طور پر بھی جنگ آزادی میں شریک ہوکر قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

تحریک حریت کو جو پایا قرین حق
ہر عہد میں معاون تحریک ہم رہے

حسرت سے اردو غزل کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ان کی کثیر الجہات شخصیت کا کمال یہ تھا کہ کہیں وہ شعروادب کے لئے بے حد اعتدال پسند تھے تو کہیں سیاسی شعور کو بیدار کرنے کے لئے اتنے ہی نڈر تھے۔انہوں نے اپنی شاعری میں وطن پرستی اور انگریزوں کے خلاف احتجاج کیا چونکہ وہ غزل گو تھے اس لئے انہوں نے اپنی شاعری کو کھلی سیاست سے الگ رکھا اور غزل کے حسن کو برقرار رکھتے ہوئے ،رمز و کنایہ کے پیرائے میں پیش کیا۔ان کی شخصیت کی طرح ہی ان کی غزل میں دلیری بھی تھی اور دلبری بھی۔غلامی کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے انہوں نے ملک کے ہر فرد کو اس میں شریک ہونے کی دعوت دی۔

غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوشش ذات خاص پر ناز کر اعتماد کر

مادر وطن سے محبت کا جذبہ بیدار کرکے تحریک آزادی کی رو تیز کرنے میں حسرت کے کلام نے اہم رول ادا کیا ہے۔حریت کامل کے خواہاں حسرت موہانی انگریزی حکومت کی مخالفت کچھ یوں کرتے ہیں۔

ہم قوم کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
واللہ کبھی خدمت انگریز نہ کرتے

اے کہ نجات ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمت سر بلند سے پاس کا انسداد کر

اچھا ہے اہل جود کیے جائیں سختیاں
پھیلے گی یوں ہی شورش حب وطن تمام

جب سامراجی حکومت نے ہندوستانیوں کو آزادی کی جگہ رولٹ ایکٹ دیا جس نے غلامی کی زنجیروں کو اور بھی مضبوط کر دیا اس طرح اہل وطن کا غم و غصہ جائز تھا اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں نے متحد ہوکر اس جبر و استبداد کا مقابلہ کیا اور گاندھی جی نے اس عوامی جوش کو ایک نظم تحریک کی شکل دی۔اس طرح خلافت تحریک ہی نے صحیح معنوں میں مسلم علماء کو سیاسی جدوجہد کے میدان میں اتارا۔ ہندوستانی سیاست میں ہندو مسلم اتحاد کا سب سے شاندار مظاہرہ اس وقت ہوا۔ حسرت نے اس کا اظہار کچھ ایسے کیا ۔

غضب ہے کہ پابند اغیار ہوکر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر

سمجھتے ہیں سب اہل مغرب کی چالیں
مگر پھر بھی بیٹھے ہیں بے کار ہو کر

اٹھتے ہیں جفا پیشگان مہذب
ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر

تقاضائے غیرت نہیں ہے عزیزو
کہ ہم بھی رہیں ان سے بے زار ہو کر

ابھی ہم کو سمجھے نہیں اہل مغرب
بتا دو انہیں گرم پیکار ہو کر

فریب و دغا کے مقابل میں تم بھی
نکل آؤ بے رحم و خونخوار ہو کر

وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرتؔ
وفا کے ہیں طالب دل آزار ہو کر

وطن پرست شعراء میں چکبست کا نام ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے اہل وطن میں وطن کی عظمت اور وطن سے محبت پیدا کرنے کی پرزور کوشش کی ہے۔ان کا دور

بھی حب الوطنی کے لئے سازگار تھا۔قوم کے سچے فدائی کی طرح چکبست کوقوم کی خوشی سے انبساط اور تکلیف سے رنج ہوتا ہے اس لئے وہ ایسے موقعوں پر اپنے جذبات کوروک نہیں سکتے تھے۔ان کا نصب العین صاف اور سیدھا سادہ تھاوہ برطانوی حکومت کے خلاف براہ راست احتجاج کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں جوش وولولہ ہے،قنوطیت کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا بلکہ رجائیت جا بجا نظر آتی ہے۔ان کی بیشتر نظمیں وطن پرستی کے جذبات سے سرشار ہیں۔''حب قومی''،''خاک ہند'' ''وطن کا راگ''،''آوازۂ قوم''،''قوم کے سور ماؤں کوالوداع''،''ہماراوطن دل سے پیارا وطن'' ''وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک''وغیرہ ان کی نظموں کے عنوان ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کووطن سے کتنی محبت تھی۔''حب قومی'' کے چنداشعار ملاحظہ ہوں ؎

حب قومی کی زباں پر ان دنوں افسانہ ہے
بادۂ الفت سے پر دل کا مرے پیمانہ ہے

جس جگہ دیکھو محبت کا وہاں افسانہ ہے
عشق میں اپنے وطن کے ہر بشر دیوانہ ہے

حب کہ یہ آغاز ہے انجام کا کیا پوچھنا
بادۂ الفت کا یہ تو پہلا ہی پیمانہ ہے

چکبست کے وطن پرستی کے جذبات سے متعلق رام لعل نابھوی لکھتے ہیں:

''چکبست کی سب شعری تخلیقات میں وطن یا قوم کا نام ملتا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وطن کا تصور ان کے خون میں رچ بس گیا تھا۔کلام وطنی محبت کے جذبات اور قومی تصورات سے مملو ہے۔وہ حب وطن سے بیخود ومست تھے،ہندوستانی قومیت کے رجز خوابوں کی حیثیت سے ابھرے اوراس میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ انہیں وطن سے والہانہ محبت تھی۔ملکی وقومی معاملات میں وہ خاص ہندوستانی تھے۔ہندومسلم اتحاد کے حامی اورآزادی کی تحریک کے علمبر

> دار تھے۔ان کے سامنے گنگا جمنی تہذیب تھی۔صلح پسند اور معتدل مزاج
> تھے۔ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو برابر للکارتے تھے۔مذہبی تعصب
> اور تنگ نظری سے کوسوں دور تھے۔''[1]

چکبست ہندو اور مسلمان نہیں بلکہ پوری قوم کے شاعر ہیں ان کے یہاں ہندو،مسلم دونوں کا جو اتحاد نظر آتا ہے اس سے ان کی صلح پسندی،توازن اور اعتدال کا اندازہ ہوتا ہے وہ آزادی کے زبردست حامی تھے۔وہ ہندو اور مسلمانوں دونوں کو للکارتے ہیں۔

بھنور میں قوم کا بیڑہ ہے ہندوؤں ہوشیار
اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجھدھار

اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار
تو زیر موج فنا ہوگا آبرو کا مزار

مٹے گی قوم یہ بیڑہ تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

مسلمانوں کے لئے کہتے ہیں ۔

دکھادو جوہر اسلام اے مسلمانوں
وقار قوم گیا قوم کے نگہبانو

ستون ملک کے ہو قدر و فوقیت جانو
جفا وطن پہ ہے فرض وفا کو پہچانو

نبی کے خلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شان حمیت کی یادگار ہو تم

چکبست جہاں ایک طرف وطن پرست تھے تو دوسری طرف انگریز اوران کی پالیسیوں کے سخت مخالف بھی تھے۔دسمبر 1917ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس پھر ایک ساتھ کلکتہ میں ہوئے ۔کانگریس کے اجلاس میں مولانا محمد علی کو صدر منتخب کیا گیا جو کہ ان دنوں جیل میں تھے۔

---

[1] (چکبست ، رام لعل نابھوی ، 1992 ، ترقی اردو بیورو،نئی دہلی ، ص:17-16)

مہاتما گاندھی اور سروجنی نائڈ و نے لیگ کے اجلاس میں شرکت کر کے علی برادران کی رہائی کا مطالبہ پیش کیا۔اسی وقت اینی بیسنٹ کے''ہوم رول'' کی تحریک زور شور پر تھی اور پورے ہندوستان پر چھائی تھی ۔حکومت نے اس تحریک کے رہنماؤں کو جیلوں میں بند کرنا شروع کر دیا۔اس موضوع پر بہت سے شعراء نے اظہار خیال کیا۔چکبست نے اپنی نظم''وطن کا راگ''لکھی ۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

اہل وطن مبارک تم کو یہ بزم اعلیٰ
جس میں نئی امیدوں کا ہے نیا اجالا

دنیا کے مذہبوں سے یہ رنگ ہے نرالا
مسجد یہی ہے اپنی اور ہے یہی شوالا

ہو ہوم رول حاصل ارمان ہے تو یہ ہے
اب دین ہے تو یہ ہے ایمان ہے تو یہ ہے

پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے
خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے

جو سنتری در زنداں کے سو بھی جائیں گے
یہ راگ گا کے انہیں نیند سے جگائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

جوش ملیح آبادی یوں تو رومانی شاعر تھے۔حسن وعشق کے معاملات کو ان کی شاعری میں بنیادی حیثیت حاصل تھی لیکن ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات نے ان کو ملکی اور قومی مسائل کی طرف متوجہ کیا۔وطن سے محبت اور وطن پرستی کے جذبے نے ان کی شاعری میں ایک نیا رنگ بھر دیا۔وہ جس دور میں شاعری کر رہے تھے وہ ہندوستان کی تاریخ میں فرقہ ورانہ فسادات اور افلاس وغربت کا دور تھا جس کی خاص وجہ انگریزی حکومت کی بے اعتدالی اور ناانصافی تھی۔وہ اپنی پرجوش

آواز میں ان دونوں موضوع کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں ۔

آہ اے ہندوستاں اے مفلسوں کی سرزمیں
اس کُرّے پر کوئی تیرا پوچھنے والا نہیں

آہ اک دل بھی ترے افلاس پر ہلتا نہیں
اب تو اک روٹی کا ٹکڑا بھی تجھے ملتا نہیں

ہندو مسلم نہیں اٹھتے تری امداد پر
تف ہے ایسی بے حمیت نا خلف اولاد پر

ہائے کیا کرنا تھا ان کو اور کیا کرتے ہیں یہ
گائے اور باجے پہ لڑنے کے لئے مرتے ہیں یہ

اپنے عہد کی ہر ایک اہم تحریک اور ہر خاص واقعے کو انہوں نے نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ سائمن کمیشن 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، کیبنٹ مشن اور کرپس مشن کی آمد پر انہوں نے نظمیں کہیں اور اہل ملک کو حکومت برطانیہ کی چالوں سے خبردار کیا ہے۔ سائمن کمیشن کی آمد پر کہتے ہیں ۔

لگی ہے گھات مدت سے تری
فرنگی کی نگاہ جا و دانہ

عدو تیری گرفتاری کی خاطر
مہیا کر رہا ہے آب و دانہ

اگر جینا ہے آزادی سے تجھ کو
سنا دشمن کو پڑھ کر یہ ترانہ

بر و ایں دام بر مرغ دگر نہہ
کہ عنقادا بلند است آشیانہ

1935ء میں برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ کا اعلان کیا۔ برٹش حکمرانوں نے اس قانون کو لاگو کرنے کے لئے پہلی اپریل 1937ء کا دن منتخب کیا تھا۔ جوش نے ہندوستانیوں کو حکومت برطانیہ کی چال سے خبردار کرتے ہوئے کتنے طنزیہ انداز میں کہا ہے ۔

ہوشیار اہل ہند کہ پھر اس زمین پر
گردوں سے ایک تازہ بلا کا نزول ہے

ناداں اکڑ رہے ہیں کہ حاصل ہوا وفاق
دانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فول ہے

کیبنیٹ مشن کی آمد پر انہوں نے جو نظم کہی ہے اس میں نفرت بھی ہے اور ہدایت بھی۔

بہت ہی طاق ہیں طول امل میں اہل مشق
بلا کے تیز ہیں رد و بدل میں اہل مشق

وطن کو پیس رہے ہیں کھرل میں اہل مشق
چھری دبائے ہوئے ہیں بغل میں اہل مشق

شفیق بن کے مگر مسکرائے جاتے ہیں

اس کے علاوہ کرپس مشن کی آمد پر بھی انہوں نے اپنے غم و غصے کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔

بڑی کاریگری کے ساتھ شاطر نے تراشے ہیں
نئے دھوکے نئے حیلے، نئے چکمے نئے جھانسے

ہندوستان میں اس وقت جرمنی اور جاپان کی فوجوں کا مستقل اڈا بن جانے کا خطرہ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے حکومت نے ہندوستانیوں سے مفاہمت پیدا کرنے کے لئے سر اسٹیفورڈ کرپس کو آزادئ ہند کی ایک نئ اسکیم پیش کرنے کے لئے بھیجا۔ اس اسکیم میں کانگریس رہنماؤں کو قومی یکجہتی کے بجائے انتشار کے خطرے زیادہ نظر آرہے تھے اس لئے انہوں نے اس اسکیم کو نہ منظور کر دیا۔ سامراجیوں کے اس چکمے اور امن و آزادی کے ڈھونگ کا پردہ فاش کرتے

ہوئے جوش نے ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے'' مخاطب ہوکر کہا ۔

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوع انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے

دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں کے گڈھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم

ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی
یاد تو ہوگا تمہیں جلیانوالہ باغ بھی

ظلم بھولے ، راگنی انصاف کی گانے لگی
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے

خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

جوش کو شاعر شباب اور شاعر انقلاب دونوں ناموں سے جانا جاتا ہے ۔ایک وقت میں شاعر شباب اور شاعر انقلاب ہونا بھی جوش کا ہی کمال ہے ۔ ان کی شخصیت کا یہ تضاد ان کی پوری شاعری میں ملتا ہے ۔انہوں نے اپنی شعری مجموعوں کے نام بھی اسی طرح رکھے مثلاً ۔شعلہ وشبنم ،سیف وسبو، فکرونشاط ،آیات ونغمات ،سموم وصبا وغیرہ ۔سارے نام ایک دوسرے کی ضد پر ہیں اوران کی پوری

شاعری میں بھی یہی کیفیت ہے۔ وہ اپنے وقت کی پرزورآواز تھے اور پورا ملک جس سیاسی بیداری اورقومی جوش خروش سے دوچار ہورہا تھا، جوش کی شاعری اس کی فطری نقیب بن گئی۔ پروفیسر محمد حسن ان کے متعلق یہ اظہار خیال کرتے ہیں:

''جوش کی سیاسی نظموں میں وہ تندی، تیزی اور کاٹ ہے آواز چیخ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ وہ بار باران اداروں سے ٹکراتے ہیں جوان کی شخصیت کی تکمیل میں حائل ہوتے ہیں۔ ان کا احتجاج رومانی ہے اوراپنی ذات کی تکمیل اور جذبات وخواہشات کے حصول میں وہ کبھی مذہب کوللکارتے نظرآتے ہیں، کبھی رسم ورواج کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، کبھی سیاست کے ارباب اقتدار سے ٹکراتے ہیں۔ جوش کی انقلابی شاعری دراصل ان کی ذات کی توسیع ہے اوران کی رومانی شاعری ہی کا حصہ ہے۔ جوش کے ہاں بغاوت، خون بہانے کا نام ہے اورزندگی آویزش سے عبارت یہ اورایک سچے احتجاجی کی طرح وہ سمجھوتے کے بجائے آویزش کے علمبردار ہیں۔'' [1]

اس دورمیں غزل بھی اپنے شباب پرتھی ۔ جوشعراء انگریزی حکومت کے خلاف براہ راست اظہارنہیں کرسکتے تھے وہ غزل کے رمزوکنائے میں بھی احتجاج کی آواز بلندکررہے تھے۔ ایسے ہی شعراء میں جگرمرادآبادی کا نام بھی شامل ہے۔ جگرکا اگرچہ سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن وہ بھی محبّ وطن تھے اورانگریزوں کی غلامی سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اوراس کا اظہار اپنے کلام میں کچھ یوں کرتے ہیں۔

پرائے ہاتھ جینے کی ہوس کیا
نشیمن ہی نہیں تو پھر قفس کیا

ناز جس خاک وطن پر تھا مجھے آہ جگر
اسی جنت پہ جہنم کا گماں ہوتا ہے

ا (اردو ادب میں رومانوی تحریک، محمد حسن، 1999ء عاکف بک ڈپو دہلی ص: 116)

ظفرعلی خان نے بھی اپنے کلام کے ذریعے ہندوستانیوں کو آزاد فضا میں سانس لینے کا جذبہ فراہم کیا۔انہیں اپنے وطن سے والہانہ عشق تھا۔ان کی نظم ''ہندوستاں'' میں حب الوطنی اور ہندوستان کی عظمت اوراس سے محبت کا جذبہ ملاحظہ فرمائیں ۔

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے

تہذیب ہند کا نہیں چشمہ اگر ازل
یہ موج رنگ رنگ پھر آئی کہاں سے ہے

ذرے میں گر تڑپ ہے تو اس ارض پاک سے
سورج میں روشنی ہے تو اس آسماں سے ہے

دنیا بھر کے مسلمان ترکی کے سلطان کو خلیفہ تسلیم کرتے تھے۔مسلمانوں نے ترکی تباہی کے لئے خلافت کو ذمہ دار ٹھہرایا۔خلافت کے وقار کی حفاظت کے لئے مرکزی خلافت کمیٹی قائم کی گئی۔ گاندھی جی نے بھی اس میں شرکت کی اوراس کے ساتھ علی برادران (محمد علی،شوکت علی) بھی میدان میں اترے۔مشترکہ مقصد کے تحت ہندومسلمانوں کو متحد کرنے کے لئے اردوشعراء نے جوش سے بھرپور نظمیں کہیں اس میں ظفرعلی خاں بھی کہہ اٹھے۔

نئی اک قبا کو سلاتے ہوئے
خلافت کی بنیاد اکھیڑوگے تم

تو اچھی طرح سے سمجھ لو یہ بات
خود اپنے ہی بخیے ادھیڑوگے تم

بچا لوگے ہندوستان کو گر اگر
ذرا پاؤں اپنے سیکڑوگے تم

ظفر نے انقلاب کے نغمے بڑے جوشیلے اوردلکش انداز میں گائے ہیں۔1927 میں لکھی ہوئی نظم ''انقلاب اے انقلاب'' کے چنداشعار دیکھئے ۔

آرہی ہے باغ گیتی سے بہار انقلاب
کھب گیا آنکھوں میں رنگ لالہ زار انقلاب

قالب مشرق میں پھونکی جا رہی ہے روح نو
نغمہ ہائے قم سے ہے معمور تار انقلاب

جاں استعمار کھینچی جا رہی ہے ہند میں
کس بلا کا روح فرسا ہے فشار انقلاب

ظفرکوجن ملکی ، سیاسی اورسماجی واقعات اورحالات سے دست وگریباں ہونا پڑاان پرانہوں نے بے تکلف نظمیں لکھیں یہ نظمیں بیسویں صدی کے آغاز سے 1935 تک کے سیاسی وسماجی حالات کا احاطہ کرتی ہیں۔انہوں نے اپنے دور کی سیاست پر بڑے معنی خیز طنز کئے ہیں۔1919ء میں امرتسر میں کانگریس،مسلم لیگ اورخلافت کانفرنس کے اجلاس ہوئے جس میں رولٹ ایکٹ کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا۔عوام کے جوش وولولے کودبانے کے لئے جنرل ڈائرکی فوج نے نہتے مجمع پر گولی چلادی اورسیکڑوں بے گناہوں کوموت کے گھاٹ اتاردیا گیااوراس کے بعد مارشل لا نافذکردیا گیایہ حادثہ جلیانوالہ باغ حادثہ کے نام سے مشہورہے۔ظفرنے عوام کے جوش وخروش کی ترجمانی اس طرح کی ۔

حکومت جن دنوں پنجاب میں تھی مارشل لا
تو قابل دید تھی اڈوائر کی غضب ناکی

جب امرتسر میں ہم پر گولیاں برسائیں تو ہم سمجھے
کہ بوندیں ہیں یہ اہل ہند کے خون تمنا کی

خدا کے قہر کی بجلی گرا کرتی ہے ظالم پر
مگر پنجاب میں اس برق کے مظلوم تھے شاکی

ظفرعلی خاں کے متعلق ڈاکٹراشفاق حسین فرماتے ہیں:

’’مولاناظفرعلی خان اس وقفے کے ایک مشہورصحافی ، نثاراور شاعر

رہے ہیں۔روزنامہ ''زمیندار'' لاہور کے ایڈیٹر تھے اوران سب سے
بڑھ کراس امتیاز کے مالک تھے کہ وہ سیاسی تحریکات میں سرگرمی سے
حصہ لیتے تھے۔ان کی نظموں میں ان کے سیاسی تجربات اوران کے
فطری جذبات نمایاں ہیں۔ان کے یہ جذبات حکام وقت کی
زیادتیوں ،تشدد،غریب طبقے کی بدحالیوں، پریشانیوں، ہوم رول سے
لے کرمکمل حریت کی خواہش ،علمائے وقت کی بے حسی مطلب پرستی
اورفرقہ وارانہ اختلافات وغیرہ کے گردحرکت کرتے ہیں۔'' [۱]

ظفرعلی خاں نے سول نافرمانی کی تحریک کوبھی شاعری کا موضوع منتخب کیااوراس پربھی نظم کہی۔1922ء میں گاندھی جی نے ستیہ گرہ کی تحریک چلائی تھی اس پربھی ایک نظم کہی جس کا عنوان ''اعلان جنگ'' ہے ۔

گاندھی جی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا
باطل سے حق کو دست و گریبان کر دیا

ہندوستاں میں ایک نئی روح پھونک کر
آزادئ حیات کا سامان کر دیا

دشمن میں اور دوست میں ہونے لگی تمیز
کتنا بڑا یہ ملک پہ احسان کردیا

ان کی ایسی لاتعداد نظمیں ہیں جن میں انہوں نے وطن پرستی کا ثبوت دیاہے اورانگریزوں کے خلاف سخت احتجاج کیاہے۔

قومی اوروطنی شاعری کے مشہورشعرا میں ایک اہم نام سیماب اکبرآبادی کا ہے۔انہوں نے نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی سیاسی اورسماجی مسائل کوشامل کرکے اس کے مرتبے کواور بلند کردیا۔انہوں نے یہ اعلان کیا کہ ۔

---

۱ (اردوشاعری میں سوشلسٹ رجحانات ،اشفاق حسین، 1986ء اسرارکریمی پریس الہ آباد ص:63)

میں غفلت میں سونے والوں کی نیند اڑانے آیا ہوں
دنیا کو جگا کر چھوڑوں گا دنیا کو جگانے آیا ہوں

بلا سے خون چھڑکنا پڑے ہمیں اپنا
مگر شگفت نظر صبح لالہ زار رہے

میں پیامی ہوں تمہارے ملک آزاد کا
روح آزادی ہے ہر ٹکڑا مری روداد کا

26 رجنوری 1930ء کو جب کانگریس کی ہدایت پر پورے ملک میں یوم آزادی پورے جوش وخروش کے ساتھ منائی گئی تو سیماب نے اس منظر کا نقشہ اس الفاظ میں کھینچا ۔

جدھر دیکھو ادھر دور زباں ہے یوم آزادی
طرب افزائے ہر پیرو جواں ہے یوم آزادی

کانگریس کی وزارتوں کے قائم ہونے پہ انھوں نے اپنے جذبات اوراحساسات کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ۔

اب ہے نیا نظام — اب ہے نئی صبح و شام
پھینک ہی دیں توڑ کر — بیڑیاں ہم نے تمام
شاد ہیں آزاد ہیں — اب ہیں کہاں ہم غلام
زندہ باد اضطراب زندہ باد — انقلاب زندہ باد

اہل ملک کو غلامی کے طوق وسلاسل توڑنے کا درس انھوں نے اپنی متعدد نظموں میں دیا ہے جن میں ''اے جوانان وطن''، ''اے وطن وائے وطن''، ''اے ایران وطن''، ''خواتین وطن'' ''پیام فردا''، ''میرا وطن''، ''اے ہندوستاں''، ''جاگ اے ہندوستاں'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔
سیماب اکبرآبادی کی شخصیت کے سلسلے میں مشہور ومعروف فکشن نگار کرشن چندر کہتے ہیں:

''علامہ سیماب جامع صفات تھے۔غزل اورنظم دونوں پرقدرت رکھتے تھے۔اوردونوں اصناف سخن میں انھوں نے اپنے عہد میں غیرمعمولی

شہرت پائی۔سیماب کا زمانہ زبردست سیاسی تحریکوں کا زمانہ تھا۔
سیماب نے بڑے پرجوش انداز میں اپنی قوم کو جگایا۔" [1]

ملکی اور سیاسی موضوعات پر بے شمار نظمیں تلوک چند محروم نے بھی کہی ہیں۔ان کی پہلی سیاسی نظم "چڑیا کی آزادی" تھی جو "زمانہ" میں شائع ہوئی تھی۔جدوجہد آزادی کے قافلے کو آگے بڑھانے کے لئے انہوں نے بھی شاعری کا سہارا لیا۔ان کی سیاسی نظموں میں "مقاومت مجہول" "سودیشی"، "تحریک"، "پھول برساؤ"، "ہندی نوجوانوں سے"، "آزاد ہندفوج"، "جے ہند" "آزادی" وغیرہ نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔ان کی قومی اور سیاسی نظموں کا مجموعہ "کاروان وطن" ہے۔اس کے علاوہ "کلام محروم حصہ دوم" بھی قومی اور ملی منظومات پر مشتمل ہے۔ان کا عقیدہ تھا کہ ؎

وابستہ جیسے جان گرامی ہے تن کے ساتھ
ہر قوم کا وجود ہے اپنے وطن کے ساتھ

حریت پسندوں کے حوصلے کو بڑھانے کے لئے انہوں نے پیغام عمل بھی دیا ؎

وہ سامنے آزادیٔ کامل کا نشاں ہے
مقصود وہی ہے وہی منزل کا نشاں ہے
درکار ہے ہمت کا سیارہ کوئی دم اور دو چار قدم اور

محمد علی جوہر نے بھی اپنی شاعری سے غلامی کے بندھنوں کو توڑنے کے لئے اہل وطن کو جھنجھوڑ کر جگایا ہے اور ان کے سیاسی شعور کو بیدار کر کے انہیں جنگ آزادی میں شامل ہونے کی ترغیب دی ہے۔برطانوی ارباب اقتدار کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں ؎

نہیں پالا پڑا قاتل تجھے ہم سخت جانوں سے
ذرا ہم بھی تو دیکھیں تیری جلادی کہاں تک ہے

ملک کے لئے اسیر ہونا ان کی نظر میں قابل فخر ہے۔شرمناک بات تو وہ طوق غلامی ہے جس کی اذیتیں تمام اہل ملک کے لئے ناقابل برداشت تھیں ؎

---

[1] (شاعر، جلد 47شمارہ 5-4-1976ء ممبئی ص:13)

قید ہے قید غلامی دو برس کی قید کیا
دیکھ کب ہو خاتمہ اس قید بے معیار کا

ان کی سیاسی نظریات کی حامل اہم نظمیں ''روسحر''، ''کام کرنا ہی ہے''، ''آشیاں برباد'' ''خوگر ستم''، ''شان کلکتہ'' اور ''فغاں دہلی'' وغیرہ ہیں۔

غلامی اور محکومی کے احساس کی ترجمانی اور زنجیر غلامی توڑ ڈالنے کی تلقین حفیظ جالندھری کے کلام میں بھی جابجا نظر آتی ہے۔مثال کے لئے صرف ایک ہی شعر پیش ہے۔

معرکہ آراؤ ، یاں آگے بڑھو بڑھتے چلو
غاصبوں پر تند شیروں کی طرح چڑھتے چلو

رومان پرست شاعر ہونے کے باوجود اختر شیرانی نے کافی تعداد میں سیاسی نظمیں کہیں ہیں جو جذبۂ حب الوطنی اور قوم پرستی سے معمور ہیں۔اگرچہ اختر شیرانی کی تمام کائنات حسن وعشق ہے جس پر وہ اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں لیکن جب بات آزادی کی آتی ہے تو حسن وعشق کے موضوعات مدھم پڑ جاتے ہیں اور بے معنی ہوجاتے ہیں بس آزادی کی شمع روشن ہوجاتی ہے جس پر وہ اپنا سب کچھ قربان کردیتے ہیں۔

عشق و آزادی بہار زیست کا عنوان ہے
عشق میری جان آزادی میرا ایمان ہے

عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

چنانچہ انہوں نے اس بیش قیمت شے کے حصول کے لئے اہل وطن کو پیغام عمل بھی دیا ہے۔

اٹھاؤ تیغ بے اماں — وطن کے پاک نام پر
لٹا دو عمر نوجوانوں — وطن کے پاک نام پر
نثار کردو اپنی جاں — وطن کے پاک نام پر
صدائیں دیتا ہے وطن — بڑھے چلو بڑھے چلو

دلاوران تیغ زن بڑھے چلو بڑھے چلو
بہادران صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو

مذکورہ بالاشعراء اوران کے قومی،اوروطنی جذبات انگریزوں کے خلاف احتجاج سے اس دور کے سیاسی ،سماجی حالات کے متعلق کافی معلومات ہوتی ہے۔ان شعراء نے حالی اورآزاد کی روایت کواپنا کراس میں مزیداضافہ کردیااورحریت پسندی اورجوش ولولے سے پورے ملک میں انقلاب لے آئے جوآزادی کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئی اوریہ کام ان کی مزاحمتی واحتجاجی شاعری کے باعث ممکن ہوسکا۔اس طرح شاعری نے ہردور کے حالات کوپیش کرنے کی کامیاب کوشش کی اوروقت اورحالات کے ساتھ خودکونئے سانچے میں ڈھالتی چلی گئی۔

باب سوم

ترقی پسند تحریک اور اردوشاعری:

- ☆ ترقی پسند تحریک (آغاز وارتقا)
- ☆ ترقی پسند تحریک اوراردوشاعری
- ☆ ترقی پسند شعرااوران کی مزاحمتی ،احتجاجی اورانقلابی شاعری کامختصر جائزہ

ترقی پسند تحریک (آغاز وارتقاء)

تغیر ایک فطری عمل ہے۔ کہتے ہیں دنیا میں ہر چیز ساکت وجامد ہے لیکن اس کی حرکات و سکنات کے باعث تغیر کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ تغیر مثبت بھی ہو سکتے ہیں اور منفی بھی اور بعض اوقات ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تغیر کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ یہ اپنے ساتھ نئی تہذیب وتمدن کو لے کر آتا ہے اب اس نئے پن کو قدیم روایت کس نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے اوراس کے اثرات کوکتنا (observe) کرتی ہے یہ تو اس کی کامیابی پہ منحصر ہے۔ تغیر کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والا ''وقت'' ہے، بغیر وقت کے تغیر کا وجود ناممکن ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ وقت ہمیشہ تغیر پذیر ہے اور یہ اس کی ایک خصوصیت ہے۔ وقت خواہ اچھا ہو یا برا، گزر ہی جاتا ہے، یہ کبھی یکساں نہیں رہتا، تبدیلی ہی اس کی شناخت ہے جس کے تحت وہ نئے تغیرات کو جنم دیتا ہے۔ اس طرح پرانی قدریں آہستہ آہستہ ضم ہوتی جاتی ہیں، اوران کی جگہ نئی قدریں متمکن ہو جاتی ہیں۔ وقت کی تغیر آفرینی کے ساتھ انسان کے جسمانی عضو بھی تبدیل ہوتے گئے اور ضرورت کے تحت نئی شکل اختیار کرتے چلے گئے ساتھ انسانی فکر بھی تبدیل ہوتی گئی۔ اس طرح انسانی فکر پر وقت کی تغیر آفرینی کے اثرات انتہائی روشن ہیں۔

تغیر زندگی کے ہر گوشے میں کارفرما ہے اس کا مطلب ہے کہ دنیا کی ہر شے کے لیے یہ لازم ہے۔ جہاں فکر کی بات آتی ہے وہاں ادب بھی ساتھ چلتا ہے۔ ادب میں بھی تغیر لازمی ہے کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور جب زندگی میں تبدیلی آتی ہے تو ادب خود ہی متاثر ہوتا ہے جس کے تحت اس میں شامل تحریکیں ادب کو متحرک اور تغیر پذیر بناتی ہیں جو کہ کسی ادب کی خیر خواہی کے لئے ہوتا ہے۔ کیونکہ زمانے کے ساتھ انسانی فکر اور تہذیب تبدیلی کی خواہاں ہوتی ہے جس کے زیر اثر نئی فکریں اور نئی تہذیبیں اپنی جڑیں قائم کرتی ہیں۔ یہ تو قدرت کا ایک فطری عمل ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ترقی پسند تحریک بھی اسی متغیر زمانے کی ایک اہم ضرورت تھی جس نے وقت کے ساتھ اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی۔ جدیدیت ایک مسلسل سماجی پروسس ہے جو انسانی معاشرے کی

نشو ونما کے ساتھ ہمیشہ سے جاری وساری ہے اس لئے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ لیکن جب جب جدیدیت کی ضرورت محسوس ہوئی تب تب اس کا خیر مقدم تو کیا گیا ہی لیکن ساتھ ساتھ اس کی مخالفت بھی جم کر ہوئی۔ یہ عام انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے قدیم سرمایے کو بھی کمتر نہیں سمجھتا اور اسے جدیدیت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن اس میں کچھ ایسے دانشور اور عقلمند لوگ بھی ہیں جن کی نگاہ دوررس نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ادب میں تبدیلی کی ضرورت ہے جو وقت کی تغیر آفرینی کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔ جناب اختر حسین رائے پوری اپنے معرکہ آرا مضمون ''ادب اور زندگی'' میں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''ادیب اپنی جذباتی کیفیات کو الفاظ کا جامہ پہناتا اور اپنی افتاد طبیعت کے مطابق اس کی کاٹ چھانٹ کرتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ادب جذبات کی بولتی ہوئی تصویر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جذبات کی ترتیب وتکوین کس طرح ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر جذبہ گردوپیش کا مطیع ہے اورحالات کے مطابق جذبات بدلتے رہتے ہیں۔ فضا کا ہیر پھیر کبھی آدمی کو رلاتااور کبھی ہنساتا، کبھی آزردہ کرتااور کبھی غضبناک بنادیتاہے۔ مثلاً موت اوربھوک کے مسائل ہمیشہ آدمی کو خون کے آنسو رلاتے رہے ہیں، ایک کے لئے قدرت، دوسرے کے لئے سماج ذمہ دار ہے اگر یہ دو مصیبتیں نہ ہوں تو ہمارے ادیب کی جزئیت بہت کم ہوجائے گی اور پھر فراق یاد کے علاوہ بہت کم چیزیں اسے رنج دیا کریں گی۔ اگرسماج اورقدرت کے نظام میں ایسی تبدیلی ہو کہ یہ فضابدل جائے تو ایسے جذبات بھی پیدا نہ ہوں گے۔'' [۱]

کسی بھی تحریک کا مطالعہ اس وقت تک نامکمل رہتا ہے جب تک اس کے پس منظر کا مطالعہ نہ کیا جائے کیونکہ کوئی بھی تحریک جب پروان چڑھتی ہے تو اس کے پیچھے سماجی اورتاریخی تبدیلیاں کارفرما ہوتی ہیں۔ ترقی پسند تحریک بھی ان میں سے ایک ہے۔ جب تک ہندوستانی سماج اوران کی

---

۱ (ادب اور انقلاب ، اختر حسین رائے پوری، 1943ء، ادارۂ اشاعت اردو حیدر آباد ص: 17-16)

تاریخی تبدیلیوں کا مطالعہ نہ کیا جائے گا تب تک اس کے اصل مقصد تک رسائی نہیں ہوسکتی ۔اس سے پہلے بھی ہندوستان میں بہت سی تحریکیں عدم وجود میں آئیں جو وقت کا تقاضا تھیں۔اس میں شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ،راجہ رام موہن رائے اور کیشپ چندرسین کی تحریکیں،سرسید کی علی گڑھ تحریک ۔بعض دوسری اصلاحی تحریکوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کس قدر تبدیلی کے دور سے گزر رہا تھا۔لارڈ میکالے نے تعلیم کا جو نیا نظام قائم کیا تھا اس سے ہندوستانیوں کا صرف نقصان ہی نہیں تھا بلکہ کچھ فائدے بھی تھے جس سے پہلے وہ انجان تھے لیکن جلد ہی منفی اثرات کے ساتھ مثبت پہلوؤں پر بھی غور کیا گیا جس سے انگریزی تعلیم کے ذریعے جمہوری خیالات کوفروغ ملا اور اس سے استفادہ کر کے بہت سے لوگ وکیل ،ڈاکٹر اوراستاد کے عہدے پر فائز ہوئے اوراس طرح ان کی توجہ جمہوریت اورشہری حقوق کی جانب مبذول ہونا شروع ہوگئی۔

ترقی پسند تحریک کے لئے معاشی حالات بھی ذمہ دار تھے۔تجارت کوفروغ دینے سے نئے نئے شہر آباد ہونے لگے ۔ان شہروں کے آباد ہونے سے جاگیرداروں کولگان زیادہ ملنے لگا۔تاجروں کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھتے ہوئے ان پر پابندی عائد کی گئی جس سے جاگیرداروں اورتاجروں کے درمیان کشمکش پیدا ہونے لگی ۔ان تاجروں نے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے صنعتوں کوفروغ دیا جس کی ترقی سے سرمایہ دارطبقہ وجود میں آیا۔اوراس طرح ذرائع پیداوار میں زیادہ ترقی ہو جانے سے دو اہم طبقے نمودار ہوئے ۔ پہلا طبقہ سرمایہ داروں کا اور دوسرا طبقہ مزدوروں کا۔مزدور اپنی صنعت سے ذرائع پیداوار میں اضافہ کرتا ہے۔ ذرائع پیداوارسرمایہ داروں کی ملکیت ہوتی ہے اس کا منافع صرف ان ہی لوگوں کو ملتا ہے اورمحنت کش طبقے کا استحصال ہوتا ہے ان کی حیثیت محض اجرتی غلام کی سی رہتی ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں نے تقریباً دوسوسال تک تجارت اورصنعت میں دخل اندازی کی اوراس سے استفادہ بھی کیا۔جدید آلات اور ترقی یافتہ مشینوں سے یہاں کی گھریلو صنعت تباہ ہوگئی ۔دستکاروں اورمزدوروں کواقتصادی تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ادیب ودانشور سجاد ظہیر ان کیفیات کا ذکراس انداز میں کرتے ہیں:

''انگریزوں کے معاشی اورسیاسی غلبے کی وجہ سے ہندوستانی سماج کی

اس معشیت کا تاروپود بکھر گیا جس پر ہماری تہذیب کی بنیاد تھی۔
جا گیرداری، خود کفیل دیہاتوں اور دست کاری کی صنعتوں کی ساکن
معشیت کی جگہ نوآبادیاتی یا سامراجی محکومیت کی معشیت نے لے لی۔
اس کے معنی یہ ہیں کہ اول تو ہمارا ملک برطانیہ کی جدید بڑی مشینوں
کے بنے ہوئے صنعتی مال کی منڈی بن گیا۔ دوسرے ہماری دستکاری
کی صنعت انگریزی صنعت کے بنے ہوئے سستے مال کے مقابلے کی
تاب نہ لا کر بالکل تباہ ہوگئی یا زوال پذیر ہوگئی۔ تیسرے ہماری زرعی
پیداوار کی قیمت گر گئی اور ہم برطانیہ کے کارخانوں کے لئے سستے
داموں اپنی خام پیداوار بیچنے کے لئے مجبور ہو گئے۔'' [1]

یہ وقت ہندوستان کے لئے قیامت سے کم نہ تھا۔ تمام عالم میں عذاب کی سی کیفیت تھی۔ بھوک اور افلاس برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ ہر جگہ کسی نہ کسی پر کوئی نہ کوئی مسلط تھا۔ اگر یورپ میں فاشزم کا قہر تھا تو روس میں زار (zar) کا اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کا۔ اس کے ساتھ ساتھ پہلی جنگ عظیم (1914-1918) نے پوری دنیا میں ہنگامہ مچا رکھا تھا۔ اس جنگ نے انسان کو درندہ بنا دیا تھا۔ اقتصادی بحران نے کمر توڑ دی تھی۔ اس کیفیت میں امیر اپنی امیری میں مست تھے اور غریب اپنی غریبی سے پست۔ اس سلسلے میں تاراچند کا خیال ہے:

''غریبوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اور غریب اور زیادہ غریب ہو
گئے اور دولت مند اور زیادہ دولت مند ہو گئے اور ان کی تعداد بھی
بڑھ گئی۔'' [2]

ایسے میں اگر کوئی دولت مند ان بھوکے مظلوموں سے ہمدردی بھی دکھاتے تو وہ اسے ظاہر نہ کر سکتے تھے، انہوں نے اس کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا اور ان کی آواز حکومت تک نہ پہنچ سکی اور نہ ہی پہنچ سکتی تھی کیونکہ انہیں خود ہی لٹ جانے کا خوف تھا۔ ایسے میں انسان دوستی اور انسانی اقدار کو ظاہر کرنے کے لئے ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور دانشوروں کی ضرورت تھی جو سرمایہ و دولت

---

[1] (روشنائی۔ سجاد ظہیر۔ 2006۔ پرائم ٹائم پبلی کیشنز لاہور۔ ص: 67)

نہیں بلکہ علم وآگہی رکھتے تھے۔انہیں اس بات کا خوف بھی نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ آزادخیال ہوتے تھے ،انہیں انسانی دکھ درد کا احساس تھا ایسے میں ایک واضح نظریہ بے حدلازمی تھا جوظالم اورمظلوم کے مابین طبقاتی اورنظریاتی کشمکش کی عکاسی کرتا ہے۔یہ کام کسی مخصوص مذہب کے ذریعے بھی ناممکن تھا اس لئے اس دورمیں مارکسزم یااشتراکیت کا نظریہ سب سے بہتر ثابت ہوا۔اس نظریے کے تحت سرمایہ داراورمزدوردونوں طبقوں کے درمیان چلی آرہی طبقاتی کشمکش کا خاتمہ ہوجاتا ہے اورمحنت کش طبقے کی آمریت قائم ہوجاتی ہے۔

دراصل اب متوسط طبقے میں نیاشعور پیدا ہونے لگا تھا۔انگریزی زبان اورمغربی علوم کا ہندوستان میں فروغ،اخبارنویسی،پریس،ریلوے اورٹیلی گراف کی سہولتیں،ان تمام اسباب نے ہندوستان میں سیاسی اورذہنی بیداری کوجنم دیا۔1857ء بغاوت ناکام ضرورتھی مگروطن پرستی کے جذبے سے بھرپورتھی جس میں قومیت کی دھندلی سی جھلک نظرآرہی تھی۔نئی تعلیم کے زیراثر ہندوستانیوں کے بدلتے ہوئے ذہن نے قومیت کے جدیدتصور کی تشکیل کرلی تھی اوران کوبیرونی اقتداراوراپنے معاشی وتہذیبی استحصال کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ایسے میں ایک انگریزآفیسراین او کیٹوین ہیوم جو انڈین نیشنل کانگریس کے اصل بانی تھے، انہوں نے ہندستانیوں کے حقوق کے لئے کچھ اہم قدم اٹھائے ۔انہیں ہندوستانیوں سے ہمدردی تھی انہوں نے اپنے دورملازمت میں زراعتی اصلاح کی تجویزپیش کی۔ہیوم نے ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کوایک انجمن بنانے کا مشورہ دیااوریہ بھی تجویزدی کہ اس قیام میں بیرونی لوگوں پربھروسہ نہیں کرنا چاہیئے اوراس میں ہندوستانیوں کوآگے بڑھنا چاہیئے۔ان کا یہ کہنا تھا کہ ہندوستانیوں کی یہ انجمن نہ صرف سماجی اوراقتصادی مقاصد کے حصول کے لئے کام کرے گی بلکہ یہ حکومت کے کاموں پربھی کڑی نظررکھے گی جس سے حکومت نظام بہتر ہوسکے۔ان مقاصد کے پیش نظرممبئی میں28/دسمبرتا30/دسمبر1885ء میں ہندوستانی رہنماؤں کا پہلاجلسہ منعقدکیا گیا۔اس جماعت کا نام شروع میں انڈین نیشنل تجویزکیا گیامگربعدکو طے پایا کہ اس کا نام انڈین نیشنل کانگریس رکھا جائے۔جلسے کی صدارت کے فرائض ڈبلوسی بنرجی (W.C.Banerji)نے انجام دی۔ہیوم کوکانگریس کا سکریٹری مقررکیا گیا۔اس وقت اس

کانگریس کوصرف ایک انگریز ہی قائم کرسکتا تھا کیونکہ برطانوی حکومت ہندوستانیوں کواس طرح کی جماعت قائم کرنے کی کبھی اجازت نہیں دیتی۔ ہیوم نے یہ جماعت ہندوستانیوں کے اقتصادی اور سماجی حالات کوبہتر بنانے کے لئے قائم کی تھی نہ کہ سیاسی مقاصد یا ملک کوآزادکرانے کے لئے۔ ہیوم کے خیال میں اس کوقائم کرنے کے تین مقاصد تھے جومندرجہ ذیل ہیں:

> ''پہلامقصد یہ ان تمام مختلف عناصرکوجن پر ہندوستان کی آبادی مشتعل ہے ایک قومی دھارے پرلانا، دوسرا یہ کہ روحانی اخلاقی، سماجی اورسیاسی خطوط پراس قوم کی بتدریج حیات نوجو اس طرح بنائی گئی ہواورتیسرا یہ ہے کہ ان شرائط میں جوغیرمنصفانہ اورغیرمفید ہوں تبدیلی کرکے ہندوستان اورانگلستان کے درمیان یونین کومستحکم بنانا۔'' [1]

کانگریس کےمختلف اجلاس کے باعث ہندوستانیوں میں قومی آزادی کا جذبہ بے دارہونے لگا تھا لیکن اس تحریک میں دومتضادنقطہ ہائے نظرکی بنیاد پڑگئی۔ایک اعتدال پسنداوردوسراانتہا پسند۔ اعتدال پسندگروہ صلح وآشتی کے ساتھ حکومت کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرنا چاہتا تھا لیکن دوسرا گروہ اس کے برعکس جوش وخروش اور باغیانہ جذبے کا نمائندہ تھا۔ان کو''نرم دَل'اورگرم دَل'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔نرم دل میں سریندرناتھ بنرجی۔جسٹس گوڈندمہادیورانا ڈے، دادا بھائی نوروجی، فیروزشاہ مہتا اورسب سے زیادہ مقبول گوپال کرشن گوکھلے شامل تھے۔گرم دل میں آربندگھوش، پیندرچندرپال اورلالہ لاجپت رائے تھے اوران کے سب سے بڑے سرغنہ بال گنگا دھر تلک تھے۔ان لوگوں کا خیال تھا، سامراج کو جلد سے جلدانگریزوں کے چنگل سے چھٹکارادلا سکے۔1908ء میں تلک کوایک انقلابی مضمون لکھنے کے جرم میں قیدکی سزادی گئی ان کی گرفتاری پر بمبئی کے سوتی کارخانوں کے مزدوروں نے زبردست ہڑتال کی۔1905ء میں بنگال کی تقسیم نے ہندوستانیوں کے زخموں پرنمک چھڑکنے کا کام کیا۔لارڈکرزن جواس وقت وائس رائے تھا اس نے نظامی سہولت کے پیش نظر بنگال کو دوصوبوں میں تقسیم کردیا۔اس کے علاوہ بنگال میں قومی جذبہ بھی

---

[1] (تاریخ تحریک آزادی ہند۔جلد دوم۔تاراچند،مترجم غلام ربانی تاباں۔2001۔قومی کونسل برائے فروغ

ابھر رہا تھا اس لئے اس نے اپنے نئے منصوبے میں بنگال کی تقسیم اس طرح کی کہ ہندو اور مسلمانوں میں تفریق پیدا ہو جائے ۔ بنگال کی تقسیم پر کانگریس کے رہنماؤں نے بنگال میں سودیشی تحریک شروع کردی۔عوام نے تمام انگریزی کپڑے اور تمام انگریزی چیزوں کے بائیکاٹ کا نعرہ لگایا۔طلبہ نے انگریزی کلاسوں کا بائیکاٹ کیا، بیماروں نے انگریزی دواؤں کا استعمال چھوڑ دیا۔اس وقت پوری دنیا کی کیفیت سجاد ظہیر کی زبانی سماعت فرمائیں:

> ''اس زمانے میں ایشیائی اقوام میں سامراج دشمنی اور جمہوریت کی تحریکیں اٹھیں۔روسی سامراجیوں کی جاپان کے ہاتھوں شکست ،پہلا انقلاب روس(1917)ایران میں سامراجیوں اور مطلق العنان بادشاہت کے خلاف آزادی اور مشروط (کانسٹی ٹیوشن) کی تحریک، مصر اور سوڈان میں انگریزوں کے خلاف بغاوتیں،ترکی سلطنت کے حصے بخرے کرنے کے لئے انگریز، فرانسیسی اور روسی سامراجیوں کی چھیڑی ہوئی جنگیں،ایشیائی عوام کے دلوں میں زبردست سامراج دشمن ہیجان پیدا کررہی تھی۔ ہندوستان میں بھی قومی تحریک اعتدال پسندی کے دائرے سے نکل رہی تھی۔ سامراجیوں کے خلاف بم اور پستول استعمال ہونے لگے تھے۔''[1]

1914ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی جس نے پوری دنیا میں افراتفری مچادی تھی۔جگہ جگہ قتل وغارت گری نے ملک میں کہرام مچا رکھا تھا۔اس میں کانگریس کے اعتدال پسندوں نے حکومت برطانیہ سے تعاون اور وفاداری کا منصوبہ تیار کیا۔1918ء میں جنگ کے اختتام پر دہلی میں کانگریس کا جلسہ ہوا جس میں حکومت کو کامیابی کی مبارک باد دی گئی۔گاندھی جی کو یقین تھا کہ ان کے اس رویے سے برطانوی حکمرانوں کا نظریہ ہندوستانیوں کی طرف سے بدل جائے گا لیکن ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔1917ء میں گاندھی جی نے ستیہ گرہ تحریک شروع کی۔کسانوں کو متحد کر کے حکومت سے ان کے حقوق کا مطالبہ کیا۔حکومت کو ان کا مطالبہ قبول کرنا پڑا۔ یہ گاندھی جی کی ستیہ گرہ

---

[1] (روشنائی ۔سجاد ظہیر ۔2006، پرائم ٹائم پبلی کیشنز لاہور ،ص :76)

تحریک کی پہلی کامیابی تھی۔اس کے بعد احمد آباد میں بھی گاندھی جی کپڑے کے کارخانے کے مزدوروں کے لئے ستیہ گرہ تحریک چلائی۔ ہرطرف ہڑتالیں کیں اوراس میں بھی انہیں کامیابی ملی۔لیکن اسی زمانے میں ایک دردناک حادثہ بھی ہوگیا جوجلیانوالہ باغ سانحہ کے نام سے مشہور ہے۔ 13/ اپریل 1919ء کوجلیانوالہ باغ میں ایک عام جلسے کا اعلان کیا گیا جونہی جلسہ شروع ہوا جنرل ڈائر فوج کے ساتھ آئے اور نہتے ہندوستانیوں پر گولیوں کی بوچھار کردی۔اس سے ہندوستانیوں کے دل میں اور بھی غم وغصہ پیدا ہوگیا۔گاندھی جی کی نگرانی میں ایسی بہت سی تحریکیں چلائی گئیں جن میں سے اکثر کامیاب بھی ہوئیں اوراگر ناکامی بھی ملتی تھی تو گاندھی جی اس کا کوئی نہ کوئی حل نکالتے تھے۔ یہ قول ان کی شخصیت کی وضاحت کرتا ہے:

> ’’ گاندھی جی نے ہندوستانیوں کومشورہ دیا کہ وہ انگلیوں کے نشانات کا اندراج نہ کرائیں اورعدم تشدد کی ایک طویل جنگ کے لئے تیارہوجائیں۔جیل جائیں اوراگرضرورت پڑے تو جان دے دیں لیکن اس غیرمنصفانہ قانون کے آگے سر نہ جھکائیں۔انہوں نے کہا کہ ’’ میں چاہتاہوں کہ تم موت کا خوف دل سے نکال دو۔تکلیفیں برداشت کرنے کے لئے تم تیاررہنا بےانصافیوں کوختم کرنے کا فوری اور بہترین علاج ہے۔‘‘ [1]

1917ء میں روس میں زبردست انقلاب آچکا تھا جس نے زارشاہی کا تختہ الٹ کرسارے ایشیا کی محکومی قوموں میں آزادی کی ایک نئی لہر دوڑادی تھی۔وسطی ایشیا کی قوموں نے روسی سامراجیوں کا جوا اتارکر پھینک دیا تھا۔ایران اورترکی روس کے انقلابی مزدوراورکسان،حکومت کی مدداورحمایت حاصل کر کے انگریز سامراجیوں کواپنے اپنے ملکوں سے نکال رہے تھے۔اس کی لہر ہندوستان تک پہنچ چکی تھی اورلوگ اشتراکیت اورعوامی حکومت کا خواب دیکھنے لگے تھے۔ایسے میں دانشوروں نے جس میں ادیب،فنکار،شاعرغرض کہ ہراہل شعورشامل تھے،اوریہ محسوس کیا کہ ان کا علم و ہنرتب تک کسی وقعت کا حامل نہیں ہوسکتا جب تک وہ انسانی فلاح وبہبود کے کام نہ آسکے۔

---

[1] (گاندھی جی کے مختلف روپ [illegible] مترجم اختر فاروقی 2011 قومی کونسل برائے فروغ

جولائی 1935ء فرانس کے شہر پیرس میں کلچر کے تحفظ کے لئے ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ یہ کانفرنس اب تک کی سبھی کانفرنسوں میں سب سے زیادہ اہم تھی کیونکہ اس میں پہلی بار ادیبوں سے عملی اور انقلابی ادب تخلیق کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ اس کانفرنس کو منعقد کرنے کا سارا دارومدار فرانسیسی ادیب ہنری باربس کے سر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کانفرنس کو کامیاب کرنے میں میکسم گورکی، روماں روداں، آندرے مارلو، ٹامس مان، آئی ایم فوسٹر اور والڈو فرینک وغیرہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ جلسہ پیرس کے مشہور ہال ''بال بولیے'' میں منعقد کیا گیا۔ اس میں شامل ہر ادیب مختلف فکر کے حامی تھے مگر سب اسی بات پر متفق تھے کہ فاشزم اور سرمایہ داروں اور اقتدار پرستوں کے ظلم سے کلچر اور اپنی تہذیب اور انسانیت کو بچانا ہے۔ سبھی ادیبوں اور شاعروں، فنکاروں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنا علم، اپنا فن، اپنا سب کچھ انسانیت کی خدمت میں وقف کر دیں۔ اس کانفرنس میں پہلی بار مصنفوں اور ادیبوں کی انجمن بنائی گئی جسے انٹرنیشنل رائٹرس ایسوسی ایشن (International Writers Association) کا نام دیا گیا۔ پیرس کی اس کانفرنس نے دوسرے ملکوں میں بھی ترقی پسند تحریک کے آغاز کو تقویت بخشی۔ ہندوستانی انجمن ترقی پسند مصنفین جو کہ پہلے ہی قائم ہو چکی تھی اس نے اپنے کو اس عالمی انجمن سے وابستہ کر لیا۔

ہندوستان سے یورپ گئے ہوئے کچھ نوجوان وہاں کی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم تھے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد جو دنیاوی حالات پیدا ہو رہے تھے اور دوسری عالمی جنگ کے بادل سر پر منڈلا رہے تھے ایسے میں پورا یورپ کشمکش اور تذبذب کے درمیان سانس لے رہا تھا۔ اس لئے ان طالب علموں کا وہاں کے ہونے والے حادثات اور سانحات سے بہ خوبی واقف ہونا لازمی تھا۔ ان طالب علموں میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، محمد دین تاثیر، پرمود سین گپتا اور جیوتی گھوش وغیرہ تھے۔ یہ سبھی سجاد ظہیر کے کمرے میں ایک چھوٹا سا حلقہ بنا کر بیٹھنے لگے اور ادبی، سیاسی اور سماجی گفتگو کرتے۔ اس حلقے نے دھیرے دھیرے انجمن کی شکل اختیار کر لی۔ اس سلسلے میں جناب خلیل لرحمان اعظمی رقم طراز ہیں:

'' ان سب کے ذہن میں ہندوستانی ادیبوں کی ایک انجمن بنانے

> کا خیال ہوا۔ پہلے تو سجاد ظہیر کے کمرے میں یہ چار پانچ نوجوان ملتے
> تھے اور اس کی حیثیت ایک اسٹڈی سرکل کی سی تھی لیکن کچھ ہی دنوں
> میں اس انجمن کی تشکیل کے لئے باقاعدہ ایک مینی فیسٹو تیار کیا گیا
> اور اس کا پہلا باقاعدہ جلسہ لندن کے نان کنگ ریسٹوران میں ہوا۔
> اس انجمن کا نام ہندوستانی ترقی پسند ادیب کی انجمن (Indian
> Progressive Writer,s Association) رکھا گیا اور
> ملک راج آننداس کے صدر منتخب ہوئے۔اس انجمن کے باقاعدہ
> لندن میں جلسے ہونے لگے۔اس میں ڈاکٹر سنویتی کمار چٹرجی نے
> (ماہرلسانیات)ایک بار شرکت کی اور رومن رسم الخط کی حمایت میں
> ایک تقریر کی۔ایک بنگالی ممبر نے قاضی نذرالاسلام کی انقلابی شاعری
> پر ایک مضمون پڑھا۔ملک راج آنند کا ''افسانہ'' دی ٹرورسٹ'' اور
> سجاد ظہیر کا ڈرامہ ''بیمار''اسی زمانے کی یادگار ہیں۔'' [1]

انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ان میں شامل ادیبوں ودانشوروں نے چند مقاصد کے تحت کیا تھا۔ان کا پہلا مقصد تھا کہ ترقی پسند ادب تحریک کا رخ ملک کے عوام،مزدوروں،کسانوں اور درمیانہ طبقے کی جانب ہونا چاہئے۔ان کو لوٹنے والوں اوران پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور،حس وحرکت جوش وعمل اوراتحاد پیدا کرنا اورتمام ان آثار اور رجحانات کی مخالفت کرنا اور جمہور،رجعت،پست ہمتی پیدا کرنا ان کا اولین فرض ٹھہرا۔اسی سے پھر دوسری بات نکلتی ہے،اوروہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن تھا جب ہم شعوری طور پر اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہداوروطن کے عوام کی اپنی حالت سدھارنے کی تحریکوں میں حصہ لیں۔ صرف دور سے تماشہ نہ دیکھیں بلکہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق آزادی فوج کے سپاہی بنیں۔ترقی پسند ادیب کے دل میں نوع انسان سے انس اور گہری ہمدردی بے حدضروری ہے۔بغیرانسان دوستی، آزادی خواہی اور جمہوریت پسندی کے ترقی پسند ادیب ہونا ناممکن ہے۔اسی وجہ سے یہ لوگ ترقی

---

[1] (اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمان اعظمی، 2007، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص:30)

پسند ادبی تحریک کا رشتہ ملک کی آزادی اور جمہوریت کی تحریکیوں کے ساتھ اعلانیہ طور سے وابستہ کرنا چاہتے تھے۔ان کا مقصد تھا کہ ترقی پسند دانشور مزدوروں اور کسانوں،غریب اور مظلوم عوام سے ملیں،ان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا حصہ بنیں۔اس لئے وہ اپنی تنظیم میں اس پر زیادہ زور دیتے تھے کہ دانش وروں کے لئے ادبی تخلیق کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی سے زیادہ سے زیادہ قربت ضروری ہے۔اس کے لئے لندن میں ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں نے اس تحریک کا پہلا مینی فیسٹو تیار کیا جس سے تحریک کے اغراض ومقاصد صاف طور پر ظاہر ہوجائیں۔وہ مینی فیسٹو یہ ہے:

''ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہورہی ہیں۔پرانے خیالات اور معتقدات کی جڑیں ہلتی جارہی ہیں اور ایک نیا سماج جنم لے رہاہے۔ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں ہونے والے تغیرات کو الفاظ اور ہیئت کا لباس دیں اور ملک کو تعمیر و ترقی کے راستے پر لگانے میں مدومعاون ہوں۔ہندوستانی ادب قدیم تہذیب کی تباہی کے بعد زندگی کی حقیقتوں سے بھاک کر رہبانیت اور بھگتی کی پناہ میں جاچھپاہے۔نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے روح اور بے اثر ہوگیاہے۔ ہیئت میں بھی اور معنی میں بھی اور آج ہمارے ادب میں بھگتی اور ترک دنیا کی بھرمار ہوگئی ہے۔جذبات کی نمائش عام ہے۔ عقل وفکر کو یکسر نظرانداز بلکہ رد کردیا گیاہے۔پچھلی دو صدیوں میں بیشتر اسی طرح کے ادب کی تخلیق عمل میں آئی ہے جو ہماری تاریخ کا انحطاطی دور ہے۔اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پرستوں کے اجارے سے نکال کر عوام سے قریب تر لایا جائے۔انہیں زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنایا جائے جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کر سکیں۔ہم ہندوستان کی تہذیبی روایات کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے

ملک کے انحطاطی پہلوؤں پر بڑی بے رحمی سے تبصرہ کریں گے اور تخلیقی وتنقیدی انداز سے ان سبھی باتوں کی مصوری کریں گے جنہیں ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ ہماراعقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کااحترام کرنا چاہئے اوروہ ہے ہماری روٹی کا،بدحالی کا، ہماری سماجی پستی کا،اورسیاسی غلامی کاسوال ہم اس وقت اس مسائل کوسمجھ سکیں گے اورہم میں انقلابی روح بیدارہوگی۔وہ سب کچھ جوہم میں انتشار،نفاق اوراندھی تقلیدکی طرف لے جاتاہے۔ قدامت پسندی ہے اوروہ سب کچھ جوہم میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرتاہے جوہمیں اپنی عزیز روایات کو بھی عقل وادراک کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے اکساتا ہے،جوہمیں صحت مند بناتاہے اورہم میں اتحاد اوریکجہتی کی قوت پیدا کرتاہے اسی کوہم ترقی پسند کہتے ہیں۔ان مقاصدکوسامنے رکھ کرانجمن نے مندرجہ ذیل تجاویز پاس کی ہیں۔

(ا) ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا۔ان انجمنوں کے درمیان اجتماعوں اورپمفلٹوں وغیرہ کے ذریعہ ربط وتعاون پیدا کرنا،صوبوں،کی مرکزکی اورلندن کی انجمنوں کے درمیان قریبی تعلق پیدا کرنا۔

(۲) ان ادبی جماعتوں سے میل جول پیدا کرناجواس انجمن کے مقاصدکے خلاف نہ ہوں۔

(۳) ترقی پسندادب کی تخلیق اورترجمہ کرناجوصحت منداورتوانا ہو جس سے ہم تہذیبی پسماندگی کومٹاسکیں اورہندوستانی آزادی اورسماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں۔

(۴) ہندوستانی کوقومی زبان اورانڈو رومن رسم خط کوقومی رسم خط تسلیم کرنے کا پرچار کرنا۔

(۵) فکرونظراوراظہارخیال کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا۔

(٦) ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا،عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانے کے لئے امداد چاہتے ہوں۔'' [۱]

لندن میں منظوراس اعلان نامے پر سجاد ظہیر، ملک راج آنند،محمد دین تاثیر، پرمود سین گپتا، جیوتی گھوش وغیرہ نے دستخط کئے۔سجاد ظہیر نے اعلان نامے کو اپنے دوستوں اورعزیزوں کے پاس بھیج دیا کہ وہ سب اسے یہاں کے ادیبوں اورشاعروں کو دکھا کران لوگوں سے اس پر دستخط کرائیں جواس مینی فیسٹو کی حمایت میں تھے۔

اس تحریک سے پہلے بھی ترقی پسندادب کی تخلیق ہورہی تھی اوراس کے ذریعے عوام کے مسائل بیان کئے جارہے تھے۔ان کی تخلیقات میں ترقی پسندی کی مقدار بھلے ہی بہت کم رہی ہومگر اس کے وجود سے انکار کرنا مشکل ہے اور یہ بات بھی قابل ہے کہ ترقی پسندی کی ابتدا چاہے جب سے ہوئی ہولیکن پہلی بار پورے طور پر منظّم ہوکرترقی پسند فکر کی تحریک ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' نے ہی چلائی۔جب اس انجمن کا قیام ہندوستان میں ہواتواس کا منشور ادیبوں اوردانشوروں کے سامنے رکھا گیا۔اکثراس سے متفق ہوکرایک پلیٹ فارم پرجمع بھی ہونے لگے کیونکہ اس انجمن کا مقصد ذاتی مسئلہ نہیں بلکہ پورے عوام کا مسئلہ تھا۔اوردیکھتے ہی دیکھتے اس انجمن نے پورے ملک کواحاطے میں شامل کرلیااور ہرطرف ملک میں اس رجحان کی تائید ہونے لگی۔یہ ہندوستان کی ایسی پہلی ادبی تحریک تھی جس میں نہ صرف اردو کے ادیب شامل تھے بلکہ دوسری زبانوں کے ادیب بھی ایک ہی پلیٹ فارم پرجمع ہورہے تھے اورایسی صورت میں یہ وقت کا تقاضہ تھا کہ کوئی ایسی کانفرنس بلائی جائے جہاں ملک کے سارے ادیب وشاعرجمع ہوکرایک دوسرے سے تبالہ خیال کریں اور بدلتے ہوئے ادب کے مسائل پرغوروفکر کریں۔

3/اپریل 1936ء کوانجمن ترقی پسند مصنفین نے لکھنؤ میں پہلی کل ہند کانفرنس کا انعقاد کیا۔

۱۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمان اعظمی، 2007، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب پورے ملک سے مختلف اللسان اور مختلف الخیال کے ادیب ودانشور ایک پلیٹ فارم پر اپنے خیال کا تبادلہ اور اپنی فکر کو ہم آہنگ کرنے کے لئے مگر صرف ایک مقصد کے تحت مثلاً ۔ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور مظلوم کی حمایت میں علم بغاوت کرنے کے لئے کوشاں تھے ۔اس کانفرنس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ حکومت کی پالیسی کے بنا پر ملک میں ادیبوں کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا ان کی قلم کے ساتھ ان کے آزادنہ خیال کو بھی ضبط کرلیا جاتا تھا اور اگر کسی نے اپنے آزادئ خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی تو یہ اس کے حق میں نفع بخش ثابت نہ ہوسکا۔ وہ تمام اخبارات جو جمہوری خیالات کا پرچار کرتے تھے وہ حکومت کی نظر میں تھے اور اس حالات کے خلاف اظہار خیال کی منظوری انہیں نہیں تھی ۔اب ان حالات میں پوری دنیا میں چھائے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کے باعث جو سیاسی بحران اٹڈ رہا تھا اس کو اب قید کرنا مشکل تھا۔کانفرنس لکھنؤ کے رفاہ عام ہال میں ہوئی۔کانفرنس کی صدارت کے لئے نوجوان ترقی پسند ادیبوں کے سامنے سب سے موزوں نام پریم چند کا تھا۔استقبالیہ کمیٹی کے صدر چودھری محمد علی رودولوی کے خطبے کے ساتھ دوروزہ کانفرنس کا آغاز ہوا۔چودھری صاحب اودھ کی قدیم تہذیب کے حامی ہونے کے باوجود بھی ترقی پسند تھے ۔انہوں نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ تحریک کا خیر مقدم کیا۔اس کے بعد کانفرنس کے صدر منشی پریم چند نے اپنا تاریخی خطبہ ''ادب کی غرض وغایت'' کے عنوان سے پیش کیا۔ پریم چند ہمارے ملک کے ایسے سنجیدہ اور مستند ادیب ہیں،ان کی نگاہ دور رس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ موجودہ ادب میں کیا کمی ہے اور آئندہ ادب کے کیا تقاضے ہیں جس کے باعث انہوں نے اپنے خطبے میں ادب اور ادیب کے متعلق جو خیال پیش کئے ہیں اور ادیبوں اور شاعروں سے ادب میں جو تبدیلی لانے کی جو اپیل کی ہے اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔جس کی وجہ سے ترقی پسند تحریک کو مزید تقویت ملی۔ پریم چند کے اس تاریخی خطبے کے چند اقتباسات پیش نظر ہیں جو علی سردار جعفری کے معرکہ آرا رسالہ ''گفتگو'' کے خصوصی شمارے ''ترقی پسند ادب'' نمبر میں شائع ہوئے تھے:

''حضرات! یہ جلسہ ہماری ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ

ہے۔ ہمارے سمیلنوں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان
اور اس کی اشاعت سے بحث کی جاتی رہی ہے یہاں تک کہ
اردو اور ہندی کا جو لٹریچر موجود ہے اس کا منشا خیالات اور جذبات
پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ محض زبان کی تعمیر تھا۔ وہ بھی نہایت ہی اہم
کام تھا........اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کر لی ہے
کہ ہم زبان سے گزر کر اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں
اور اس پر غور کریں کہ جس منشا سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیوں
کر پورا ہو۔ وہی زبان جس میں ابتداً باغ و بہار اور بے تال پچیسی
کی تصنیف ہی معراج کمال تھی اب اس قابل ہوگئی کہ علم وحکمت
کے مسائل بھی ادا کرے۔'' [1]

اس میں پریم چند نے زبان کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اس کے معنی پر بھی غور وفکر کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ وہ زبان جو قدیم عہد میں مقفٰی اور مسجع عبارت آرائی کے ذریعے اس وقت کی شناخت تھی اسے اب محفلوں سے نکل کر علم وحکمت کے مسائل کی بھی ترجمانی کرنی ہے۔ آگے کہتے ہیں:

'' ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن ''لیکن میرے خیال
میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ چاہے وہ مثالوں کی
شکل میں ہو، یا افسانوں کی یا شعر کی۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ
کرنا چاہئے۔'' ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اسے حیات سے کوئی
بحث نہ تھی۔ ہمارے ادیب تخلیقات کی ایک دنیا بنا کر اس میں من
مانے طلسم باندھا کرتے تھے۔ کہیں فسانہ عجائب کی داستان تھی،
کہیں بوستان خیال کی اور کہیں چندر کانتا سنتتی کی۔ ان داستانوں کا
منشا محض دل بہلاؤ تھا اور ہمارے جذبۂ حیرت کی تسکین.......بیشک
شعر وادب کا منشا ہمارے احساس کی شدت کو تیز کرتا ہے لیکن

---

[1] (گفتگو ترقی پسند ادب نمبر 1980ء بمبئی ص:20)

انسان کی زندگی محض جنس نہیں ہے کیا وہ ادب جس کا موضوع
جنسی جذبات اور ان سے پیدا ہونے والے درد و یاس تک محدود
ہو یا جس میں دنیا یا دنیا کی مشکلات سے کنارہ کشی ہونا ہی زندگی
کا ماحصل سمجھا گیا ہو، ہماری سمجھا گیا ہو، ہماری ذہنی اور جذباتی
ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے؟'' [1]

پریم چند نے ادب کی بہترین تعریف ''تنقیدِ حیات'' خیال کیا ہے۔ وہ ادب جو زندگی کی صداقتوں کا ترجمان نہ ہو، ادب نہیں ہے محض دل بہلانے کا سامان ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ شعر و ادب کا مقصد ہمارے جذبات و احساسات کو جگانا ہے۔ ادب کا دائرہ محض جنسی جذبات تک بھی محدود نہ ہونا چاہئے بلکہ زندگی کے دیگر مسائل پر بھی سوچنا چاہئے۔ پھر کہتے ہیں:

''مگر اب ہمارا ادبی مزاق تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ ادب محض
دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد
ہے۔ وہ اب محض عشق و عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے
مسائل پر غور کرتا ہے ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے وہ اب
تحریک یا ایہام کے لئے حیرت انگیز واقعات تلاش نہیں کرتا یا قافیہ
کے الفاظ کی طرف نہیں جاتا بلکہ اس کو ان مسائل سے دلچسپی ہے
جن سے سوسائٹی یا سوسائٹی کے افراد متاثر ہوتے ہیں ....ادب
نے اپنے لئے کیفیات اور جذبات کا دائرہ چن لیا ہے۔ ہم زندگی
میں جو کچھ دیکھتے ہیں یا ہم پر جو کچھ گزرتی ہے وہی تجربات اور وہی
چوٹیں تخیل میں جا کر تحقیق ادب کی تحریک کرتی ہیں۔ شاعر یا ادیب
کے جذبات میں جتنی ہی شدتِ احساس ہوتی ہے اتنا ہی اس کا کلام
دل کش اور بلند ہوتا ہے۔ جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح نہ بیدار ہو،
روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت و حرکت نہ پیدا ہو، ہمارا

---

[1] (گفتگو ترقی پسند ادب نمبر 1980 بمبئی ص: 21-20)

جذبۂ حسن نہ جاگے ، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے
لئے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لئے بیکار ہے۔اس پر
ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔زمانہ قدیم میں مذہب کے ہاتھوں میں
سوسائٹی کی لگام تھی۔انسان کی روحانی اوراخلاقی تہذیب مذہبی
احکام پر مبنی تھی اور وہ تخویف یا تحریص سے کام لیتا تھا۔عذاب و
ثواب کے مسائل اس کے آلہ کار تھے۔اب ادب نے یہ خدمت
اپنے ذمہ لے لی ہے اور اس کا آلۂ کار ذوقِ حسن ہے۔'' ۱؎

اس میں انہوں نے ادب کی اہمیت اور خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔پریم چند کے پورے خطبے میں جو بات سب سے زیادہ اہم تھی ، جملہ جو سب سے زیادہ پر زور تھا اور سب سے زیادہ پسند کیا گیا، یہاں تک کہ وہ آج بھی لوگوں کی زبان پر ہے اور ہمیشہ رہے گا وہ یہ ہے:

''ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ابھی تک اس کا معیار امیرانہ
اور عیش پرورانہ تھا۔ہمارا آرٹسٹ امراء کے دامن سے وابستہ رہنا
چاہتا تھا انہیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انہیں کی
خوشیوں اور رنجوں،حسرتوں اور تمناؤں،چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح
وتفسیر آرٹ کا مقصد تھا اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف
اٹھتی تھیں،جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے
انہیں وہ انسانیت کے دامن سے خارج سمجھتا تھا اگر کبھی وہ ان
کا ذکر بھی کرتا تھا تو مضحکہ اڑانے کے لئے اس کی دہقانی وضع اور
معاشرت پر ہنسنے کے لئے اس کا ''شین'' ''قاف'' درست نہ ہونا یا
محاوروں کا غلط استعمال ظرافت کا ازلی سامان تھا۔وہ بھی انسان
ہے ،اس کے بھی دل ہے،اس میں بھی آرزوئیں ہیں، یہ آرٹسٹ
کے ذہن سے بعید تھا۔'' ۲؎

۱۔ (گفتگو ترقی پسند ادب نمبر 1980ء بمبئی ص:21)

یہ ان کے تاریخی خطبے کا تاریخی جملہ ہے۔ جو ہمیشہ ہمیش قائم رہے گا۔ واقعی پریم چند کے اس جملے نے حسن کا معیار بدل کر رکھ دیا۔ وہ حسن جواب تک امراء کی محفل اور باشاہوں کے دربار سے وابستہ تھا ان کی واہ واہ سے ہی فنکار کو تسکین پہنچتی تھی لہٰذا آرٹ کا مقصد وہیں تک تک سمٹ کر رہ گیا تھا۔ دوسری جانب عام انسان کی عام زندگی تھی جس کی ادب میں کوئی جگہ متعین نہیں تھی۔ کسان و مزدور اور ان کے رہن سہن کا کہیں بھی ذکر نہیں تھا۔ ان کی انسانیت، ان کی دل کی کیفیات، ان کے جذبات ادب سے کوسوں دور تھے۔ پہلی بار اردو ادب میں ان عام انسانوں کے جذبات کی ترجمانی کی ضرورت محسوس ہوئی جو اپنا ایک منفرد معیار حسن رکھتی تھی۔

بعد کے اجلاس میں جن لوگوں نے مقالے پڑھے ان میں احمد علی، محمودالظفر اور فراق گورکھپوری تھے۔ ساغر نظامی نے حب الوطنی اور آزادی کے موضوع پر اپنی کئی نظمیں سنائیں۔ احمد علی نے ترقی پسند ادب پر جو مقالہ لکھا تھا، اس میں نئی ادبی تحریک کے مقاصد اور اصول بتائے تھے۔ فراق گورکھپوری کے مقالے میں ہمارے ملک کی انیسویں صدی کی تہذیبی اور مذہبی تحریکوں پر روشنی ڈالی گئی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں جدید ادب کا ارتقاء بھی انہیں تحریکوں سے وابستہ تھا۔ کانفرنس کے آخری اجلاس میں مولانا حسرت موہانی نے تقریر کی۔ حالانکہ وہ اس بات پر مصر تھے کہ انہیں پہلے ہی دن تقریر کا موقع ملے لیکن آخر میں ان کی تقریر سے محفل کی رونق اخیر تک قائم رہی۔ بہرحال مولانا نے پہلے تو ترقی پسند مصنفین کی تحریک اور اس کے اعلان نامے اور مقاصد سے پورا اتفاق کیا۔ پھر آگے فرماتے ہیں:

> ''ہمارے ادب کو قومی آزادی کی تحریک کی ترجمانی کرنی چاہیئے، اسے سامراجیوں اور ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنی چاہیئے۔ اسے مزدوروں اور کسانوں اور تمام مظلوم انسانوں کی طرفداری اور حمایت کرنی چاہیئے۔ اس میں عوام کے سکھ دکھ، ان کی بہترین خواہشوں اور تمناؤں کا اس طرح اظہار کرنا چاہیئے جس سے ان کی انقلابی قوت میں اضافہ ہو اور وہ متحد اور منظّم ہو کر اپنی انقلابی جدو جہد کو کامیاب بنا

سکیں۔'' ۱؎

مولانا نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ادب کو وقت کے ساتھ تبدیل کرنے کی ضرورت ہے اور اس میں تبدیلی لانے والے وہ ادیب اور شاعر ہیں جو اس وقت ملک کے حالات سے رونما ہو رہے ہیں۔ انہوں نے مزدوروں، کسانوں اور مظلوموں کے مسائل پر بھی غور و فکر کرنے کو کہا جس سے وہ بھی اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کریں اور ان کی یہ انقلابی قوت ان کی کامیابی میں ممدومعاون ثابت ہو۔مولانا نے اس تقریر میں اشتراکیت کی بھی حمایت کی اور کمیونزم کو مذہب اسلام سے وابستہ بتایا:

''محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے۔جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہئے اسے انقلابی ہونا چاہئے۔ انہوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اسلام اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہئے۔اسے انقلابی ہونا چاہئے۔انہوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اسلام اور کمیونزم میں قطعی کوئی تضاد نہیں ہے۔ان کے نزدیک اسلام کا جمہوری نصب العین اس کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان ،اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں۔ چونکہ موجودہ دور میں زندگی کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے۔اس لئے ترقی پسند ادیبوں کو انہیں خیالات کی ترویج کرنی چاہئے۔'' ۲؎

آخر میں مولانا مضحکہ خیز انداز میں اپنی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:

''آپ سوچتے ہوں گے.......جب میں ادیبوں کے سامنے جب یہ نصب العین پیش کر رہا ہوں تو خود اس پر عمل کیوں نہیں کرتا۔ظاہر ہے کہ میری شاعری میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوتی۔لیکن آپ کو اس طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے.......آپ کو زندگی کے زیادہ اہم اور سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کرنا چاہئے،

۱؎ (روشنائی۔سجاد ظہیر۔2006 پرائم ٹائم پبلی کیشنز، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ص:101)

> اوراس میں کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے خاص طور پر اسی
> لئے آیا ہوں کہ آپ کے ان مقاصد کی طرفداری اورحمایت کا
> اعلان کروں جو آپ کی تخلیق ہو۔ پرانی باتوں سے کام نہیں چلے
> گا۔ وہ محض دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔شاعری کے معاملے میں
> آپ کو میری تقلید کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں خود اس قسم کے
> نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق میں آپ کی پوری طرح مدد کروں گا۔'' [1]

ترقی پسند ادیبوں کی اس کانفرنس میں اعلان نامے کے علاوہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا دستور اساسی پیش کیا گیا جو منظور ہو گیا۔ترقی پسند ادیبوں نے اس اجلاس میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ادیبوں اور صحافیوں کو اپنے خیالات کے اظہار کے لئے مکمل آزادی دیں۔اس کے بعد سبھی نے ملک بھر میں اس کا تہہ دل سے خیر مقدم کیا۔منشی پریم چند نے رسالہ ''ہنس'' میں اپنے خطبۂ صدارت کا ہندی میں ترجمہ شائع کیا۔دہلی میں اختر حسین رائے پوری نے انجمن کی شاخ قائم کی۔جوش ملیح آبادی وہاں سے ''کلیم'' نکالتے تھے۔مجاز ریڈیو میں ملازم ہو گئے تھے۔ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے بھی تحریک کی سرپرستی کی اور شاہد احمد دہلوی جو ''ساقی'' کے مدیر تھے ان کے یہاں جلسے ہونے لگے انہوں نے انجمن کے مقاصد کے لئے ایک علیحدہ ماہنامہ ''شاہجہاں'' بھی جاری کیا۔اس طرح پورے ملک میں اس تحریک کی شہرت پھیل گئی۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادیب بھی انجمنیں قائم کرنے لگے۔کلکتہ، بنگال، گوہاٹی، ناگپور، احمد آباد، میسور، مالابار اور پونا میں بھی ترقی پسندوں نے اپنے اپنے حلقے قائم کئے۔

1936ء میں ترقی پسند ادیبوں نے الہ آباد میں ایک اور کانفرنس کی جس میں اردو اور ہندی کے بہت سے اہم ادیب اور ترقی پسند سیاسی رہنماؤں نے شرکت کی۔جس میں جے پرکاش نرائن، شیوودان سنگھ چوہان، نریندر شرما، رمیش چندر سنہا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔مجلس صدارت کے لئے آچاریہ نریندر دیو، پنڈت رام نریش ترپاٹھی اور مولوی عبدالحق کے نام منتخب کئے گئے۔آچاریہ جی اور ترپاٹھی جی نے ترقی پسند ادب کی حمایت میں تقریریں کیں۔مولوی عبدالحق صاحب کسی وجہ سے

---

[1] روشنائی، سجاد ظہیر، 2006ء، پرائم ٹائم پبلی کیشنز، اڈل ٹاؤن، لاہور، ص: 108)

شامل نہ ہوسکے لیکن اپنا خطبۂ صدارت بھیج دیا۔خطبہ کافی طویل ہے اور یہاں بے جا طوالت ممکن نہیں اس لئے ایک ہی اقتباس پیش نظر ہے جس سے ان کے ترقی پسند تحریک کے متعلق نظریات کا احاطہ ہوجائے گا۔

''رجعت پسنداورترقی پسند ہرزمانہ میں ہوئے ہیں،اب ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔رجعت اورترقی اضافی چیزیں ہیں کائنات کا ہرذرہ حرکت میں ہے اور ہرچیز پرتغیر کاعمل جاری ہے۔ رجعت یاترقی بھی اس کے زد سے نہیں بچ سکتی۔یہی وجہ ہے کہ رجعت یاترقی ہرزمانہ کے حالات اور ماحول کے اعتبار سے ہوتی ہے یہ خیال کہ ہرچیز جس کاتعلق گزشتہ زمانہ سے ہے سراسر رجعت سے آلودہ ہے،صحیح نہیں محض ہم اس بناپرکہ ہم لوگ آگے بڑھ گئے ہیں گزشتہ سے اپناتعلق بالکل قطع نہیں کرنا چاہئے، ایسا کرنااپنی جڑیں کاٹناہیں۔ہم گزشتہ کے وارث ہیں اگرکوئی وارث اپنے وارث سے بے خبرہے یا کماحقہٗ واقفیت نہیں رکھتاتو خواہ وہ کیساہی ذہین،مستعد اورانقلاب پسندکیوں نہ ہو،نہ کوئی اصلاح کرسکتاہے نہ خودفائدہ حاصل کرسکتاہے اورنہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتاہے اس لئے ہرترقی پسندادیب کافرض ہے کہ گزشتہ تاریخ اورگزشتہ ادب کاغور سے مطالعہ کرے اوردیکھے کہ ہمارے ادب میں کہاں تک آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے،کن چیزں کاترک کرنا مناسب ہے اورکن ذرائع سے اسے بلندمقام تک پہنچانے کی ضرورت ہے کیونکہ جوچیز آپ کو وارثاً ملی ہے اگرآپ اس کے حسن وقبیح سے واقف نہیں تواصلاح کس کی اورانقلاب کیسا؟''[1]

الہ آباد کی پہلی کامیاب کانفرنس کرنے کے بعدانجمن ترقی پسند مصنفین نے مارچ1938ء

---

1 (گفتگو،ترقی پسندادب نمبر۔1980۔بمبئی،ص:35)

میں دوسری کانفرنس کی جس میں یوپی ، بہار، پنجاب، گجرات اورلاہور کے اردواور ہندی زبان کے بہت سے ادیب وشاعرشریک ہوئے ۔فیض احمد فیض،حیات اللہ انصاری،مجاز،علی سردارجعفری، آنند نرائن ملا،امرت رائے،شاہدلطیف وغیرہ تشریف لائے۔اس وقت خود الہ آباد میں ہی اتنے اعلیٰ ادیب ودانشورموجود تھے جن میں فراق گورکھپوری،ڈاکٹراعجازحسین،احتشام حسین،وقارعظیم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ہندی کے مشہورشاعر میتھلی شرن گپت نے اپنی نظم سنائی۔ یہ کانفرنس اس لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ ہندوستان کے عظیم شاعررابندرناتھ ٹیگور نے اس میں شرکت کی اور ترقی پسندادیبوں کے نام ایک تحریری پیغام بھیجااوراس تحریک کی حمایت کی۔اس کے علاوہ پنڈت جواہرلال نہرو نے اس کانفرنس میں تقریر کی۔تقریر کاایک اقتباس پیش نظر ہے:

> ’’ہندوستان کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایسی انجمنیں یورپ میں متعدد ہیں اورانھوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں حالانکہ ان کاموں کوناپانہیں جاسکتا کیونکہ وہ لوگوں کے دماغوں میں ہیں۔انقلاب فرانس میں والیٹر کے ایسے ادیبوں کابڑادخل ہے۔اس کااثرانقلاب کے بعدسو برس تک باقی رہا.........آنے والے انقلاب کے لئے ملک کوتیارکرنا،اس کی ذمہ داری ادیب پرہوتی ہے۔آپ لوگوں کے مسئلوں کوحل کیجئے،ان کوراستہ بتایئے،لیکن آپ کی بات آرٹ کے ذریعہ جانا چاہئے،نہ کہ منطق کے ذریعے،آپ کی بات ان کے دل میں اتر جاناچاہئے۔آرٹ کی منطق الگ ہوتی ہے،وہ آدمی کوپکڑ لیتا ہے،پھرمنطق اپنا کام کرتی رہتی ہے.........‘‘ [1]

جواہرلال نہرو کی یہ تقریر بہت اعلیٰ درجے کی تونہیں تھی لیکن ان کے کہنے کا جو یہ مقصد تھا کہ ادیب کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کے مسائل کوآرٹ کے ذریعہ حل کرنا یہ بہت ہی خاص اہمیت رکھتاہے یہ پوری تقریر کاجز ہے جس نے ترقی پسند مصنفین اوران سے وابستہ شاعر وادیب کے دل میں سیاسی وسماجی شعور پیدا کرکے انقلاب کی راہیں ہموارکیں۔نہرو کے علاوہ ٹیگور نے بھی شرکت کی

---

۱ (گفتگو،ترقی پسند ادب نمبر 1980 ،بمبئی،ص:32)

تھی اورانھوں نے نوجوان ادیبوں کے نام جو پیغام بھیجا وہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ترقی پسند تحریک کوایک ایسے شاعر کی تائید حاصل ہوئی جس کی شہرت بین الاقوامی تھی اوران کے اظہار خیال سے یہ بات سامنے آئی کہ خود ان کے فکروفن اورادبی وفنی نظریات میں بہت بڑاانقلاب برپا ہو چکا تھا۔''ادیب کے فرائض'' کےعنوان سے انہوں نے جو پیغام دیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے:

''آج ہمارا ملک ایک لق ودق صحرا ہے جس میں شادابی اورزندگی کا نام ونشان نہیں ہے۔ملک کا ذرہ ذرہ دکھ کی تصویر بنا ہوا ہے۔ ہمیں اس غم واندوہ کومٹانا ہے اوراز سرنو زندگی کے چمن میں آبیاری کرنا ہے۔ادیب کافرض ہونا چاہئے کہ ملک میں نئ زندگی کی روح پھونکے،بیداری اورجوش کے گیت گائے،ہرانسان کوامیداورمسرت کا پیغام سنائے اورکسی کوناامیداورناکارہ نہ ہونے دے۔ملک اورقوم کی بہی خواہی کوذاتی اغراض پرترجیح دینے کاجذبہ ہرچھوٹے بڑے میں پیدا کرناادیب کافرض عین ہونا چاہئے۔قوم،سماج اورادب کی بہبودی کی سوگندھ جب تک ہرانسان نہ کھائے گا،اس وقت تک دنیا کامستقبل روشن نہیں ہوسکتا۔'' [1]

دسمبر 1938ء کے آخری ہفتے میں ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس کلکتہ میں ہوئی۔ ملک راج آنند نے اس کانفرنس کی صدارت کی۔اس میں بنگالی زبان کے کئی اہم ادیب وشاعر شریک ہوئے۔دوڑھائی سال کے اندر ترقی پسندادیبوں کی تحریک کو ہندوستان کی تمام زبانوں میں جومقبولیت حاصل ہوئی وہ شاید اتنی جلدی کسی اورتحریک کوحاصل ہوئی ہوگی۔ٹیگور، اقبال، پریم چند،عبدالحق،جواہرلال نہرو،سروجنی نائڈو،آچاریہ نریندردیوو‌غیرہ جیسے عالموں، ادیبوں، دانشوروں اورسیاست دانوں نے اس تحریک کے مقاصدکوفروغ دیا۔اوراس طرح ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس تحریک کی مقبولیت کو بڑھانے میں اس وقت کے اخباروں اور رسالوں نے بڑا کام کیا جوکہ خصوصی طور پرترقی پسندتحریک سے وابستہ تھے۔انجمن کی تیسری کل ہند کانفرنس 1942ء میں دہلی

---

[1] (گفتگو،ترقی پسند ادب نمبر 1980 بمبئی،ص:28)

میں منعقد ہوئی اس وقت ہندستان کی تحریک آزادی بھی اپنی شباب پر تھی۔اس کانفرنس میں وہ لوگ بھی شریک ہوئے جوازلی نظریات میں ترقی پسند تحریک سے متفق نہیں تھے۔ترقی پسند شعراء میں جوش،ساغرنظامی اورمجاز نے کچھ اہم بیان پیش کئے جواس وقت کے اخبارات میں شائع ہوئے۔

دسمبر 1947ء کے آخری ہفتے میں لکھنؤ میں ترقی پسندادیبوں کی ایک کانفرنس ہوئی جوتقسیم ہند کے بعد پہلی کانفرنس تھی۔اتفاق سے اس زمانے میں مولاناابوالکلام آزاد نے لکھنؤ میں ہندوستانی مسلمانوں کاایک کل ہنداجتماع منعقدکیا تھا تاکہ تقسیم ہند کے بعدمسلمانوں میں جوشکست خوردگی اور انتشار ہے اس پرغورکیا جائے اورنئی صورت حال کا مقابلہ کیا جائے۔تقسیم ہند کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں فرقہ وارانہ فسادات نے جوسیاسی وسماجی انتشار،تہذیبی واخلاقی انحطاط پیداکردیا تھا اورجس طرح انسانیت ،اخوت اوراعلیٰ اقدارکی طرف سے بے یقینی ہورہی تھی وہ ہمارے ملک کی تاریخ کاایک دردانگیزالمیہ ہے۔اس وقت ان حالات سے عام انسان بھی کافی متاثر ہوئے توشاعر وادیب بھلا کیونکر پیچھے رہتے۔ترقی پسندادیبوں نے اس موضوع پر بہت سے افسانے لکھے ،کچھ ناول اورناولٹ بھی تخلیق کئے گئے جواس تحریک کاخاص سرمایہ ہیں۔فرقہ وارانہ تعصب کی وجہ سے ادیبوں نے ہندی اوراردوکے جھگڑوں میں دلچسپی لینی شروع کردی تھی اورزبان کے معاملے میں ان کارویہ قومی وملکی مفاداورترقی پسندی کے اصول کے خلاف تھا۔یوپی کے ادیبوں نے اپریل 1949ء میں ملک صوبائی کانفرنس کی۔اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اردوہندی کا جھگڑاسب سے زیادہ شمالی ہنداوربالخصوص یوپی کے ادیبوں میں زیادہ تھا۔کانفرنس میں ہندی اوراردودونوں زبانوں کے ادیب موجود تھے۔کانفرنس نے اپناایک منشورپیش کیاجس میں نئے حالات اورترقی پسندادیبوں کے فرائض واضح کئے گئے تھےجس کے تحت یہ فیصلہ ہواکہ ہرزبان کوآزاداوربے روک ٹوک ترقی کاحق ہونا چاہئے۔وہ کسی زبان کے بولنے والوں پرایک سرکاری زبان کے لادے جانے کی مخالفت کرتی ہے۔

مئی1949ء میں بھیمڑی (علاقہ بمبئ) میں ترقی پسندادیبوں کی ایک کل ہندکانفرنس ہوئی جس کے بعدترقی پسندمصنفین کی تحریک میں ایک نیاموڑآتاہے کیونکہ اس کانفرنس میں ترقی پسند

ادیبوں نے بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں 1936ء کے منشورکوناکافی سمجھ کرایک نیامنشور منظورکیااور نئے ملکی اور بین الاقوامی سیاسی حالات میں ترقی پسندادیبوں کوکھل کرترقی پسندقوتوں کا ساتھ دینے پرزوردیا گیا۔لیکن اس نئے منشورنے اس تحریک کوفائدہ پہنچانے کے بجائے بعض ایسی مشکلات سے دوچارکردیاجس کے نتائج ترقی پسندادیبوں کی اس تحریک اورادبی تخلیقات کی پیداوار دونوں کےحق میں مضرثابت ہوئے۔

ترقی پسندتحریک کاجتنا تہہ دل سے خیرمقدم کیاگیا اتنی ہی اس کی مخالفت بھی کی گئی۔سب سے زیادہ اس کی انقلابی شاعری میں تخریبی رجحانات اورنعرہ زنی پراعتراض کیاگیااورکہا گیا کہ اس سے شاعری کاحسن بری طرح مجروح ہورہاہے۔حالانکہ ترقی پسندتحریک کامقصدادب کوزندگی کے قریب کرناتھااوراس کی حقیقت بیان کرنا تھا۔اس وقت زندگی کی جوحقیقت تھی وہ ادیبوں کےقلم سے اچھوتی نہ رہی،یہ ایک تلخ حقیقت تھی اوروقت کاتقاضہ بھی۔اب اسے فحاشی کے ذریعہ بدنام کیاجانے لگا۔جب حسن کامعیارتبدیل کرنے کی بات کہی گئی تھی تبھی شاعری میں جمالیات کی جگہ بلندآہنگی کودی گئی جوکہ شاعری کاحسن تھا۔ بہرحال اتنی مخالفت کے بعد بھی اس بات سے انکارنہیں کیاجاسکتا کہ اردوادب کابیش قیمتی سرمایہ ترقی پسندادب کی شکل میں محفوظ ہےجس کی اہمیت دائمی ہے۔

ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری

ادب زندگی کا وہ آئینہ خانہ ہے جہاں محبت بھی ہے اور نفرت بھی، غم بھی ہے اور خوشی بھی، انسان دوستی بھی ہے اور عداوت بھی، خوابوں خیالوں کی دنیا بھی ہے اور حقیقت نگاری بھی، یاس و ناامیدی بھی ہے اور آرزو وامید بھی، کہیں مظلوموں کا استحصال ہے تو کہیں ظلم کے خلاف بلند آہنگی، کہیں رجعت پسندی ہے تو کہیں ترقی پسندی۔ ادب نے زندگی کے ہر مسائل کی ترجمانی کی، ہر ایسے گوشے کو منور کیا ہے جو تاریکی میں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ ہر دور ہر حالات میں ادب نے زندگی کا ساتھ دیا ہے۔ جب زندگی محض تفنّن طبع کا ذریعہ تھی لوگ وقت کی فراوانی کے ساتھ قصے کہانیوں میں مست و مسرور تھے انہیں حقیقت کی دنیا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ پری، جن، شہزادہ وغیرہ مافوق الفطری عناصر دن بہ دن ان کا دل بہلا رہے تھے اور اس پر مقفّیٰ مسجع عبارت آرائی، بادشاہوں کی محفلوں کی زینت تھی۔ پھر ادب طوائفوں کی گلی کوچوں کی زینت بھی بنا۔ ان کی ذاتی زندگی کی حقائق سے لے کر بازاروں کی رونق تک سب کچھ پیش کیا۔ پھر اصلاح کی جانب گامزن ہوا اور زندگی کے اہم مسائل کو حل کرنے کے لئے آ کھڑا ہوا۔ یہ تبدیلیاں ادب کو ایک نئے راستے پر لے جا رہی تھیں اور ادب وقت اور ماحول کے ساتھ مطابقت بنائے ہوئے تھا۔ پھر ادب میں ایک نئی تبدیلی آئی جو اسے متحرک قوتوں کے باعث حاصل ہوئی۔ یہ متحرک قوتیں وطن پرستی، قومی یکجہتی اور اور اہل ملک سے محبت اور برطانوی حکومت اور ملک کی آزادی کے جذبے سے سرشار تھی۔ اس جذبے کو مزید تقویت تب حاصل ہوئی جب ادب کو زندگی سے اور قریب لایا گیا اور اس میں نچلے طبقے کے عام لوگ مثلاً کسان، مزدور وغیرہ کو بھی شامل کیا گیا۔ اس انقلابی قدروں سے متاثر ہو کر عزیز احمد اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''انقلاب انسان کی ارتقائی زندگی کا سب سے بڑا مصلح ہے۔ جب
> زندگی آنکھوں پر پٹیاں باندھے کسی پرانی روایتی روش پر چلتے چلتے اکتا
> جاتی ہے، تو انقلاب آنکھوں کی پٹیاں کھول کر ایک نیا راستہ دکھلاتا

ہے، اگر انقلاب اس قسم کا ہے کہ اس سے انسان کی اکثریت کو
فائدہ پہنچے، تو وہ اپنے اندر بے شمار انسانی خوبیاں بھی رکھتا ہے۔
ایسا ہی انقلاب دراصل صالح ہے۔'' ۱؎

ترقی پسند تحریک نے جتنے کم وقت میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی، اتنے کم عرصے میں سارے ملک میں عام ہوجانا آسان کام نہ تھا۔ اور اس نے کم وقت میں ادب کو بے حد متاثر کیا جس سے ادب میں پرانے طرز فکر کی جگہ نیا طرز فکر احساس پیدا ہوا۔ اوہام پرستی کی جگہ تعقل پسندی، دل کے ساتھ دماغ کو بھی توجہ کا مرکز بنایا گیا، فرسودہ روایتوں کی جگہ نئی روایتوں کو قائم کیا گیا، جھوٹ اور مبالغے کی جگہ حقیقت پسندی کو ترجیح دی گئی۔ اس تحریک نے ادب اور زندگی میں براہ راست تعلق پیدا کیا اور ادب کو سماجی، سیاسی اور معاشی مقاصد سے پیوست کیا۔ اس تحریک نے حسن کے معیار کو تبدیل کیا اور اب ادب محض بادشاہوں، شہزادوں اور اونچے طبقے کے کرداروں تک محدود نہ ہوکر عام انسانوں بلکہ کسانوں اور مزدوروں تک پہنچ گیا۔ اس طرح ترقی پسند ادب نے ایک نئی اور روشن سمت کی جانب قدم بڑھایا۔ ادیب، شاعر اور دانشور علی سردار جعفری اس کی خصوصیت کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''یہ تحریک اس اعتبار سے ماضی کی بہترین روایات کا تسلسل ہے
کہ یہ انسان دوستی، عقل پسندی، حب الوطنی، سامراج دشمنی اور
آزادی کے جذبے کو لے کر آگے بڑھی، لیکن اس اعتبار سے
بالکل نئی تحریک ہے کہ اس نے عوام کی زندگی پر ادب اور فن کی
بنیاد قائم کی۔'' ۲؎

یہاں ترقی پسند ادب کو سمجھنے کے لئے پورے ادب کی وضاحت کی گئی ہے اور ادب میں نثر شاعری دونوں ہیں لیکن یہاں میرا میدان فقط ترقی پسند شاعری تک محدود ہے اس لیے آئندہ بھی گفتگو ترقی پسند شاعری کے حوالے سے کی جائے گی۔ اردو شاعری نے کس طرح ترقی پسند تحریک کا ساتھ دیا اس کی کیا خصوصیات ہیں اور اس میں کس طرح کے موضوعات کو شامل کرنے کی کوشش

۱؎ (ترقی پسند ادب، عزیز احمد، 1945، ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد، ص: 41)

وسعی کی گئی، یہاں اس کی وضاحت کی جائے گی۔

سماجی کشمکش اور طبقاتی انتشار کا جو اثر اردو شاعری میں داخل ہو چکا تھا اس نے جدو جہد اور تعمیر کے خیال کو بھی ذہن و نظر کا مقصد بنا دیا۔ انقلاب کا جو خیال شاعری میں پیش کیا جا رہا تھا اس نے نو جوانوں کو زیادہ متاثر کیا تھا یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے حصول آزادی کے لئے صرف نعرے ہی نہیں لگائے تھے بلکہ شعوری طور پر بھی آزادی کے مفہوم کو بھی سمجھا تھا اور ہند کے حاکموں کی سیاسی اور معاشی حالتوں کا اندازہ بھی لگایا تھا۔ ان کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ ہندوستان کی آزادی پر بیرونی سیاست اور معاشرت کا کیا اثر پڑ سکتا ہے حالانکہ ادب میں یہ آواز کوئی نئی آواز نہیں تھی اس سے پہلے بھی حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے حامی اس پر قلم اٹھا چکے ہیں۔ شاعر مشرق اقبال نے بہت پہلے ہی حب الوطنی کے جذبات سے بھر پور نظمیں لکھی تھیں ان کے بعد سرور جہاں آبادی، حسرت، چکبست، جوش، ظفر علی خاں، سیماب اکبر آبادی، اختر شیرانی وغیرہ اپنی قلم کے ذریعے اس گوشے کو روشن کر چکے تھے۔ لیکن یہ جذبات وقت کے ساتھ مدھم پڑ گئے اور اب وقت کچھ اور ہی تقاضا کر رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک سے قبل اقبال نے سرمایہ و محنت پر غور و فکر کیا تھا اور حقیقت میں اس افکار و خیالات سے بھی اس تحریک نے فیض اٹھایا تھا۔ اقبال نے نہ صرف سرمایہ دارانہ نظام کی نا طبقاتی قوتوں کا ذکر کیا ہے بلکہ ترقی پسند عناصر کو اپنی شاعری میں توانائی بھی بخشی ہے اور شعر و ادب کی دنیا کو اس طرح تبدیل کیا کہ یہ ترقی پسند تحریک کے لئے مشعل راہ بن گئی۔ نظم ''خضر راہ'' میں سرمایہ و محنت کے لئے فرماتے ہیں ۔

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اقبال محض سرمایہ داری اور مزدوروں تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ وہ زندگی میں انقلاب بھی برپا کرنے کے خواہاں تھے ۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کش مکش انقلاب

ایک طرف اقبال کی فلسفیانہ شاعری تھی تو دوسری طرف جوش کی انقلابی شاعری۔ وہ اپنی پرزور زبان اور پرشعور لہجے میں لوگوں کو برطانوی سامراجیت سے بغاوت اور انقلاب کے لئے تیار کررہے تھے۔ ہندوستان کے بدلتے ہوئے خیالات نے ان کو ملکی اور قومی مسائل کی طرف متوجہ کیا۔ وطن پرستی کے جذبے اور وطن سے محبت نے ان کی شاعری میں ایک نیا رنگ بھر دیا۔

وہ دور ہندوستان کی تاریخ میں فرقہ وارانہ فسادات اور افلاس وغربت کا دور تھا جس کی خاص وجہ انگریزی حکومت کی بے اعتدالی اور ناانصافی تھی۔ وہ اپنی پرجوش آواز میں ان دونوں موضوع کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں ۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

یہ وہ دور تھا کہ جب اردو شاعری کی سب سے اہم صنف غزل جس میں طبع آزمائی معیاری شاعر ہونے کی دلیل تھی اب اس کی حیثیت ثانوی سی ہوتی جارہی تھی۔اس کی جگہ نظم اپنا الگ مقام تیار کررہی تھی ۔ادھر صحافت کی دنیا میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں ،ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' ظفرعلی خاں کا ''زمیندار'' اور مولانا محمد علی جوہر کا ''ہمدرد'' ہندوستانی نوجوانوں کے بڑے محبوب اور

مقبول صحیفے بن گئے تھے جس میں شامل مضامین نے ان کے جذبہ حریت کومزید تقویت بخشی اوران کے خون میں ابال آنے لگا۔1908ء میں پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ ''سوزوطن'' شائع ہوا تو اسے حکومت نے ضبط کرلیااوراس کی ساری کاپیاں جلادی گئیں۔اس وقت ادب میں کسی کو اتنی آزادی نہیں تھی کہ وہ اپنے خیال کا باضابطہ اظہارکرے۔لیکن ترقی پسندی کی فضاتو تیارہورہی تھی بس اس کوعملی جامہ پہنانے کے لئے ایک منظّم اور پرجوش تنظیم کی ضرورت تھی۔

اسی زمانے میں نیازفتحپوری کی تحریروں سے مذہب کے متعلق عقلیت اورآزادخیالی کا نظریہ نوجوانوں میں مقبول ہونے لگااورقاضی عبدالغفارنے ''لیلیٰ کے خطوط'' میں مروجہ کے اخلاقی قدروں کو اپنے طنز کا نشانہ بناکر اخلاقیات سے متعلق ایک نقطۂ نظرکوفروغ دیا۔اس طرح اردوادب کی یہ ولولہ انگیز تبدیلیاں نوجوان طبقے کوآزادی،مساوات،بغاوت اورانقلاب کے لئے تیارکررہی تھیں اور رجعت پسندی کے بندھنوں سے آزادکرانے کی کوشش بھی اپنے شباب پرتھی۔دوسری طرف پوری دنیامیں اشتراکیت اورعوامی انقلاب کی لہرنے نوجوانوں کونیاسیاسی شعوردیاتھا۔اب ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم اوران کے حقوق کے لئے آوازاٹھائی جارہی تھی۔1932ء میں چند نوجوانوں نے اپنی نئی کہانیوں کا مجموعہ ''انگارے'' کے نام سے شائع کیا۔جن لکھنے والوں کی کہانیاں اس میں شامل تھیں وہ سجادظہیر،احمدعلی،رشید جہاں اورمحمودالظفر تھے۔ان کی کہانیوں میں نیاپن تھا جس میں انقلاب اور باغیانہ خیالات کی لہریں ہچکولے ماررہی تھیں،جوانی کا جوش اورحالات سے منافقت اس وقت نوجوان طالب علموں میں عام تھی اس سے مرجہ خیال اورمذہبی عقائد پرطنزان کہانیوں میں نمایاں تھاجس کا نتیجہ یہ ہواکہ قدیم خیال کے لوگوں میں افراتفری مچ گئی اوراس کے خلاف اس قدراحتجاج کیاکہ حکومت نے اس مجموعے کوضبط کرلیاگیالیکن اس طرح کی تخلیق سے یہ بات توظاہرہوہی گئی تھی کہ ہندوستانی نوجوانوں کے ذہنی اورجذباتی تبدیلیوں کے باعث ایک نئے ادب کے وجودمیں آنے کے امکان تھے جووقت اورحالات کے پیش نظربے حدضروری تھا۔اس دورکا جائزہ لیتے ہوئے مشہورومعروف ترقی پسندنقادپروفیسرسیدمحمدعقیل رضوی رقم طراز ہیں:

''اردوکیاہے،پورے ہندوستانی ادب میں عوامی ادب کا یہی تصورتھا

> جس سے پورا نیا ادب متاثر تھا اور اس وقت سے آج تک، تمام عوامی ادب کی یہی صورتیں سربراہ رہی ہیں۔ شاید یہی سب ہے کہ اردو میں نظم نگاری کی روایت بڑی مقبول اور مضبوط نظر آتی ہے۔ ترقی پسند جمالیات میں مارکسی جمالیات حاوی ہو رہی تھی مگر کلاسیکی اور روایتی جمالیات بھی بڑی خوبصورتی سے اس رنگ میں شامل ہیں۔ خوبصورت امیجری، فطرت رومان اور حقیقت کا روپ لے کر مقبول عام زبان کے ساتھ کیفیت کا جادو جگاتی ہے، جس میں لحاتی سیاست بھی اس طرح گھلی ملی ہے کہ اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔" [1]

اکثر و بیشتر ترقی پسند شعراء ابتدا میں رومانی شاعری کرتے تھے ان کی رومانی شاعری اس وقت اور دور کے حالات کے مطابق تھی لیکن 1936ء کے درمیان جو حالات رونما ہوئے اس میں ایسی شاعری مناسب نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ بدلتے ہوئے حالات اور اس کے پیش نظر مسائل کو شاعری کے موضوعات منتخب کیے گئے۔ سب سے پہلے ترقی پسند شعراء نے اپنے رومانی محبوب کی محبت کو رخصت کیا اب ان کے لئے فقط محبوب ہی توجہ کا مرکز نہیں تھا بلکہ عام انسان کے دکھ درد، کسان اور مزدوروں کی پریشانی، عالمی مشکلات، آزادی کا جذبہ، انقلاب وغیرہ ان کی اہم ذمہ داریاں تھی جس کے لئے انہیں اپنے رومانی محبوب کی محبت کو ترک کرنا پڑا۔ ترقی پسند شاعر مجاز بھی ابتداء میں رومانی شاعری کرتے تھے۔ ان کی عشقیہ شاعری میں ماضی کا تسلسل، حال شعور اور مستقبل کے خواب ملتے ہیں جو روح عصر کے ترجمان ہیں۔ ان کے اندر ایک ایسا شخص پنہاں ہے جن کی کوشش و کاوش سے کارخانۂ حیات کے ہر لمحے کو حرارت میسر ہوتی ہے اور یہیں سے ان کی رومانی شاعری میں انقلاب کے عناصر شامل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ شورش دوراں میں وہ کیا کیا اور کیسی کیسی متاع حیات فراموش کر بیٹھے ہیں ملاحظہ کیجئے۔

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدہ گریاں بھول گئے

---

[1] (ترقی پسند تنقید کی تاریخ (ہندوستان میں) سید محمد عقیل رضوی، 2009، ادارۂ نیا سفر الہ آباد

اے شوق نظارہ کیا کہیے! نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصور کیا کیجے ہم صورت جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصل بہاراں رخصت ہو ہم لطف بہاراں بھول گئے

اسی طرح فیضی بھی ابتداء میں رومانی شاعر تھے اوران کا انداز اورلب ولہجہ دوسرے شعراء سے قدرے مختلف تھا ان کی شاعری میں پختگی تو ہے ہی ساتھ ساتھ جلوۂ جاناں کی عکاسی بھی ہے۔ لیکن جلد ہی ان کو بھی رومان سے انقلاب کی منزلیں طے کرنی ہیں جس میں وہ سخت الجھنوں میں پھنس جاتے ہیں۔ یوں تو ہر ترقی پسند رومان سے انقلاب کی جانب کا سفر طے کرتا ہے لیکن یہ سفر اتنا آسان نہیں ہے۔ اپنے روایتی حسن وعشق کو ترک کر کے ایک ایسی خشک راہ پر چلنا بہت مشکل ہے جس میں پیش نظر کچھ نہ ہو اوراس راستے کی تلاش خود ہی کرنا ہے۔ اس کیفیت کو وہ اپنی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اس نظم میں فیض کے دو کردار نظر آتے ہیں ایک تو وہ شخص جس کے دل میں محبوب کو پانے کی زبردست خواہش ہے اوراس کو پانے کے لیے وہ حد درجہ بے چین ہے اس کو یقین ہے کہ اگراس کا محبوب اسے مل جائے تو ان تمام مشکلات کا خاتمہ ہو جائے لیکن پھر یکا یک اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں سیکڑوں برسوں سے لوگوں پر جو ظلم وستم ہو رہے ہیں۔ جابر قوتیں ظلم واستبداد سے مظلوموں کا استحصال کر رہی ہیں شاعر کو ان سب مصائب کو دور کر کے جو سکون ملے گا اس کا لطف کچھ اور ہی

ہوگا۔فیض کی طرز پر ہی سردار جعفری نے اپنی نظم ''انتظار نہ کر'' تخلیق کی۔انہوں نے بھی اسی موضوع کو منتخب کیا ہے۔انہوں نے ہندوستان کی موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے اپنے محبوب سے ان کا انتظار نہ کرنے کی بات کہہ رہے ہیں۔دراصل سردار، فیض کی طرح حقیقت کی دنیا کی طرف متوجہ ہورہے ہیں۔اب وہ عشق وعاشقی کے مزے ،حسن کاری ، وصال کا لطف ان سب کو قربان کرکے عام انسانی زندگی اور اس کے مسائل اخلاقی اقدار کی طرف مائل ہورہے ہیں۔وہ اپنے محبوب کو بھولے بھی نہیں ہیں لیکن اس کو انتظار کا حق بھی نہیں دے رہیں اب ان کی منزل،ان کے راستے کچھ اور ہی ہیں جس کی ان کو خود خبر نہیں ہے ۔

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

عجب گھڑی ہے میں اس وقت آ نہیں سکتا
سرور عشق کی دنیا بسا نہیں سکتا

میں تیرے ساز محبت پہ گا نہیں سکتا
میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر

نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

ان شعراء کا خیال ہے کہ ان کا محبوب جو پھول کی پنکھڑی سے بھی زیادہ نرم ونازک ہے وہ ان سخت مسائل کو نہ تو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی حل اس کے پاس ہے۔اس صورت حال میں اس کو اپنے پاس رکھنا مناسب نہیں کیونکہ اگر شاعر کو جنگ میں جانا پڑ جائے تو وہ اپنی محبوبہ کو ساتھ نہیں لے جاسکتا اگر پھر بھی محبوبہ ضد کرتی ہے کہ وہ اس جنگ میں ساتھ چلے گی تو شاعر کو تعجب ہے کہ وہ اس سخت حالات کا مقابلہ کیسے کرے گی۔علی جواد زیدی اپنی ایک نظم ''میری راہ میں'' اس کیفیت کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں ۔

تم کو تو مجھی سے الفت ہے تم دنیا بھر کو کیا جانو
رستہ ہے کٹھن منزل ہے کڑی کچھ سوچو سمجھو پہچانو

اچھا ہے کہ اب سے لوٹ چلو، گھر جاؤ مرا کہنا مانو
تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی

ترقی پسند شاعری میں روایات سے ہٹ کر موضوعات پر شاعری کی گئی ہے۔عورت جو کہ اب تک محض گھر کی چار دیواری میں قید تھی اور وہ صرف حسن وعشق کے لئے استعمال میں لائی جاتی تھی ، وہ صرف دل بہلانے کا ذریعہ تھی ،اس کو فیصلہ لینے کا کوئی حق نہیں تھا،اسے سماج کے بندھنوں میں رہنا پڑتا تھااوراس کے قاعدے قانون کو ماننا پڑتا تھا،جس کو پردے میں رہنے کاحکم تھااب اس کے لئے آزادی کی راہیں ہم وار ہوگئیں۔کل تک جوصنف نازک کے نام سے جانی جاتی تھی اب صرف عشق ومحبت تک محدود نہیں،اب اسے بھی مرد کے کندھے سے کندھاملا کر چلنے کی آزادی ہے، وہ اپنے فیصلے خود لے سکتی ہے۔ترقی پسند تحریک نے عورت کوصرف اس کی ذمہ داریوں کانہیں بلکہ اس کی اہمیت کابھی احساس دلایاہے۔اب وہ جنگ آزادی میں بھی برابر کی شریک ہے۔ترقی پسند شعراء نے سماج کی کشمکش ،محبت کی راہ میں حائل دشواریوں کودیکھ کراپنی تصوراتی عورت کوشعور کی روشنی بخشی ہےاوراسے مسائل زمانہ سے دوچار ہونے کےمواقع فراہم کیے ہیں۔مجاز کہتے ہیں ؎

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہےلیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

ترقی پسند شاعری میں عورت کی اہمیت وافادیت پر بے حدزورد یا گیاہے۔ترقی پسند شعراء نے اپنے محبوب کوبھی ایک خاص محبوب بتایاہے جو عام روایتی محبوب کی طرح نہیں ہے۔وہ صرف عشق ومحبت تک محدودنہیں ہے بعض اوقات وہ اپنے محبوب کو بغاوت اورانقلاب کی تلقین کرتے

ہیں۔علی جواد زیدی اپنی نظم ''شرائط''میں دلہن کے لیے کچھ شرطیں رکھی ہیں ۔

بجا کہ کھیل رہا ہوں شباب سے اپنے
بجا کہ دن مری شادی کے بھی ہیں آئے ہوئے

خطا معاف کہ جچتی نہیں نگاہوں میں
یہ دیویاں پس چلمن نظر جھکائے ہوئے

مجھے تو ہم دم و ہمزاد چاہیے ایسی
جو دست ناز میں خنجر بھی ہو چھپائے ہوئے

نکل پڑے سر میداں اڑا کے آنچل کو
بغاوتوں کا مقدس نشاں بنائے ہوئے

اٹھا کے ہاتھ کہے انقلاب زندہ باد
لہو سے مثل دلہن مہندیاں رچائے ہوئے

اس دور کی احتجاجی شاعری میں انقلاب بھی ہے اور بغاوت بھی۔شاعرفرسودہ نظام کوختم کر ایک نئی دنیاتعمیر کرنے کا خواہش مند ہے۔اس کے اس انقلاب میں غصے اورانتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔وہ بغاوت کرنا چاہتاہے۔یہ انقلاب، یہ بغاوت، یہ غصہ، یہ انتقام ترقی پسندشاعری میں جابجانظرآتاہے۔یوں توسبھی ترقی پسندشعراء انسانی دوستی،مزدور،کسان،اورعام انسانوں کے دکھ دردکو بیان کرتے ہیں اورسماج میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں جس کے لئے انقلاب کی ضرورت ہے۔یہ انقلاب الگ الگ شکل میں ان شعراء کے یہاں نظرآتاہے۔مارکس ازم اورترقی پسندی کا یہ علم فراق کی شاعری میں کچھ یوں نظرآتاہے ۔

بے محابا انقلاب آنے کو ہے
ہوشیار اے اہل دنیا ہوشیار

مجاز کے یہاں ایک الگ طرح کاانقلاب ہے وہ رومانی شاعری کے ذریعے انقلاب لانا

چاہتے ہیں۔ان کا محبوب ہی ان کو انقلاب کی جانب لے جا رہا ہے۔انقلاب بھی ایسا کہ دونوں مل کر ایک نئے سماج کی تعمیر کریں۔دو دلوں کی دھڑکنوں پر فرسودہ نظام کی بندش بے جا نہ ہو ۔

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

فیض بھی انقلابی شاعری کی جانب توجہ کرتے ہیں۔ان کو اپنے وطن سے بے حد محبت تھی۔ یوں تو ہر شخص کو اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے لیکن جہاں گفتار و بیان پر پابندی ہو، محبّ وطن پر ظلم ہو رہے ہوں ایسے میں بڑے بڑے وطن پرست پیچھے ہٹ جاتے ہیں لیکن فیض ان حالات میں بھی کہتے ہیں ۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

فیض نے رومانی لہجے میں انقلابی شاعری کی ہے اور ایسی انقلابی شاعری جس کو پڑھ کر دل جھوم اٹھتا ہے۔دوسرے ترقی پسند شاعروں نے اپنی بلند آہنگی سے شاعری کا رخ دوسری طرف موڑ دیا ہے لیکن فیض کو رومانی رویہ ہی عزیز رہا اور اس نرم لہجے میں بھی انہوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پیش کیا۔یہ کسی عام شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔

جذبی نے بھی انقلاب کو شاعری کا موضوع بنایا۔تقسیم ہند کے بعد آنے والے مسائل نے شاعر کے جذبات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔فرقہ وارانہ فسادات، بے گھری، بے روزگاری وغیرہ نے پورے ملک میں بھونچال مچا رکھا تھا۔اب وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کیا یہ وہی انقلاب ہے جس کے ہم ہمیشہ سے خواہش مند رہے تھے۔ان کو اب نئے مسائل اور نئی مصیبتوں کا خیال آنے لگا۔آزادی کے بعد جو امیدیں تھیں ان کے پورا نہ ہونے سے ایک بے چینی، بے اطمینانی سی پیدا ہونے لگی جس

کو اپنی نظم ''تقسیم'' میں یوں بیان کرتے ہیں ۔

کیا یہی انقلاب ہے قلب ادھر جگر ادھر
نالۂ بے قرار ادھر ، شورش چشم تر ادھر

فیض نے صبح آزادی میں بھی اسے رقم کیا ہے وہ اسے شب گزیدہ سحر بتاتے ہیں اور آخر میں کہتے ہیں کہ ۔

ع چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

مخدوم نے بھی انقلابی شاعری اور بغاوت کے علم بردار ہیں۔ چونکہ رومانویت ان کی شاعری کی بنیاد رہی ہے اس لئے یہاں رومان اور انقلاب کے ایک ہونے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ وہ بھی فرسودہ نظام سے ناآسودہ اور نئے نظام کے خواہش مند تھے۔لیکن ان کا نقلاب دوسرے شعراء سے تھوڑا مختلف ہے۔ وہ انقلاب کا انتظار اس طرح کر رہے ہیں جیسے کوئی خوش جمال محبوبہ کا کرتا ہے۔عشق، حسن، نغمے اور روحانی زندگی کے تمام پرانے معیار اس کی سواری کے گزرتے ہی خاک بسر ہو جائیں گے۔ انقلاب کی سختی اور گرمی جذبات کو مخدوم نے کس قدر نرمی اور خوشگواری کے ساتھ پیش کیا ہے ۔

اے جان نغمہ ، جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سرے رہ گزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

ترقی پسند تحریک میں اگر انقلابی شاعری کی بات ہو اور سردار جعفری کا ذکر نہ آئے تو یہ شاعر کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ وہ ایک انقلابی اور باغی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔انہوں نے اس دور کے حالات کو انقلابی انداز میں پیش کیا ہے ۔ ان کا لب و لہجہ پر جوش اور انداز ولولہ خیز ہے جس سے خون میں حرارت بڑھ جاتی ہے۔ان کے انقلاب میں بلند آہنگی ہے جو انسان کو سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ سردار بھی پرانے نظام سے ناآسودگی کا اظہار بڑے ہی والہانہ اور گھن گرج کے

ساتھ کرتے ہیں۔ بلند آہنگی ہی ان کی شاعری کا حسن ہے جس کو وہ پوری شاعری میں برتتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انقلاب اور بغاوت اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ نظم ''بغاوت'' میں وہ اپنے اسی خیال کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس میں پرانی تہذیب، سرمایہ دارانہ نظام، جابر وظالم حکومت، مسخ شدہ مذہب سے بغاوت کا اعلان کیا گیا ہے ۔

بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر ہے بغاوت ہے خدا میرا

ادھر کیفی اعظمی جو کبھی رومان پسند تھے، آج ان کے خون میں بھی چنگاری کی لہر دوڑ رہی ہے انہوں نے سب کو سرخ علم اٹھا کر چلنے کی دعوت دی ہے۔ وہ سب کا بھلا چاہتے ہیں، سب کی خیرخواہی چاہتے ہیں لیکن بڑی ہی نرمی کے ساتھ بلکہ انقلاب کو ایک حسین ساز سے تشبیہہ دی ہے اور سب سے اسے گنگنانے کے لیے کہا ہے ۔

کاندھے پہ رکھ کے سرخ علم آن بان سے
یہ ساز انقلاب ہے کچھ گنگنایئے

کچھ ترقی پسند شعراء ایسے بھی تھے جن کی شاعری میں چیخ ، پکار نہیں تھی، نہ ہی نعرے بازی کی کیفیت تھی بلکہ ان کا لہجہ بڑا ہی نرم اور منفرد تھا۔ ساحر لدھیانوی اور اختر الایمان کی نظمیں اسی طرح کی ہیں ۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی شاعری میں سماجی وسیاسی احتجاج کا فقدان ہے۔ فرق بس یہ ہے کہ وہ خطیبانہ اندازاور انقلابی لب ولہجہ نہیں اختیار کرتے۔ ان کے یہاں اپنی بات کہنے کا ایک جدا انداز ہے۔

ترقی پسند شعراء اور ان کی مزاحمتی، احتجاجی اور انقلابی شاعری کا مختصر جائزہ

ترقی پسند شاعری کو بلندیوں تک لے جانے میں ان شعراء کا بڑا ہاتھ تھا جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے فکروفن کے ہر گوشے ایسے روشن کیے ہیں جنہیں بدلتے ہوئے زمانے کی تاریکی بھی بے نور نہیں کرسکی۔ ان شعراء نے اس زمانے کے حالات کو ہی نہیں پیش کیا بلکہ اس کے خلاف احتجاج بھی کیا اور روایت سے بغاوت بھی کی۔ ان کی شاعری اس بات کی ضامن ہے کہ ظلم و استحصال کے خلاف آواز بلند کرنا بے حد ضروری ہے اس سے اردو شاعری میں ایک نئے رنگ و آہنگ کا اضافہ ہوا۔ دراصل اس نئے رنگ و آہنگ کی فضا پہلے سے ہی تیار ہو چکی تھی۔ اس کو پورے طور پر عملی جامہ ترقی پسند شعراء نے پہنایا۔ یوں تو ترقی پسند شعراء کی فہرست بہت طویل ہے جس میں خاص و عام سبھی شامل ہیں لیکن یہاں چند اہم شاعروں کا ذکر کیا جائے گا اور ان کی شاعری کا مختصر جائزہ بھی لیا جائے گا۔

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں سید مطلبی فرید آبادی، علی جواد زیدی، سلام مچھلی شہری، مسعود اختر جمال نوخیز شعراء کی صف میں شامل تھے۔ ابتداء میں ان سبھی کی شاعری میں رومانیت کا رنگ غالب تھا لیکن وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں انقلابی رنگ پیدا ہونے لگا جس نے ادب کا رخ موڑ دیا۔ سید مطلبی فرید آبادی ایک ادھیڑ عمر شاعر تھے اور اپنے اسلوب اور زبان و بیان سے نوجوان ترقی پسند شعراء سے مختلف تھے۔ علی جواد زیدی اس دور کے نرم لہجے والے شعراء کی صف میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی ابتدائی شاعری رومانی ہے لیکن بعد میں جو انقلابی شاعری کی وہ اپنے آپ میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی انقلابی نظموں میں گھن گرج کے بجائے گیتوں کا بہار اور گھلاوٹ ہے۔ ان کی شاعری میں محبوب ایک ہندوستانی گھریلو لڑکی ہے جو وفادار بھی ہے اور معصوم بھی۔ زیدی اس کو بڑے ہی نرم انداز میں سمجھاتے ہیں اور اپنا انقلابی رویہ کچھ دیر کے لیے ترک کر دیتے ہیں۔ ان کی نظم ''تم پوچھ رہے ہو کیا ہوگا'' میں وہ بڑے ہی سلیقے سے معشوق

کے سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

تم پوچھ رہی ہو کیا ہوگا؟ کیا ہوگا دل کی امنگوں کا؟
خود ہم نے جن کو چھیڑا ہے کیا ہوگا ایسی جنگوں کا؟
اب کون نشاں لہرائے گا دنیا میں بھوکوں ننگوں کا؟
تم پوچھ رہی ہو کیا ہوگا؟

نرم لہجے میں شدت جذبات کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان کا محبوب کوئی عام محبوب نہیں ہے۔وہ صرف عشق ومحبت تک ہی محدود نہیں بلکہ بعض اوقات وہ اپنے محبوب کو بغاوت اور انقلاب کی تلقین بھی کرتے ہیں۔نظم ''شرائط'' میں انہوں نے دلہن کے لیے کچھ شرطیں رکھی ہیں ۔

بجا کہ کھیل رہا ہوں شباب سے اپنے
بجا کہ دن مری شادی کے بھی ہیں آئے ہوئے

خطا معاف کہ جچتی نہیں نگاہوں میں
یہ دیویاں پس چلمن نظر جھکائے ہوئے

مجھے تو ہم دم و ہمزاد چاہیے ایسی
جو دست ناز میں خنجر بھی ہو چھپائے ہوئے

نکل پڑے سر میداں اڑا کے آنچل کو
بغاوتوں کا مقدس نشاں بنائے ہوئے

اٹھا کے ہاتھ کہے انقلاب زندہ باد
لہو سے مثل دلہن مہندیاں رچائے ہوئے

سہیلیوں کو بھی ساون کے گیت کے بدلے
وطن کے گیت سنائے علم اٹھائے ہوئے

حسین جسم کو سونے کے زیوروں کے عوض
سنان و خنجر و پیکاں سے ہو سجائے ہوئے

سلام مچھلی شہری بھی ادب میں رومانی شاعر کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے لیکن حالات کے مدنظر ان کے کلام میں بھی انقلاب کی جھلک آہی گئی۔ ان کا مجموعۂ کلام ''میرے نغمے'' کو انہوں نے دوحصوں میں تقسیم کیا ہے جس میں ''پھول'' کے عنوان سے رومانی اور''انگارے'' کے عنوان سے انقلابی نظمیں تھیں اس کے ابتداء میں یہ شعر ہے ۔

میرے نغمے باغی ہیں، میرے نغمے پیارے بھی
اب جس کا ذوق نظر ہو پھول بھی ہوں انگارے بھی

اختر انصاری ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ ہی اس کے ممتاز شعراء کی صف میں شمار کیے جانے لگے تھے۔ پہلے وہ افادیت اور مقصدیت کے نظریے کے قائل نہیں تھے لیکن ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونے کے بعد انہوں نے افادی ادب کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا جس میں یہ نظریہ پیش کیا کہ جو ادیب ادب برائے ادب کے قائل ہیں وہ بھی اپنی تخلیقات کو زمانے کے حقائق سے بچا نہیں سکتے۔ ''نغمۂ روح'' ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ان کی نظموں پر انداز بیان کے اعتبار سے جوش،حفیظ اوراختر شیرانی کے اثرات نمایاں ہیں۔ان کے یہاں ایک رومانوی افسردگی ہے ایک اداسی ہے لیکن اس میں درد بھی ہے اوراس درد کی چاشنی سے ان کے کلام میں اور بھی لطف پیدا ہوگیا ہے۔''آبگینے'' اور''خوں ناب'' ان کی قطعات کے مجموعے ہیں جو ہمیشہ نوجوانوں کے دلوں کو دھڑکاتے رہیں گے۔

ان آنسوؤں کو ٹپکنے دیا نہ تھا میں نے
کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے

میں ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی
پہنچ کے قلب میں بن جائیں گے یہ انگارے

اردوادب میں فراق گورکھپوری اپنی عشقیہ شاعری کے لئے زیادہ مشہور ہیں اس کے ساتھ

ان کی زبان کی سادگی، شیرینی اور میٹھے الفاظ کا استعمال، اردو ہندی کے الفاظ کا امتزاج، روزمرہ کی ٹکسالی زبان اورمحاوروں کا موزوں استعمال ان سب چیزوں نے مل کر ان کواونچا مقام دلایا ہے۔ وہ اردو کے ان اہم شاعروں میں سے تھے جنہوں نے اردوشاعری کے رخ کوایک ایسی سمت کی طرف موڑ دیا جوسماجی اورسیاسی زندگی کو منقلب کرنے والی ہے۔چونکہ بنیادی طور پروہ جمالیاتی شاعرہیں اس لئے انقلابی اشعاران کی شاعری میں بہت تھوڑے ہیں۔جوان کے انقلابی جذبے کے غماز ہیں لیکن جتنے بھی ہیں وہ اہم ہیں۔فراق میں ایک بت شکن شاعرمدتوں سے پوشیدہ رہا ہے اوراس زمانے میں بھی وہ پوشیدہ رہاجب وہ عملی حیثیت سے سیاست کے میدان میں تھے لیکن 1936ء میں ترقی پسندتحریک سے وابستہ ہونے کے بعدوہ شاعر جمال سے شاعرانقلاب بھی بنتے ہوئے نظرآتے ہیں۔اسی زمانے میں انہوں نے نئے انداز سے غزل کو دوسری سمت موڑ دیا۔

فراق ہم نوائے میر و غالب اب نئے نغمے
وہ بزم زندگی بدلی وہ رنگ شاعری بدلا

دکھا تو دیتی ہے بہتر حیات کے سپنے
خراب ہو کے بھی یہ زندگی خراب نہیں

رکا ہے قافلۂ غم کب ایک منزل پر
کب انقلاب زمانے کا ہم رکاب نہیں

زمیں جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے ، کوئی ذرہ بھی محو خواب نہیں

ترقی پسندتحریک کے اس دورمیں جن شاعروں نے غزل گوئی کونئی آب وتاب عطا کی اور تحریک سے بے حد متاثراورقریب بھی رہے، ان میں فراق کو خاص اہمیت حاصل ہے۔اس وقت برطانوی حکومت ہندوستانیوں کو چند مراعات دے کر انہیں جس طرح بہلانے کی کوشش میں تھی یہ سب فراق اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔لہٰذاوطن پرستوں کواپنی غزلوں کے اشعار سے ہوشیار

بھی کرتے ہیں اور بیدار بھی ۔

کچھ قفس کی تتلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرت پرواز کی باتیں کرو

یہاں قفس کی تتلیوں سے نور کا چھننا اور حسرت پرواز کی تمنا کے ذریعے فراق ہندوستانیوں کی روح میں گرمی اور حرارت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ساری باتیں الفاظ کے پردوں میں بیان کر دی گئی ہیں جو آزادی سے قبل ہندوستانی معاشرے اور عصری فکر کو علامتی انداز میں پیش کر رہی ہیں۔ فراق نے اسی طرح تقسیم ہند اور آزادی کے بعد پیدا ہونے والی سیاسی اور سماجی صورت حال کو بھی اپنی غزلوں میں جگہ دی ہے ۔

اے شب تار ، غم دوست تری عمر دراز
کہ زمانے میں نہیں صبح کے آثار ابھی

ابھی تو قافلے کچھ دن رہیں گے سرگرداں
ابھی تو گمرہیٔ راہبر کو دیکھتے ہیں

آزاد ہندوستان کی یہ وہ تصویر ہے جہاں لوگوں میں اخوت اور محبت کی جگہ نفرت اور خود غرضی آ گئی تھی۔ سیاسی رہنماؤں کی تنگ نظری اور ان کے فرقہ پرست مزاج پر بھی فراق نے گہری چوٹ کی ہے لیکن یہاں فراق کا لہجہ پر جوش نہ ہو کر اپنے اندر ایک تلخی لیے ہوئے ہے۔ غزل کے ساتھ ساتھ ان کی نظمیں بھی بہت مشہور ہیں۔ '' ترانۂ خزاں''، '' شام عیادت''، '' آدھی رات''، '' دھندلکا'' اور '' جگنو'' قابل ذکر ہیں۔ ان کی سیاسی اور سماجی نظموں میں '' دھرتی کی کروٹ''، '' شاہ نامہ آدم''، '' ڈالر دیس''، اور امریکی بنجارہ نامہ'' وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ان کی نظم نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر سید محمد عقیل رضوی فرماتے ہیں:

> '' فراق صاحب بنیادی طور پر ترقی پسند ماڈریٹ مارکسسٹ تو تھے ہی (وہ الہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے مقامی سکریٹری بھی رہ چکے تھے اور ان کے گھر پر انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہفتہ وار

> میٹینگیں بھی 45-1944ء تک ہوا کرتی تھیں) بس انہوں نے نظموں کا ترقی پسند رخ اپنالیا جس میں ان کی فکر کی رومانی حقیقت نگاری بھی شامل ہوگئی۔ رومانی اس لئے کہ رومانیت کے بغیر تو فراق صاحب کی شاعری زندہ رہ سکتی تھی اور نہ ہی فراق صاحب اور حقیقت نگاری اس لئے کہ وہ مادّی حقیقتوں کو ہی زندگی کی حقیقتیں سمجھتے تھے۔ زندگی میں یہی ان کو (Concrete) یعنی ٹھوس معلوم ہوتا تھا۔ پھر اسی چیلنج کے بعد انہوں نے سب سے پہلے نظم ''آدھی رات''، لکھی جو نئی نظم نگاری کی دنیا میں ایک نشان منزل (Land Mark) بن گئی۔'' [1]

جب فراق ترقی پسند تحریک میں شامل ہوئے تو انہوں نے نہ صرف ترقی پسندوں سے بیعت کر لی بلکہ گفتگو و مراسلوں میں اس بات پر زور دینے لگے کہ وہ نہ صرف ترقی پسند ہیں بلکہ مارکس کی تعلیمات سے متاثر بھی ہیں۔ مارکس ازم اور ترقی پسندی کا یہ علم فراق کی شاعری میں کچھ یوں نظر آتا ہے ؎

بے محابا انقلاب آنے کو ہے
ہوشیار اے اہل دنیا ہوشیار

زمیں جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے، کوئی ذرہ بھی محو خواب نہیں

اگر بدل نہ دیا آدمی نے دنیا کو
تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں

نظام دہر بدلے، آسماں بدلے، زمیں بدلے
لیے بیٹھا رہے کوئی حیات بے اماں کب تک

فراق وقت کے رخ سے الٹ رہی ہے نقاب
زمیں سے تا بہ فلک ہے اس انقلاب کی آنچ

ا (ورق تمام ہوا، مرتب: ڈاکٹر طاہرہ وحید، 2010، انجمن تہذیب نو پبلیکیشنز، الہ آباد، ص: 183)

مجاز ان ترقی پسند شعراء میں سے ہیں جنہوں نے ترقی پسند تحریک کے دور میں سب سے زیادہ مقبولیت اور ہردل عزیزی حاصل کی۔انہوں نے شاعری کو اس معراج تک پہنچایا جہاں تک بہت کم لوگوں کی رسائی ہوتی ہے۔ان کی شاعری کا مجموعہ بہت مختصر سا ہے جو''آہنگ'' کے عنوان سے جانا جاتا ہے یہ مختصر ضرور ہے لیکن اپنے آپ میں ایک منفرد شناخت کا حامل ہے۔ابتداء میں مجاز بھی ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے اوران کی عشقیہ شاعری نے دھوم مچادی۔ان کی عشقیہ شاعری میں ماضی کا تسلسل،حال کا شعور اور مستقبل کا خواب ملتے ہیں۔جوروح عصر کے ترجمان ہیں۔ ان کے اندرایک ایسا شخص پنہاں ہے جس کی کوششوں اور کاوشوں سے کارخانۂ حیات کے ہرلمحہ کو حرارت نصیب ہوتی ہے اور یہیں سے ان کی رومانی شاعری میں انقلاب کے عناصر شامل ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔شورش دوراں میں وہ کیا کیا اور قیمتی متاع حیات بھول جاتا ہے اوراپنے کو شدید ذہنی کوفت میں مبتلا پاتا ہے ۔

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدہ گریاں بھول گئے

اے شوق نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصور کیا کیجے ہم صورت جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصل بہاراں رخصت ہم لطف بہاراں بھول گئے

یہاں سماجی نظام کی ٹوٹتی بکھرتی تصویراوراقتصادی حالات کا اثر بہت نمایاں ہے۔آزادی سے قبل ہندوستان کا نوجوان جس قدراپنے گردوپیش سے ناآسودہ اورذہنی الجھنوں کا شکار تھا،کم و بیش وہی الجھنیں 1947ء کے بعد بھی اس کا پیچھانہیں چھوڑتیں۔مجاز یوں تو راست بیانی کے قائل نہیں ہیں ان کی شاعری میں عام طور پر اظہار علامتوں اوراشاروں میں ملتا ہے لیکن بعض اشعار اور نظموں میں انہوں نے مزاحمت واحتجاج کو واضح انداز میں بھی نظم کیا ہے ۔

بہ ایں رندی مجاز اک شاعر مزدور و دہقاں ہے
اگر شہروں میں وہ بدنام ہے بدنام رہنے دے

مجاز کا محبوب کوئی عام محبوب نہیں ہے وہ اپنے محبوب سے جرات مندانہ اقدام کا متمنی ہے اور ساتھ ہی وہ انقلاب کے بھی خواہاں ہیں۔ انقلاب بھی ایسا جو دونوں مل کر پیدا کریں جس میں دو دلوں کی دھڑکنوں پر فرسودہ نظام کی بندش بے جا نہ ہوتا کہ دونوں آنے والے دور کے لئے چراغ راہ بن جائیں ۔

تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوس نظر
مجھ کو دعویٰ کے ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

مجاز کے انقلاب کا اصل تصور ان کی نظموں، نوجوان سے، اور نوجوان خاتون سے، میں نظر آتا ہے، جن میں محبت، زندگی کی توانائی، پرامید مستقبل کا تصور، اور نئی نسل پر اعتماد، جھلکتا دکھائی دیتا ہے اور انقلاب اپنی نئی جہتوں میں نظر آتا ہے۔ اور اگر یہ کہنا بالکل غلط نہیں ہوگا کہ مجاز پہلے شخص ہیں جنہوں نے انقلاب کو مروجہ معنوں سے الگ کرکے دیکھا اور اسے تہذیبی، سماجی، اور بڑے پیمانے پر سوچنے میں استعمال کیا۔ ''نوجوان'' کے چند بند ملاحظہ ہوں

ترے خرام میں ہے زلزلوں کا راز کہاں
ہر ایک گام پر اک انقلاب پیدا کر

اسی طرح مجاز ''نوجوان خاتون'' سے میں عورتوں کو صرف ان کی ذمہ داریوں کا نہیں بلکہ ان کی اہمیت کا بھی احساس دلایا ہے۔ انہوں نے پہلی بار عورت کو پردے اور گھر کی چاردیواری سے باہر نکالا ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ جنگ آزادی میں بھی برابر کا شریک کیا ہے۔ انہوں نے سماج کی کشمکش، محبت کی راہ میں حائل دشواریوں کو دیکھ کر اپنی تصوراتی عورت کو شعور کی روشنی بخشی ہے اور اسے مسائل زمانہ سے دوچار ہونے کے مواقع اور دعوت دے رہے ہیں۔ وہ اس کی دنیا کی وسعت

کوقصرومحل سے بڑھا کر ارض وسما تک پہنچا دیتے ہیں ۔

تری نیچی نظر خود تیری عظمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا

ترا زیر نگیں گھر ہو محل ہو ، قصر ہو کچھ ہو
میں یہ کہتا ہوں تو ارض و سما لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے کا ٹیکہ مرد کی قسمت کا تارا ہے
اگر تو ساز بیداری اٹھا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مجاز کا انقلاب بھی دوسرے شعراء سے مختلف تھا وہ اس انقلابی فضاء میں سارے قید و بند توڑ کر وطن کے آفتاب حریت کے جگمگانے کے خواب دیکھنے لگے اوراس خواب کی تعبیر کے لیے تمام پریشانیوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرتے ہوئے اپنی منزل مقصود کو پانے کے لئے بے تاب ہو اٹھے۔ ان کے ذہن میں انقلاب کا ایسا تصور ابھرنے لگا جہاں عدل وانصاف،محبت واخوت،سماجی مساوات اور انسان دوستی کا دوردورہ ہو۔اس کے لیے چاہے پوری قوم کو اپنے خون کا ایک ایک قطرہ ہرمحاذ پر کیوں نہ بہانا پڑے۔ان کی دور رس نگاہوں نے آنے والے دور کی تصویر دیکھ لی تھی۔وہ اپنے ہم وطنوں کو آنے والے انقلاب کے خطرات سے آشنا کر رہے تھے جس سے ان کی تشکیل ہوسکے۔کیونکہ اس جاگیردارانہ وسرمایہ دارانہ نظام میں اپنے حقوق کے لئے لڑنا ضروری تھا ورنہ وہ ہمیشہ اسی طرح ظلم واستحصال کا شکار بنتے رہیں گے ۔

اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونی سبق
آسماں پر خاک ہوگی فرق پر رنگ شفق

اوراس رنگ شفق میں باہزاراں آب وتاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شور انقلاب

مجاز کی انقلابی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے شارب ردولوی اپنے مضمون ''ترقی پسند شعری فکر اور مجاز'' میں کہتے ہیں:

> ''مجاز اپنی نظموں، وہ رومانی ہوں یا انقلابی زیادہ کھل کر سامنے آتے ہیں حالانکہ ان کی انقلابی نظموں کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور نہ وہ گھن گرج، والے انقلابی شاعر ہیں۔ان کے انقلاب کا تصور ان کے ہم عصر شعراء سے مختلف ہے۔ان کا تصور انقلاب مومن کے جہان کو تہہ و بالا کر دینے والا تصور بھی نہیں ہے۔انقلاب ان کے یہاں بہتر تبدیلی کی علامت ہے ان کی شاعری بیشتر مزاحمت اور احتجاج کی شاعری ہے۔'' [۱]

مجاز کا یہ تصور انقلاب انہیں باغی ہونے پر آمادہ کرتا ہے نظم ''آوارہ'' اسی سر پھرے باغی کی ترجمان ہے جو مفلسی اور بے روزگاری سے عاجز آ کر اپنے ہی شہر کی سڑکوں پر آوارہ گھومنے پر مجبور ہے۔لیکن یہ کیفیت یوں ہی نہیں ہے اس کے پس پردہ مجاز کے دور کے معاشی و سماجی حالات کارفرما ہیں۔سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے ظلم و تشدد کے شکار ہو کے اس وقت کے نوجوان بے کار و آوارہ پھر رہے تھے انہیں وہ معاشی آسودگی حاصل نہیں ہو رہی تھی جس کو حاصل کرنے کے لئے وہ دل و جان سے کوشاں تھے اس لئے اس نظم میں جذبات کی شدت ہے اور ایک سرکش باغی کی ساری سرکشی و آوارگی پورے شباب پر نظر آتی ہے جس کے ذہن میں پورے نظام کو درہم برہم کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔کس طرح اس کی آرزوؤں اور خواہشوں کا خون ہوتا ہے اور کس طرح مفلسی، بے کاری، بے روزگاری اور ناکام امیدیں اس کے نصیب کو بدل کر رکھ دیتی ہیں۔اس طرح اس نظم کے ذریعے اس دور کے تمام باغی حساس اور مضطرب نوجوانوں کے تصورات اور جذبات کو پیش کیا گیا ہے۔

---

۱ (عالمی اردو ادب، نومبر 2011ء عالمی اردو ادب، دہلی، ترقی پسند شعری فکر و مجاز، شارب ردولوی)

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں

اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے

اے غم دل کیا کروں،اے وحشت دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ ، جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی ، جیسے بیوہ کا شباب

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

''آوارہ'' کے متعلق وارث علوی اپنے مضمون ''مجاز کی یاد میں'' میں خیال پیش کرتے ہیں:

''مجاز نے ایک اور احتیاط بھی کی ہے بایں ہمہ شوریدہ سری اضطراب اور اندرونی ہیجان کے مجاز نے آوارہ کو عاشق زار بتایا عشق کا جذبہ بڑا اغاصبانہ ہے ۔ دوسرے جذبات کو پنپنے نہیں دیتا۔آوارہ کے امیج کی تشکیل میں محرومی اور آرزومندی ،مظلوم انسانیت کے لیے دردمندی

اورنظام جبر کے خلاف بغاوت کے جذبات بھی یکساں اہمیت رکھتے
ہیں۔چنانچہ جیسا کہ کہا جاچکا ہے کہ عشق کے التہاب کو یہاں رومانوی
محبت کی نرم آنچ میں بدل دیا گیا ہے۔عشق جنس اور جبلت حتیٰ کہ
محبوب تک سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے وہ اپنا حاصل آپ ہے۔
رومانی محبت کی اساس جنس اور جسم ہی رہتی ہے آوارہ محبت میں ناکامی
کے سبب دوسرے شہر کا رخ کرتا ہے یہاں عاشقی میں جلا وطنی
اورترک وطن کا عنصر اورآوارگی میں غریب الوطنی کا احساس بھی شامل
ہوجاتا ہے۔'' ا؎

''سرمایہ داری'' مجاز کے انقلابی رجحان کے سلسلے کی ایک اہم نظم ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام کی معاشی پریشانیوں، اقتصادی استحصال، دولت کی غلط تقسیم اور دوسرے غیر منصفانہ رجحانات کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ جذباتی رنگ پوری نظم پر حاوی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی انتہا اور اس کی مخالفت کرنے والوں کے زور وشور کو دیکھتے ہوئے مجاز کو یہ یقین ہونے لگا تھا کہ اب اس نظام کی موت جلد ہی ہوگی اور اس نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے وہ پورے طور پر کوشش وسعی کرتے ہیں۔ یہ نظام مفلس کے نشیمن کے لیے آندھی کے مانند ہے اور کاشتکاروں کے کھلیان کے لیے بجلی۔ اس کی ہلاکت خیزی شاعر کو بدمست نظر آنے لگتی ہے اور اس کے قصر استبداد کے ستون ڈگمگانے لگتے ہیں تو اس روح انقلاب کو جو عوام میں سرایت کر چکی ہے آندھی کی شکل دینے کو للکارتے ہیں ؎

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے
بتاؤں کیا تمھیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے

یہ وہ آندھی ہے جس کی رو میں مفلس کا نشیمن ہے
یہ وہ بجلی ہے جس کی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے

یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے

ا؎ (''مجاز کی یاد میں''، وارث علوی، نیا دور، ستمبر، اکتوبر 2012، جلد 67 شمارہ 706 لکھنؤ، ص: 31)

یہ انسانی بلا خود خون انسانی کی گاہک ہے
وبا سے بڑھ کر مہک، موت سے بڑھ بھیانک ہے

''ہمارا جھنڈا'' بھی مجاز کی انقلابی نظموں میں سے ہے اس میں انقلابی جدو جہد کرنے والوں کی ایسی تصویر پیش کی گئی ہے جو مفلسی اور بھوک کی تڑپ کے بعد بھی باہمت نظر آتے ہیں۔ راہ میں تمام دشواریوں اور پریشانیوں کے بعد بھی ان کے ارادے کمزور نہیں پڑے۔ تمام مصائب کا سامنا کرنے سے ان کے عزم اور پختہ ہو گئے ہیں۔

ہاں یہ سچ ہے بھوک سے حیران ہیں
پر یہ مت سمجھو کہ ہم بے جان ہیں
اس بری حالت میں بھی طوفان ہیں
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں
کب بھلا دھمکی سے گھبراتے ہیں ہم
دل میں جو ہوتا ہے کہہ جاتے ہیں ہم
آسماں ہلتا ہے جب گاتے ہیں ہم
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

فیض احمد فیض اردو شاعری کی تاریخ میں اپنے لہجے اور انداز بیان کے باعث ایک منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔ یوں تو دوسرے ترقی پسند شعراء کی طرح ان کی شاعری کا آغاز بھی کلاسیکی اور رومانی انداز میں ہوتا ہے ان کے پہلے شعری مجموعہ ''نقش فریادی'' میں کئی غزلیں اور نظمیں اس کی مثال ہیں جو 1935ء سے قبل کی ہیں لیکن 1936ء میں جب وہ ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شریک ہوئے تو ان کی طرز فکر میں ایک انقلاب سا برپا ہو گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی کے بعد فیض نے باقاعدہ مارکس اور اس کے ہم خیال فلسفیوں کے ادب کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور اشتراکیت کو پوری طرح قبول کر لیا۔ 1935ء کے بعد سے فیض کے سیاسی اور سماجی خیالات کمیونسٹ

پارٹی اوراشتراکیت سے بے حدمتاثر ہوئے اور یہ محض خیالات تک محدود نہیں رہا بلکہ انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کے لیے باقاعدہ کام کیا۔راولپنڈی سازش میں قیدوبند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔متعدد ٹریڈ یونینوں کے سرگرم کارکن رہے ۔فیض کے ہم عصروں میں بہت اچھے شاعر موجود تھے جودور کے حالات اورمسائل سے اچھی طرح آشنا تھے لیکن فیض ان میں سب سے زیادہ مقبولیت، ہردل عزیزی،عزت وشہرت کے حامل رہے۔اردوتنقید کی مشہورومعروف شخصیت کلیم الدین احمدفیض احمدفیض کی تعریف میں رقم طراز ہیں:

''فیض میں دوچیزیں ہیں جودوسرے ترقی پسندشاعروں میں نہیں ملتیں۔پہلی چیزتو یہ ہے کہ فیض کونظم کے فنی تقاضوں کااحساس ہے اوروہ ان فنی تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔دوسرے ترقی پسند شعراءکونظم کے فنی تقاضوں کااحساس نہیں اوریہی کمی ان کی ناکامی کاسب سے بڑا سبب ہے۔دوسری چیز جوفیض میں ملتی ہے وہ ایک قسم کی خودضبطی ہے وہ اپنے کو لیے دیے رہتے ہیں اور دوسرے باغی شاعروں کی طرح اپنے نعروں سے آسمان کونہیں ہلاتے۔وہ ترقی پسندی کا یہ مطلب نہیں سمجھتے کہ بیدار ہو بیدار ہوکا شورمچایا جائے۔انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائیں ''تلوار اٹھاتلواراٹھا'' ''مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم''''ایشیا چھوڑدو!ایشیا چھوڑدو!'' ''بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا''اوراسی قسم کی چیزوں کی یلغارکوبہترین سمجھا جاتاہے۔ان کی آواز دھیمی ہے وہ دبی زبان سے باتیں کرتے ہیں اوراس کی وجہ یہی ہے کہ وہ افکاروجذبات کی رو میں بہہ نہیں جاتے۔افکاروجذبات پرضبط کی مہریں لگاتے ہیں۔''[1]

فیض کو اپنے وطن سے بے حدمحبت تھی۔یوں تو ہرشخص کو اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے لیکن جہاں گفتارورفتار پر پابندی لگی ہو،محبّ وطن پرظلم ہورہے ہوں،لکھنا تو دور بات کرنے پربھی پابندی

---

[1] (فیض احمد فیض عکس اور جہتیں ۔شاہ ایلی ۔ 2011 معارپبلی کیشنز دہلی ۔ص: 23)

لگا رکھی ہو، جہاں موت زندگی سے ہمکنار ہو رہی ہو، ایسے میں بڑے بڑے وطن پرست پیچھے ہٹ جاتے ہیں لیکن کچھ محبّ وطن ایسے بھی ہیں جو اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وطن پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لئے بے چین ہیں، بے تاب ہیں۔ فیض کو بھی اپنے وطن سے ایسے ہی محبت تھی۔ ملک کی آزادی ان کا خواب تھا اور اس آزادی میں انہوں نے حوصلہ مندی کے ساتھ جدوجہد کی اس کے عوض میں انہیں جیل جانا پڑا، مقدمے جھیلنے پڑے اور نہ جانے کن کن سازشوں کا شکار ہونا پڑا لیکن ان کی زبان پر یہ تھا۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہے انگلیاں میں نے

لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

وہ وطن کی محبت سے اس طرح سرشار تھے کہ اپنی زبان کو ایک حلقہ زنجیر میں رکھنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹے۔ ان کی یہ وطن پرستی صرف یہیں تک محدود نہیں وہ تو اپنے وطن پر دل و جان نثار کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم ، کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

ہے اہل دل کے لئے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

یوں ہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے ، نہ اپنی ریت نئی

یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے ، نہ اپنی جیت نئی

اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے

مندرجہ بالا اشعار فیض کی وطن پرستی کی عمدہ مثال ہیں جس میں وہ وطن سے محبت کے ساتھ ساتھ رسم دنیا کی بھی کیفیت بیان کررہے ہیں جس کے تحت کوئی بھی شخص سراٹھا کر نہیں چل سکتا تھا مثلاً کسی کو حکومت کے خلاف اظہار خیال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ہم وطنوں پر اس طرح سے ظلم کیے جارہے تھے جس کی کوئی انتہا نہیں تھی بعض اس ظلم وستم سے گھبرا کر اپنا راستہ تبدیل کرنے لگے لیکن بعض لوگ اس میں ایسے بھی تھے جو فرسودہ نظام سے احتجاج کرنے کی قوت رکھتے تھے۔فیض بھی انہیں میں سے ایک تھے وہ اس وقت کے حالات سے اچھی طرح واقف تھے اور اپنے ملک کی فلاح و بہبود کے لیے حکومت پر لب کشائی کررہے تھے جہاں سنگ وخشت پر تو پہرے لگے تھے لیکن سگ آزاد پھرتے تھے،ایسے حالات میں ان پر ظلم ہونا لازمی تھا جب کہ ان کی شاعری کا انداز اور لب ولہجہ وہ نہیں تھا جو اس دور میں دیگر شعراء نے اختیار کیا تھا۔فیض یوں تو حسن وعشق کے شاعر تھے ابتدا میں رومانی شعر کہے لیکن اس میں بھی ان کا انداز جداگانہ ہے ان کا لب ولہجہ دوسرے شعراء سے مختلف ہے ان کے اشعار پختگی کے ساتھ ساتھ جلوۂ جاناں کی عکاسی کرتے ہیں۔لیکن جلد ہی انہیں رومان سے انقلاب کی منزلیں طے کرنی ہے۔جس میں وہ سخت الجھنوں میں پھنس جاتے ہیں۔ یوں تو ہر ترقی پسند رومان سے انقلاب کی جانب جاتا ہے لیکن یہ سفر اتنا آسان نہیں ہے ۔اس کیفیت کو وہ اپنی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اس نظم میں فیض کے دو کردار نظر آتے ہیں ایک تو وہ شخص جس کے دل میں محبوب کو پانے کی

زبردست خواہش ہے اوراس کو پانے کے لیے وہ کس قدر بے چین ہے اس کو یقین ہے کہ اگراس کا محبوب اسے مل جائے تو ان تمام مشکلات کا خاتمہ ہوجائے لیکن پھر یکا یک اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں سینکڑوں برسوں سے لوگوں پر جو ظلم وستم ہورہے ہیں۔جابر قوتیں اپنے ظلم واستبداد سے مظلوموں کا استحصال کررہی ہیں،ان سب مصائب کو دور کر کے جو سکون حاصل ہوگا اس کا لطف کچھ اور ہی ہوگا اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ترک محبت کرنے پر مجبور ہیں۔رومان سے انقلاب کی جانب آتے آتے ایک جرأت مندانہ اظہار یوں کرتے ہیں ۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول ، زباں اب تک تیری ہے

ایسے وقت اور حالات میں فیض آواز بلند کرنے کو کہہ رہے ہیں جہاں زبان کھولنے پر بھی پابندی ہے تو جبر وظلم کے خلاف احتجاج کرنا بڑی دور کی بات ہے ایسے میں یہ فیض کا ہی کمال فن تھا کہ انہوں نے کسی کی پروا کیے بغیر ایسی شاعری کی جو سامراجیت پر ضرب کاری کرتی ہے۔ان کا یہ عزم اورحوصلہ قابل تعریف ہے ۔اس کے لیے انہوں نے کیا کیا پریشانیاں اٹھائیں،کتنی مرتبہ قید خانے کی صعوبتیں برداشت کیں جس میں درزنداں پر صبا کی دستک سنائی دے رہی تھی۔فیض ترقی پسند ضرور تھے لیکن ان کا انداز بیان ان کو دوسرے ترقی پسند شعرا سے منفرد کرتا ہے۔انہوں نے اپنا ایک دھیما مزاج قائم کیا جس میں خود ضبطی کو بھی جگہ دی۔ان سے مختلف دوسرے ترقی پسند شاعروں نے اپنی بلند آہنگی سے شاعری کا رخ دوسری طرف موڑ دیا لیکن فیض کورومانی رویہ ہی عزیز رہا اور اس نرم لہجے میں بھی انہوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پیش کیا یہ کسی عام شاعر کے بس کی بات نہیں تھی۔یا یہ کہیے کہ انہوں نے رومانی لہجے میں انقلابی شاعری کی ہے اورایسی انقلابی شاعری جس کو پڑھ کر دل جھوم اٹھتا ہے۔یہ فیض کا ہی قرینہ ہے کہ انہوں نے روایت کے مطابق اپنی محبوبہ کے لیے رسوا ہوتے عاشق کو نکال کر اسے انقلابی بنا دیتے ہیں۔اسے دوسرے نظریے سے دیکھیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے اپنے دردوغم کے ساتھ سیاسی اورسماجی مسائل کے حل کی طرف اشارہ کر کے اپنے سیاسی شعور کا بھی اظہار کیا ہے جو سیاست اور غنائیت کا حسین امتزاج ہے ۔

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب سر رہ گزار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے شب انتظار چلی گئی
مرے ضبط حال سے روٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سر روسیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سر بزم یار چلے گئے

نہ سوال وصل نہ عرض غم نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دل زار کے سبھی اختیار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رخ وفا ، یہ رسن ، یہ دار کروگے کیا
جنہیں جرم عشق پہ ناز تھا وہ گنہگار چلے گئے

فیض کی شاعری میں انقلاب کے ساتھ ایک عجیب طرح کی لذت بھی موجود ہے۔ جو مئے کی لذت کے مانند ہجو پڑھنے والے کو بے حد لطف اندوز کرتی ہے اور اس مئے کی مستی میں کوئی محرومی، ناامیدی، افسردگی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ اس میں امید، عزم، حوصلہ اور جذبات کی مدھم لے کے ساتھ جا بجا نظر آتا ہے۔ ''صبح آزادی'' فیض کی سیاسی نظموں میں ایک منفرد اور معنی آفریں نظم ہے جس میں ناامیدی بھی ہے اور یاس بھی ، آزادی کی خوشی بھی ہے اور غم بھی۔ اس نظم میں جذبہ وفکر ایک دوسرے میں تحلیل ہوگئے ہیں۔ کہیں افسردگی ، کہیں عزم و حوصلہ اس نظم کی نمایاں خصوصیات ہیں اور صورت حال اور تصورات کا بیان براہ راست نہیں بلکہ رمز و کنایے، استعاروں اور علامتوں کے طور پر کیا گیا ہے جس سے فیض کے گہرے مشاہدے ، تجربے اور نادر بصیرتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

یہ داغ اجالا یہ شب گزیدہ شہر
وہ انتظار تھا جس کا ، یہ وہ سحر تو نہیں

یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جاکے رکے گا سفینۂ غم دل

وطن کی محبت اور آزادی کے جذبے سے سرشار اس نظم میں اس آزادی کا ذکر ہے جس کے وہ منتظر تھے۔آغاز میں اس آزادی کو لے کر افسردگی کا اظہار کیا گیا ہے لیکن آخر میں ایک امید ہے جس پر پورا یقین ہے کہ ہم کو منزل ابھی تو نہیں ملی لیکن جلد ہی ہم اس منزل تک بھی پہنچ جائیں گے جس کے ہم ہمیشہ سے خواہش مند ہیں،تو کیا ہوا ابھی رات کی تاریکی چھائی ہے ،لیکن ہر رات کے بعد ایک صبح نمودار ہوتی ہے جو آفتاب کو پورے آب وتاب کے ساتھ تاریکی کے قصر سے نکال کر دنیا کے سامنے لاتی ہے اور دنیا کے ہر گوشے گوشے کو منور کر دیتی ہے ۔

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیض نے لوگوں کو اپنے وقت اور ماحول کے پرآشوب حالات کا مقابلہ کرنا جس انداز سے سکھایا تھا وہ ایک مثال ہے۔ان کی شاعری میں بدلتے ہوئے وقت اور آنے والے زمانے کی تبدیلیوں کی لہر دیکھی جاسکتی ہے۔ان کے زمانے میں ایک طرف تو لوگوں کی ذہنیت میں تبدیلی آرہی تھی تو دوسری طرف ملک کا جغرافیہ بھی تبدیل ہورہا تھا۔اس طرح فیض کا زمانہ ایک نئی تاریخ مرتب کررہا تھا۔ان سخت حالات میں بھی فیض نے اپنے باطن کی آواز کو بہت ہی سلیقے سے اور ایک خاص انداز اور نرم لب و لہجے میں اس دنیا کے سامنے رکھا۔اس طرح ان کی شاعری عوام کے دکھ درد کو سمجھنے اور بانٹنے میں ممدومعاون ثابت ہوئی جس سے مظلوموں کو ان کے حقوق کے لئے آواز بلند کرنے میں مدد ملی۔وہ زندگی اور ادب سے متعلق ایک بھرپور نظریہ رکھتے تھے:

> ''ہر دور کا ادب اپنی بساط کے مطابق اور اپنے رنگ میں حقیقت پسند تھا۔ چنانچہ موجودہ ادب میں انقلاب کی بنیادی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس دور میں ادیبوں کا نقطۂ نگاہ حقیقت پسند ہو گیا ہے بلکہ یہ کہ اس دور میں حقیقت کسی موہوم، ان دیکھی، فوق الفطرت چیز کا نام نہیں ہے اس لیے حقیقت کے معنی ہیں۔ ہمارا مجموعی سماج نظام اور اس کے تمام مظاہر۔ اس حقیقت میں ہمارے دیکھتے دیکھتے یہ تبدیلی واقع ہوئی ہے کہ اس میں پہلی دفعہ عوام ایک بہت ہی اہم اور نمایاں عنصر کی حیثیت سے داخل ہو گئے ہیں۔ موجودہ دور میں تعداد اور کردار دونوں لحاظ سے یہ طبقہ سب سے زیادہ اہم ہے کردار کے لحاظ سے اس لیے کہ ان کے تجربات میں باقی ماندہ طبقوں کی نسبت زیادہ خلوص، زیادہ جوش اور زندگی کی بنیادی قوتوں سے زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔'' [1]

معین احسن جذبی نے بھی شاعری کی دنیا میں غزل کے راستے سے قدم رکھا تھا یہی وجہ ہے ان کے یہاں اس نوعیت کی انقلابی اور ہنگامی نظمیں بہت کم ہیں جو سردار جعفری اور دیگر ترقی پسند شعراء کے یہاں پائی جاتی ہے۔ مارکسی تحریک کے سرگرم رکن ہونے کے باوجود بھی وہ مینیفسٹو شاعری کا حصہ نہیں بن سکے۔ جذبی انجمن ترقی پسند مصنفین کے اراکین میں شامل تھے اس لئے انہوں نے اپنے ہمعصروں کا ساتھ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شاعری کی۔ فیض کی طرح انہوں نے بھی ترقی پسندی کو اپنی شاعری میں جگہ دی لیکن واشگافانہ انداز میں نہیں بلکہ فن کے لطیف پیرائے میں جس کی وجہ سے تحریکی مقاصد کی ہنگامہ آرائی میں ان کی اپنی آواز گم نہ ہو سکی۔ ان کے کلام میں دار و رسن کا بھی ذکر ہے اور اجڑے ہوئے چمن کا بھی لیکن پھر بھی ان کی شاعری احتجاج کی بے ہنگم آواز بننے سے بچ گئی۔ جذبی نے کاکل گیتی کو سنوارنے کے لئے اپنے جذبات سے کام لیا جو باغیانہ سے زیادہ فنکارانہ ہے۔ اس وقت لوگوں کی ساری توجہ نظموں پر تھی ایسے میں بہت کم شاعر

---

[1] (فکر و تحقیق فیض نمبر (اپریل تا جون 2011) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی ص 8/9)

تھے جوتحریکی مقاصد کے تحت غزل کہنے کا عزم وحوصلہ رکھتے ہوں۔جذبی انہیں میں سے ایک شاعر ہیں جنھوں نے مارکسی افکاروخیالات اورتحریکی مقاصدکو بڑی خوبی کے ساتھ اپنی غزلوں میں اس طرح سمویاہے کہ غزل کاحسن بھی مسخ نہ ہوااورتحریکی مقاصدبھی پورے ہوجائیں ۔

ان بجلیوں کی چشمک باہم تو دیکھ لیں
جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے

کوئی تو قاتل نادید کا پتہ دے گا
ہم اپنا زخم زمانے کو لاؤ دکھلائیں

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہندوستان کی تحریک آزادی اورقومی شعورکی سیاسی لہراپنے پورے شباب پرتھی۔ایک طرف تو برطانوی حکومت نے ملک کی سیاسی،سماجی اورمعاشی معاملوں میں دخل اندازی کرکے اس کو پوری طرح بربادکردیا تھاتو دوسری طرف خود ملک کے معاشرتی معاملے ایک مسئلے کی حیثیت سے روبروتھے۔اب ان حالات میں قدیم روایتی تہذیب جدیدذہن کے ساتھ نہیں دے رہی تھی۔اس زمانے میں پڑھے لکھے نوجوانوں کے بھی مسئلے تھے،ایک توروزگارجواس وقت آسان نہ تھااوردوسراملک کی آزادی جس کی خواہش اورلگن ہرنوجوان کے دل میں تھی،وہ دل و جان سے ان کے لئے کوشاں تھے،گویاان پر اس کا خمار چھایاہواتھا۔بے روزگاری کے مسئلے پر جذبی کی نظم ''موت'' نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ایک بندملاحظہ ہو۔

میری آنکھوں میں ابھی تک ہے محبت کا غرور
میرے ہونٹوں کو ابھی تک ہے محبت کا غرور

میرے ماتھے پہ ہے ابھی تک شرافت کا غرور
ایسے وہموں سے بھی اب خودکو نکالوں تو چلوں

یہ ایک حقیقت ہے کہ جذبی نے اپنے پیش روؤں،ہمعصروں اوراپنے بعد کے شاعروں کے مقابلےکم لکھا ہےلیکن جوبھی لکھا ہے وہ ان کا بہترین سرمایہ ہے۔ان کا دورنظریاتی وابستگی کا دورتھا ترقی پسندفنکاراظہارمقصد کے لیےسب سے زیادہ توجہ نظم پردیتے تھے اسی صورت حال کے باعث

جذبی نے غزل گوئی کی جانب توجہ مرکوز کی ۔لیکن وہ ایک ترقی پسند شاعر ہیں جنہیں ہرطرح کے نظریات ورجحانات سے گزرنا پڑتا ہے اس طرح ان کا کینوس بہت وسیع ہوجاتا ہے جس کے تحت ان کے نظریات کا وسیع ہونا بھی لازمی ہے۔ان کی تخلیقی فکر سپاٹ اور سطحی نہیں ہے۔ ان کو سمجھنے کے لئے مزید گہرائی میں جانا پڑتا ہے اوریہی وجہ ہے جوان کی شاعری کوترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد بھی زندہ رکھتی ہے۔ ذیل اشعار میں درد سے اپنے ردعمل کا ذکر کرتے ہیں۔

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا ، اب خواہش دنیا کون کرے

جب کشتی ثابت وسالم تھی ، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جذبی کی بعض نظمیں سیاسی اورسماجی زندگی کی مثال ہیں۔ان نظموں میں جذبی نے اپنی داخلی دنیا سے نکل کر اپنے تجربے کو ایک خاص رنگ دینے کی کوشش کی ہے اورساتھ ہی ساتھ دور حاضر کے مسائل ، ہندوستانی معاشرت کا کرب اور پیچیدگی ہے۔ان کے اظہار میں جذبی نے ان مسائل سے متعلق اپنے ردعمل کو پیش کیا ہے۔ان کے یہاں سیاسی نظریات اورمقصدیت کو براہ راست پیش نہیں کیا ہے بلکہ علامتی طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظمیں سیاسی اورترقی پسند قوتوں کے روشن اورمثبت پہلوؤں کواجاگر کرتی ہیں۔ان میں ترقی پسندانہ جذبات کم اورحقیقت پسندانہ جذبات زیادہ نظرآتے ہیں۔وہ ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دل وجان سے دیتے تھے لیکن حقیقت پسندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا۔وطن کی آزادی اور 1947ء کے بعد کی سیاسی اورسماجی کشمکشوں کی تصویریں ان کے کلام میں یوں نظرآتی ہیں۔

اے موج بلا ان کوبھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

جذبی کا غم ،غم ذات سے شروع ہوکر غم جاناں کی منزلوں سے گزرتا ہوا غم دوراں تک پہنچ جاتا ہے۔اس سفر میں جوش وولولہ اور ہنگامہ خیزی برپا کرنے کا کام تحریک آزادی اور پھر مابعد

حصول آزادی نے کیا ہے۔اس میں ان کا طرز اظہار استعاراتی، کنایاتی، رمزیاتی اور علاماتی ہے ان کے یہاں انقلاب ایک محبوبہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ ہمارے ترقی پسند شعراء نے انقلاب کو محبوب کی طرح چاہا ہے۔ جب ملک کو مکمل آزادی نہ مل سکی تو جذبی کہتے ہیں ؂

وہی کثیف گھٹائیں وہی بھیانک رات
سحر سے جیسے گریزاں ہوں آج بھی لمحات

وہی جفائیں ، وہی سختیاں ، وہی آفات
تمہیں بتاؤ کہ بدلے کہاں مرے دن رات

اس طرح ان کی شاعری کے موضوعات تبدیل ہوتے گئے اور ان کی فکر کا دائرہ اور وسیع ہوتا گیا۔انہیں ترقی افکار کے سرچشمے ملتے گئے ؂

شریک محفل داد و رسن کچھ اور بھی ہیں
ستمگرو! ابھی اہل کفن کچھ اور بھی ہیں

خدا کرے مری ماندگی کو غیرت آئے
ابھی منازل رنج و محن کچھ اور بھی ہیں

پہلے آزادی کی خواہش پھر حصول آزادی اور ملک کی تقسیم کے ساتھ نئے نئے مسئلے کھڑے ہوگئے ۔اس دوران فرقہ وارانہ فسادات ،نوجوان نسل کی بے روزگاری، بے دری، بے گھری، وغیرہ نے پورے ملک میں ایک بھونچال مچا رکھا تھا۔ان موضوعات نے ترقی پسند شعراء کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔اب شاعر کو غم ذات اور غم جاناں کے فکر سے زیادہ نئی مصیبتوں کا خیال آیا۔ آزادی کے بعد جو امیدیں تھیں ان کے پورا نہ ہونے سے ایک بے چینی، بے اطمینانی اور ایک کرب کی شکل میں اندر ہی اندر پریشان کر رہا تھا۔تقسیم ملک کا موضوع تا دیر ان کے دل و دماغ پر چھایا رہا جس کا اظہار انہوں نے بہ خوبی کیا ہے۔جذبی کی نظم ''تقسیم'' کے چند بند پیش ہیں ؂

کیا یہی انقلاب ہے قلب ادھر جگر ادھر
نالۂ بے قرار ادھر ، شورش چشم تر ادھر

اف ری سیاست چمن ، رنگ کو بوئے سوئے ظن
کررہے دیدۂ وطن نور ادھر نظر ادھر

ایک تبسم فرنگ ہر دو افق لہو ترنگ
نعش بدوش ولالہ رنگ شام ادھر سحر ادھر

ترقی پسند شعراء کی صف میں محض تین مختصر مجموعوں کے باعث مخدوم محی الدین نے وہ مقام حاصل کرلیا جہاں تک بعض ضخیم دواوین تخلیق کرنے والے شعراء کی بھی رسائی نہیں۔ حالانکہ کلام کی ضخامت شاعری کی عظمت اور شعراء کی مقبولیت کا تعین نہیں کرسکتی تھی، اگرایسا ہوتا تو مخدوم کے شعری سرمائے کودیکھتے ہوئے،ان کو یہ مقام کبھی حاصل نہ ہو پاتا۔شاعر کی شناخت کبھی اس کی شاعری سے ہوتی ہے تو کبھی اس کی شخصیت اس کی شاعری کو سمجھنے مدومعاون ہوتی ہے۔ مخدوم کے یہاں یہ دونوں کیفیتیں ہے۔ یوں تو شاعر مکمل طور سے ماحول کا ترجمان نہیں ہوتا ہے، کہیں اس کے پس پردہ اس کے گرد وپیش کے حالات ہوتے ہیں تو کہیں اس کی ذاتی کشمکش بھی کارفرما ہوتی ہے۔ مخدوم نے بھی ابتداء میں رومانی شاعری کی لیکن ان کی رومانویت دوسرے شعراء سے قدرے مختلف ہے ۔ابتداء میں ہر فنکار کی طرح انہوں نے بھی سادہ، عاشقانہ اور جذباتی تجربات کو ہی پیش کیا جو اس وقت کے نوجوان شعراء میں عام تھے جس کے نمونے 'طور'، 'ساگر کے کنارے'، 'تلنگن'، 'لمحۂ رخصت'، 'جوانی' 'یاد ہے' وغیرہ میں مل جاتے ہیں۔ان کی بعض نظمیں جن میں تھوڑی انفرادیت تھی اور جو دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی تھی،ان میں 'پچھلے پہر کے چاند سے'،'انتظار'، 'برسات'، اور 'میں' وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ان کے پچھلے مجموعے 'سرخ سویرا' کی ابتدائی نظمیں ہیں جو ایک ایسے شاعر سے روشناس کراتی ہیں ، جو اپنی ذات سے،اپنا غم،محبوب کی ذات اور عشق ومحبت سے سرشار کرنے والی فطرت میں گم ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ مخدوم زندگی کے ہنگاموں ، دنیا کی کشمکش سے بالکل بے خبر ہیں ، ''سرخ سویرا'' میں بعد کی نظموں پر سیاسی ،سماجی شعور کی چھاپ نظر آتی ہے۔جن

میں 'جنگ'، 'مشرق'، 'موت کا گیت'، 'آزادی وطن'، 'سپاہی'، 'جنگ آزادی'، 'حویلی'، 'اندھیرا'، 'باغی'، 'انقلاب' 'بنگال'، وغیرہ خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔

''جنگ'' مخدوم کی ایک انقلابی نظم ہے جس میں ان کا احتجاجی شعور ابھر کر سامنے آیا ہے۔ ''حبشہ پر مسولینی کا حملہ'' ان کی انقلابی اور سیاسی شاعری کو مزید تقویت بخشتا ہے۔اس دور کے سیاسی حالات نے ان کے جذبات کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا جس سے ان کو انقلاب اور سیاست کے میدان میں آگے بڑھنے میں مدد ملی۔اس حملے کی وجہ سے مخدوم کے قلم نے اپنا رنگ دکھایا اور ایک روایت سے انحراف کرنے والی تخلیق کو جنم دیا جو ''جنگ'' کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔اس نظم میں فاشزم کے خلاف احتجاج اور جذبۂ نفرت کا اظہار کیا گیا ہے جہاں انسانیت کا خون ہو رہا ہے، کس طرح سے معصوموں کو موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے اور حسن کی غارت گری کا تماشہ دکھایا جا رہا ہے۔ یہ سب دیکھ کر مخدوم کا دل درد سے بے چین ہو جاتا ہے، ہر طرف قتل و غارت گری، تباہی و بربادی کے ہولناک منظر کو دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا ہے اب اسے ایک ایسے جہان کی تلاش ہے جہاں چین و امن ہو، جہاں انسانیت ہو اور آدمی سکون کی زندگی بسر کر سکے اور جہاں ایک پاسبان ان کی حفاظت کے لیے ہو۔

نکلے دہان توپ سے بربادیوں کے راگ
باغ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ

اب دلہنوں کا چھین جائے گا سہاگ
اب اپنے آنسوؤں سے بجھائیں وہ دل کی آگ

انسانیت کے خون کی ارزانیاں تو دیکھ
اس آسمان والے کی بیزاریاں تو دیکھ

معصومیٔ حیات کی بیچارگی تو دیکھ
دست ہوس سے حسن کی غارتگری تو دیکھ

انسان رہ سکے کوئی ایسا جہاں بھی ہے
اس فتنہ زا زمیں کا کوئی پاسباں بھی ہے

اس نظم میں انسانی طاقت کی برتری ،ظلم واستبداد اوردوسری طرف مظلوموں کی بے بسی، بے چارگی، مجبوری، استحصال کواس انداز میں پیش کیا گیاہے کہ قاری کادل درد سے کراہ اٹھتا ہے۔ مخدوم نے جنگ کے منظرکوپیش کرکے جنگ سے نفرت کا جذبہ سب کے سامنے رکھا ہے اور یہ بھی بتایا کہ جنگ عام انسانوں کے لیے کتنی خطرناک ہے اس میں محض بے گناہوں کا نقصان ہوتا ہے۔ اس طرح مخدوم نازیزم اورفاشزم طاقتوں کا کھلے عام احتجاج اوررد عمل پیش کرکے انسان دوستی، امن پسندی اورچین وسکون سے زندگی بسرکرنے کی خواہش کو بیدارکرتے ہیں۔

''موت کا گیت'' مخدوم کی احتجاجی نظموں میں سے ایک ہے۔جس میں ان کا جوش نقطۂ عروج پرپہنچ جاتاہے۔مخدوم اس نظم میں اپنے ماحول سے بیزاری کااظہارکررہے ہیں وہ حال سے ناآسودہ ہیں اوروہ اس میں تبدیلی کے خواہاں ہیں ،وہ روشن مستقبل کا خواب دیکھ رہے ہیں اوراس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ یہ حالات ہمیشہ باقی نہیں رہیں گے اوراس تاریکی کی صبح ضرور ہوگی۔لیکن یہ کیسےممکن ہے جب تک پرانہ نظام ختم نہ ہوگا تب تک نیانظام کیسے آسکتاہے۔اس لیے شاعرمکمل تخریب کا خواہش مندہے تاکہ پرانے نظام کا وجودنیست ونابود ہوجائے اوراس وحشت ناک نظام کوختم کرنے کے لیے وہ پوری کائنات کوتباہ کرنا چاہتاہے اس کا خیال ہے کہ مکمل تعمیر کے لیےمکمل تخریب ضروری ہے۔اس نظم کے مطالعے سے خون میں ابال آتاہےلیکن ذراغوروفکر کیجئے تو یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ شاعرموت کی لذت سے کس طرح لطف اندوزہورہاہے ۔

وقت ہے آؤ کہ عالم کو دگر گوں کردیں
قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھردیں

جاگ اٹھنے ہی کو ہے خوں کا تلاطم دیکھو
ملک الموت کے چہرے کاتبسم دیکھو

پھونک دو قصر کو گرکُن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی
زلزلے آؤ دہکتے ہوئے لاؤ آؤ

بجلیو آؤ گرجدار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ ، جہنم کی ہواؤ آؤ

مخدوم کی نظم ''جنگ آزادی'' نے اپنے زمانے میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ اس نظم کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ یہ نظم اپنے زمانے میں ہر خاص و عام کی زبان پر تھی اور اس طرح یہ ہر دل عزیز ہوگئی جس کے تحت مخدوم ہندوستان کے عوام کا محبوب ومقبول شاعر بن گیا۔اس کے پیچھے ایک اور بات پوشیدہ تھی کہ اس وقت عوام میں شامل کسان،مزدوروں کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نظم کا لکھنے والا کون تھا۔اس وقت کے جلسوں میں ابتدائی کارروائی اسی نظم سے شروع ہوتی تھی یہ اس قدر عوام میں پسند کی جانے لگی تھی جس نے مخدوم کو بھی حیات جاوید بخشی۔نظم کے ابتدائی بند اس طرح ہیں:

یہ جنگ ہے جنگ آزادی آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزای
آزادی کے پرچم کے تلے

اس طرح نظم پر جوش الفاظ اور انداز میں شروع ہوتی ہے ،پہلے بند میں صرف ایک اپیل ہے۔اس میں ہندوستانیوں کی مجبوریوں کی داستان ہے جو مزدور ہیں کسان ہیں لیکن آزادی کے متوالے ہیں اور آزادی کے لئے ایک پرچم کے تلے یکجا ہوکر جنگ چھیڑنے کا اعلان کررہے ہیں جیسے جیسے نظم آگے بڑھتی ہے اس کی روانی، تیزی، جوش، ولولہ،گرمئ جذبات اور حوصلہ بھی بڑھتا جاتا ہے ۔اب یہ جنگ ہندوستان کی نہیں بلکہ پورے ملک کی جنگ کا روپ لے چکی ہے۔اس کو صرف ہندوستان کی تحریک آزادی نے نہیں بلکہ ساری دنیا کی جنگ آزادی نے متاثر کیا ہے۔مخدوم کو صرف اپنے ملک کی فکر نہیں ہے ۔

ع بلکہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

جس کی تڑپ ذیل بند میں صاف نظر آتی ہے ۔

سارا سنسار ہمارا ہے　　پورب پچھّم اتر دکھن
ہم فرنگی ، ہم امریکی　　ہم چینی جانبازان وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن　　آہن پیکر فولاد بدن
یہ جنگ ہے جنگ آزادی　　آزادی کے پرچم کے تلے

شروع میں اس نظم کے لیے بہت سے شاعروں اورادیبوں نے کہا تھا کہ یہ پروپگینڈا ہے اور جنگ ختم ہونے کے بعد اسے کوئی یاد نہیں رکھے گا لیکن یورپ کی جنگ ختم ہوگئی پھر ہندوستان کی جنگ آزادی میں یہ نظم اور پروان چڑھ گئی اور ہندوستان کی فضاؤں میں مسلسل گونجنے لگی ۔اس میں انقلاب فرانس کے مشہور ترانے ''لا ماریسے'' کی سی شدت اور بین الاقوامی مزدورتحریک کے گیت ''انٹرنیشنل'' کا جوش وخروش تھا لیکن اس میں ہندوستان کے دل کی دھڑکن زیادہ تیز ہے۔مخدوم اس آزادی کے خواہاں نہیں تھے جس میں محض ملک پر سے غیرملکی اقتدارختم ہوجائے اورحکومت کی باگ ڈورہم وطنوں کے ہاتھ آجائے۔ان کو'مکمل سوراج' درکارتھا جس میں سرمایہ داروں اورمزدوروں کے درمیان طبقاتی کشمکش کوختم کیا جاسکے۔اس طرح وہ مکمل آزادی کی منزل پر پہنچ کر کہتے ہیں ۔

لو سرخ سویرا آتا ہے　　آزادی کا آزادی کا
گلنار ترانہ گاتا ہے　　آزادی کا آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے　　آزادی کا آزادی کا

مشہورومعروف ترقی پسندشاعراورنقادعلی سردارجعفری اپنے مضمون ''مخدوم ،سرخ سویرے کا شاعر''میں فرماتے ہیں:

> ''حیدرآباد کے اس گرلزکالج کا توذکر بے کار ہے جس میں لڑکیوں نے ایک مستقل 'مخدوم کارنر' بنالیا ہے۔ جہاں ہفتے میں ایک بار سب لڑکیاں جمع ہوکر' جنگ آزادی' ہی نہیں گاتی ہیں بلکہ مخدوم کی دوسری نظموں کی بھی تلاوت کرتی ہیں۔حیدرآباد میں تو خیر مخدوم کی

پرستش ہوتی ہے۔اس کی زبان وقلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ وہاں
کے باشندوں کے دلوں پرنقش ہوگیا ہے۔لیکن میں نے بنگال میں
'چٹ گاؤں میں،کرناٹک کے قصبوں میں،یوپی کے دیہات میں،
بمبئی کے مزدورعلاقے میں ہر طرح کے آدمیوں کو'جنگ آزادی'
گاتے سنا ہے۔'' [1]

مخدوم کی احتجاجی نظموں میں'انقلاب'ایک کامیاب ترین نظم ہے اورسب سے زیادہ موثر بھی ہے۔چونکہ رومانویت ان کی شاعری کی بنیاد رہی ہے اس لئے یہاں رومان اورانقلاب کے ایک ہونے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ان کی کوئی بھی نظم رومانیت کے اثر سے خالی نہیں ہے خواہ وہ رومانی ہو یا انقلابی۔یہ نظم آنے والے نئے نظام کی خواہش میں لکھی گئی ہے جہاں اس نئے عالم کی تمنا کی جارہی ہے جوایک نئے نظام کے ساتھ وجود میں آئے گا لیکن اس انقلاب کا انتظاراس طرح ہورہا ہے گویا وہ کوئی معشوقہ ہے۔مخدوم نے اسے محبوب کے حسن پیکر میں ڈھالا ہے۔اس کی آمد کا انتظارعشقیہ ہے۔عشق،حسن،نغمے اور روحانی زندگی کے تمام پرانے معیاراس کی سواری کے گزرتے ہیں خاک بسر ہوجائیں گے۔انقلاب کا ایسا رومانی تصورکسی دوسرے شعراء کے یہاں نہیں ملتا۔ انقلاب کی سختی اورگرمئ جذبات کومخدوم نے کس قدر نرمی اورخوشگواری کے ساتھ پیش کیا ہے ۔

اے جان نغمہ، جہاں سوگوار کب سے ہے
تیرے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے

ہجوم شوق سرِ رہ گزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

مخدوم کی احتجاجی اورانقلابی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ترقی پسند نقاد عزیز احمد اپنے مضمون 'مخدوم محی الدین' میں رقم طراز ہیں:

'' مخدوم محی الدین کی شاعری،تمام انقلابی شاعری کے مقابل
اپنے خلوص،جوش،کرداراورانقلابی جدت کی وجہ سے ممتاز ہے۔

---

[1] (ارتقاء،مخدوم محی الدین نمبر۔شمارہ 48،جون 2009ء،ارتقامطبوعات،کراچی۔ص:73)

> خالص شاعری کی حیثیت سے بھی اس کے کھرے ہونے میں کلام
> نہیں ہوسکتا اور یہ زبان محاورے اور اوزان کی بے شمار غلطیوں کے
> باوجود نظمیں تھوڑی ہی ہیں لیکن وہ عشقیہ ہوں یا انقلابی، ایک آتش
> فشاں، اندرونی حرارت ایک سچا، مخلص جذبہ ان کا محرک ہے۔'' [1]

دیگر ترقی پسند شعراء کی طرح سردار جعفری بھی اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں کافی حد تک رومان پسند تھے پھر وقت اور حالات کے ساتھ تبدیلی آئی۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستانی عوام اپنی جدوجہد اور کوششوں سے ملک کو برطانوی حکومت کے چنگل سے آزاد کرانے میں مشغول تھے۔ اس دوران ترقی پسند تحریک بھی اپنے شباب پر تھی اور سردار نے دونوں تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ملک آزاد ہو جانے پر بھی تقسیم ہند کے حادثے نے دونوں ملک کے عوام کو بے حد متاثر کیا۔ یہ وہ حالات ہیں جن کو سردار جعفری نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور نہ صرف دیکھا بلکہ اس کے کارکن بھی رہے اور کئی بار جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ اپنی تخلیقات میں ان حالات کی عکاسی بھی کی جن میں رومان اور انقلاب دونوں شیر وشکر ہیں۔ اکثر ترقی پسند شعراء اور ادباء نے کبھی بھی رومان اور انقلاب کو دو الگ الگ رخوں کے طور پر پیش نہیں کیا، بلکہ ان دونوں کو انھوں نے کچھ اس طرح ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا الگ تصور کر پانا مشکل ہے۔ رومان اور انقلاب کے اس حسین امتزاج کو پیش کرنے میں کم ہی لوگوں کو کامیابی حاصل ہوئی ہے، بیشتر ناکام رہے ہیں۔ فیض، مجاز، مخدوم کو اس میں مہارت حاصل ہوئی اور ان سب سے بڑھ کر سردار جعفری ہیں جن کی پوری شاعری مزاحمت واحتجاج اور رومان وانقلاب کے حسین امتزاج کی عکاس ہے۔ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے عوام کے دلوں میں آزادی کا جذبہ قائم کرنا چاہتے ہیں، علاوہ ازیں وہ کمیونسٹوں، سوشلسٹوں، مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا چاہتے ہیں، ان کا بنیادی مقصد انسان دوستی، ہمدردی، سرمایہ داروں کے ذریعے کسانوں اور مزدوروں کے استحصال کو روکنا، برطانوی حکومت سے ملک کو آزاد کرانا اور عام انسانی حقوق کے لیے صدائیں بلند کرنا تھا۔ اپنی شاعری کے مقصد کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] (ارتقاء، مخدوم محی الدین نمبر، شمارہ 48، جون 2009ء، ارتقا مطبوعات، کراچی، ص: 95)

''میری شاعری خواص کے لئے نہیں، بلکہ عوام کے لیے ہے اور
میری خواہش اور کوشش ہے کہ زیادہ سے زیادی لوگ اسے سمجھ
سکیں۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور اور کھیتوں میں ہل
جوتنے والے کسان۔'' ۱؎

سردار جعفری ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انہوں نے نثر میں بھی کمال جوہر دکھایا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں جس میں ان کا رومانی انداز، احتجاجی رنگ، انسانی دوستی کی جھلک، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان جنگ، کسانوں کا استحصال وغیرہ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں ''پرواز''، ''خون کی لکیر''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''امن کا ستارہ''، ''ایشیا جاگ اٹھا''، ''پتھر کی دیوار''، ''ایک خواب اور''، ''پیراہن شرر''، ''اورلہو پکارتا ہے'' وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں شامل غزلیں و نظمیں سردار جعفری کے رومانی اور انقلابی آہنگ کو پورے طور پر نمایاں کرتی ہیں۔ اس میں حسن و عشق کے معاملات سے لے کر روز مرہ کی معمولی ضرورتوں اور ان کے مسائل اور اس دور کے ولولہ خیز حالات کو انقلابی انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم ''بغاوت'' سردار جعفری کی ولولہ خیز نظم ہے۔ اس میں پرانی تہذیب، سرمایہ داری حکومت، مسخ شدہ مذہب، ہر چیز سے بغاوت کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس میں انہوں نے دیوی، دیوتاؤں، پیغمبر اور خدا کو 'بغاوت' سے تعبیر کیا ہے اور یہ بغاوت صرف انسان سے نہیں ہے بلکہ رسم چنگیزی، تہذیب تاری، جبر و استبداد، سرمایہ داری، سرسوتی لکشمی، بھیم و ارجن، دیوی۔ دیوتاؤں کے تمدن، وہم کی پابندیوں، قید ملت، آدمی کو پیسنے والی مشیت، تکبر اور غرور، بوالہوسی ابلیسیت اور سیرت پارساؤں، زوگری کے مسخ مذہب، عہد پارنیہ کی داستانوں، آزادی کی نعمت کھونے والوں، عظمت رفتہ پررونے والوں، دور حاضر کی حکومت اور ریاست، سامراجی نظام و قانون وسیاست، بے حس خداؤں، مفلس کی بددعاؤں، درد سہنے، تکلیف اٹھانے سے ہے۔ چند بند پیش نظر ہیں ۔

بغاوت اپنی آزادی کی نعمت کھونے والوں سے
بغاوت عظمت رفتہ کے اوپر رونے والوں سے

۱؎ (کتاب نما، علی سردار جعفری نمبر، 2011، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ص: 110)

بغاوت دورحاضر کی حکومت سے ریاست سے
بغاوت سامراجی نظم و قانون و ریاست سے

نظم میں مارکسی اوراشترا کی نظریہ پوری آب وتاب کے ساتھ پایا جاتا ہے کیونکہ اس وقت اشترا کیت نے ایک عالمگیرنظریے کےطور پرابھرنا شروع کردیا تھا اوریہی وجہ ہے کہ اس کے زیراثر لکھنے والے شعراء اورادباء اپنی شعری اورنثری تخلیقات کے ذریعے سرمایہ داری کے خلاف آواز بلندکررہے تھے۔نظم کے آخرمیں سردارنے بغاوت کوحریت کے دیوتا کا آستانہ اورعصرحاضر کے سپوتوں کاترانہ قراردیاہے ۔

بغاوت حریت کے دیوتا کا آستانہ ہے
بغاوت عصر حاضر کے سپوتوں کا ترانہ ہے

’نئی دنیا کوسلام‘ سردارجعفری کی طویل تمثیلی نظم ہے جو 1840 رمصرعوں پرمشتمل ہے۔اس کے کردار،کردارنہیں بلکہ علامتیں ہیں جس میں ایک باغی مردجاوید اوراس کی بیوی ،مریم کی کہانی ہے جو برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔سردارجعفری اس نظم کے ذریعے فرنگی ظلم کے خلاف ہندوستانیوں کی جدوجہد کومنظرعام پرلاتے ہیں اوربے حدخوبصورت علامتوں کے سہارے مجاہدین آزادی کواپنی جدوجہدآزادی کو جاری وساری رکھنے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ برطانوی حکومت سےٹکرلینے کے جرم میں، جاویدکو پھانسی کی سزادی جاتی ہے ادھرمریم حاملہ ہے اس لئے جاوید نے اپنے مرنے سے پہلے اپنے ہونے والے بچے کے لئے ایک خط لکھا ہے جس میں ہندوستان میں ایک نئی دنیا کی جھلک نظرآتی ہے جہاں ان پرانگریزی حکومت کاظلم ختم ہوجائے گا اور ملک میں ایک نئی آزادی کی فضا قائم ہوگی۔سب سے زیادہ اہم کرداروہ بچہ ہے جوابھی پیداابھی نہیں ہوا ہے۔ وہ محض ابھی تصورہی ہے۔وہ نئی دنیا کی علامت ہے،بشارت ہے،اس کی معصوم روح پوری نظم پر حاوی ہے۔اس طرح پوری نظم میں علامتی کردارہیں اوراس علامت کے ذریعہ جدوجہدآزادی کی لہرکواورتیزکیاجارہاہے۔چندبندملاحظہ ہوں ۔

ڈیڑھ سوسال کی مفلسی اورغلامی

ڈیڑھ سو سال کی کوڑھ نے کھالیا ہے

آج ہندوستان جاگ اٹھا ہے

یہ جبس بوستاں جاگ اٹھا ہے

اس کی انسانیت اور روحانیت جاگ اٹھی ہے

بچے گہواروں سے رینگ کر آج باہر نکل آئے ہیں

اور انگریز سے اپنا کھویا ہوا بھولا پن مانگتے ہیں

عورتیں اپنی کھوئی ہوئی عصمتیں

مائیں بے آب سینوں کی شادابیاں مانگتی ہیں

دست کار اپنے مضبوط انگوٹھے

اور صناع و معمار اپنی سبک انگلیاں مانگتے ہیں

جنگ آزادی میں لڑنے والے سپاہی

کارخانوں کے مزدور کھیتوں کے دہقاں

اپنے دریا و دشت و جبل اپنا ملک و وطن مانگتے ہیں

یہ جبس بوستاں ہے ہمارا

سارا ہندوستاں ہے ہمارا

ہم اس اپنے وطن، اپنے گلزار میں، اور کچھ بھی نہیں،

صرف جینے کا حق مانگتے ہیں۔

یہاں سردار جعفری علامتوں کے سہارے ہندوستان کے عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور انہیں یہ امید بھی دلا رہے ہیں کہ آنے والا کل اس سے بہتر ہوگا۔آج بھوک، افلاس، بیکاری، بے روزگاری، قحط، وبا وغیرہ پریشانی کا سبب ہیں لیکن مستقبل میں یہ پریشانی ختم ہو جائیں گی۔ جاوید کی زبانی سردار نے کہا ہے کہ آج ہندوستان میں کوئی چین سے نہیں ہے سب غمزدہ ہیں۔ ڈیڑھ سو سال سے برطانوی حکومت کا ظلم برداشت کرنے والے غلام اور مفلس ہندوستانی، کب تک

یوں ہی بے کار پڑے رہیں گے،ایک نہ ایک دن ہمیں اپنے حق کے لیے آواز اٹھانی ہوگی اور انقلاب وبغاوت کا نغمہ چھیڑکرآزادی حاصل کرنے کے لیے کھڑے ہوں گے۔اب ہندوستان جاگ گیا ہے،انسانیت بھی جاگ اٹھی ہے اورایک نیا زمانہ آنے کو مضطرب ہے،جس سے ہرسو خوشیاں ہوں گی اور ہندوستان کا ایک ایک فرد اپنے کھوئے ہوئے وقار کو واپس پانے کے لئے نکل پڑا ہے جس کا وہ حق دار ہے ۔مشہورومعروف نقاد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی اس نظم کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''نئی دنیا کو سلام''اس طرح ایک خالص جذباتی تمثیل نہیں بلکہ ایک آہنگ انقلاب بھی ہے جواس وقت کے ہندوستان میں عوام کوایک طرح کے مسلح انقلاب کے لیے تیارکرتی ہے جس کے لئے عوام کو ہرطرح کی قربانی دینے کے لیے تیار رہنا چاہئے اور یہ منزل چکبست ،اقبال،اورتمام وطن پرستوں کی شاعری سے آگے کی منزل ہے۔'' [۱]

'رومان سے انقلاب تک' سردار جعفری کی ایک اور انقلابی نظم ہے جس میں سردار نے پندرہ برس کی ترقی پسند شاعری پرتنقید کی ہے۔اس میں شاعروں کورومانی شاعری کے بجائے انقلابی شاعری کرنے کے لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ وقت تبدیل ہورہا ہے اوراس تبدیلی کے ساتھ چلنے کے لیے انقلابی آہنگ کی ضرورت ہے۔جب تک نغموں میں فولاد و بارود کا زور،تلوار کی دھاراوربجلی کی سی تیزی نہیں ہوگی تب تک انقلاب نہیں آئے گا۔محض اشکوں کے طوفان اورخوابوں کے رومان، شاعری کوتبدیل نہیں کرسکتے اس کے لیے انسانی خون میں گرمی کی ضرورت ہے۔جو جوش وولولے کو زندہ کردے۔اس سے پہلے قدامت پسند شاعری میں محض افسوس،ماتم،خواب،رومان اور ناامیدی والتجا ہی پرزور دیا گیا تھا جووقت کے لحاظ سے تبدیلی کا خواہاں ہے ،بغاوت کا خواہش مند ہے۔ سرداراپنے ولولہ خیز لہجے اوراحتجاجی شاعری کے ذریعے اپنے ہم وطنوں کوانقلاب سے آشنا کرانا چاہتے ہیں۔اس کے علاوہ سردار جعفری نے بے مقصد شاعری سے ناآسودگی کا اظہار کرتے ہوئے

---

۱ (نظمیں پڑھتے ہیں، مرتب ڈاکٹر طاہرہ پروین، 2012، ریحان پبلیکیشنز الہ آباد،ص:145)

شعراءکوواضح اورمقصدی شاعری کرنے پرمتوجہ کیا ہے۔ وہ شاعروں سے اس طرح مخاطب ہیں ؎

شاعروساتھیو
کاکلوں کی گھنی چھاؤں سے
سرخ پرچم کے گھنے سائے میں آؤ
اور نئے گیت گاؤ
گاؤ مزدور کے ساز پر
گاؤ جمہور کے ساز پر
آہنی کاروانوں کے قدموں کی آواز پر
گاؤ جس طرح میداں میں کوئی مجاہد رجز پڑھ رہا ہو
گاؤ جیسے سمندر میں طوفاں کا دیوتا چڑھ رہا ہو
گاؤ گاؤ گرجتے ہوئے بادلوں کی طرح
گاؤ گاؤ کڑکتی ہوئی بجلیوں کی طرح
آندھیوں کی طرح
زلزلوں کی طرح
گولیوں کی طرح اپنے الفاظ دشمن پر برساؤ
سارے عالم پہ چھاجاؤ

سردارجعفری نے فیض احمدفیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' کی طرز پرنظم ''انتظارنہ کر'' تخلیق کی جس میں وہ اپنے محبوب سے مخاطب ہیں اور ہندوستان کی موجودہ صورت حال کودیکھتے ہوئے اپنے محبوب سے ان کا انتظارنہ کرنے کی بات کہہ رہے ہیں۔ دراصل سردار، فیض ہی کی طرح عشق کے پردے میں رومانی دنیا چھوڑکرحقیقی دنیا کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔اب وہ عشق وعاشقی کے مزے، حسن کاری، وصال کالطف ان سب کوقربان کرکے عام انسانی زندگی اس کے مسائل، اخلاقی اقدار، انسانی اقدارکی طرف مائل ہورہے ہیں۔اس نظم میں

ان کا احتجاج ایک الگ شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کو بھولے بھی نہیں ہیں لیکن اس کو انتظار کا حق بھی نہیں دے رہے ہیں۔ اب ان کی منزل ان کے راستے کچھ اور ہی ہیں جس کی ان کو خود خبر نہیں ہے۔ چند بند ملاحظہ فرمائیں ۔

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

عجب گھڑی ہے میں اس وقت آ نہیں سکتا
سرور عشق کی دنیا بسا نہیں سکتا
میں تیرے ساز محبت پہ گا نہیں سکتا

میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر
نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

''ایشیا جاگ اٹھا'' سردار جعفری کی طویل نظم ہے۔ سردار نے سینٹرل جیل ناسک میں اسیری کے دوران اس کی تخلیق کی تھی اس میں 88/اشعار پر مشتمل حروف اول ، کے عنوان سے نظم کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد اصل نظم شروع ہوتی ہے۔ جس میں تقریباً 775 مصرعے ہیں جس کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پوری نظم میں سردار جعفری نے ایشیا کا تاریخی تجزیہ پیش کیا ہے۔ سب سے پہلے 'حرف اول' میں ہندوستانیوں کو آزادی ملنے کی خوشی کا ذکر ہے، پھر انگریزوں سے مخاطب ہو کر پورے ایشیا کو انگریزوں کی سیاست سے آزاد کرا کر یہاں مذہبی ، تہذیبی وثقافتی یکجہتی قائم کرنے کی بات کہی ہے۔ اس کے بعد جو نظم شروع ہوتی ہے۔ اس میں پوری ایشیائی تاریخ کا تجزیہ کیا گیا ہے اور یہاں کے مختلف کارناموں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ انگریزوں کی آمد، ان کی حکومت، اور استحصال کا ذکر بھی کیا گیا ہے کہ کس طرح سے برطانوی حکومت کے دور میں ہندوستان جس طرح بھوک، افلاس، قحط اور سماجی وسیاسی استحصال سے دوچار تھا اور اس سے عوام کس طرح متاثر ہوئے اس کا بڑے ہی انقلابی انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ انگریزوں کی نئی نئی پالیسی، کبھی ریلوے لائن تو کبھی

ڈاک،تار،اوردخانی جہاں وغیرہ کے متعلق سردار نے اظہارخیال کیا ہے کہ یہ تمام اشیاانگریزاپنے مفاد کے لیے ہندوستان لائے تھے اور یہاں پراپنی تہذیب بھی چھوڑ گئے جس کی بہت مخالفت کی گئی۔اس کے بعدسوویت یونین کا ذکرکرتے ہیں جوکہ ان کی شاعری کا اہم جزہے۔وہ اسے ساری دنیا کی پریشانی ختم کرنے والا نظام بتاتے ہیں جوانہیں استحصال سے نجات دلاکرظلم وستم بھی مٹائے گا۔اس طرح سوویت یونین کے ذریعے عوام میں بیداری اورظلم کے خلاف احتجاج کرنے کا سبق دیا جارہا ہے۔

سردارجعفری کی پوری شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ احتجاج ان کی تخلیق میں ہی شامل ہے ۔وہ ایسے شاعرہیں کہ جن کے کلام کے گوشے گوشے سے انقلاب کے نعرے بلندہوتے ہیں۔ان کے یہاں ایسی نظموں اورغزلوں کی بھرمارہے جن میں مزاحمتی واحتجاجی آہنگ موجودہے۔''موت''،''جنگ اورانقلاب''،''استاسن کتھا''،''ایک خواب اور''،''نوالہ''، ''پیرہن شرر''،''لہوپکارتاہے'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جہاں انقلابی رویہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ان کی اس خصوصیات سے متاثر ہوکر پروفیسراحتشام حسین فرماتے ہیں:

> ''سردارجعفری کی شاعری نئ زندگی اوراس کی نئ قدروں کے گیت گاتی ہے۔اس کے مطالعہ سے پڑھنے والے کا طبقاتی شعور برانگیختہ ہوتا ہے اورعمل کا جذبہ جاگ اٹھتاہے۔یہ شاعری اردوشعروادب کی روایات میں اچھی طرح بسی ہوئی ہونے کے باوجودنئ ہے۔اس کاحسن اس نظام کی بدصورتی کواورنمایاں کرتا ہے ، جوشاعروں کی زباں بندی کرتی ہے۔اس میں اس نظام زندگی کے حسن کی چمک نظرآتی ہے،انسانوں نے اپنی آسودگی اور بہتری کے لئے ہمیشہ جس کے خواب دیکھے ہیں ،ایسی شاعری کوکسی مخصوص نقطۂ نظرکا پروپگنڈہ کہہ دینامشکل نہیں ہے لیکن ایسی جاندار، پرخلوص، رنگین اور پرشکوہ شاعری پیش کرنا بہت مشکل ہے۔'' [1]

---

[1] (علی سردارجعفری،مشاہیرادب کی نظرمیں۔سہیل،علی سردارجعفری نمبر۔ستمبر،اکتوبر2014 کولکاتا۔

ترقی پسندتحریک نے تمام شعراء کو جیسے ایک رشتے میں گوندھ دیا ہے۔ اس تحریک نے ان تمام انسانوں کو وہ دل ودماغ ، وہ فکر، وہ تخیل عطا کیا ہے جس کے بغیر انسان کا انسان سے اتحاد ممکن نہیں ہے۔ اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کرنا، جبر واستبداد کے خلاف احتجاج کرنا،ظلم واستحصال کی مخالفت، یہ ایسے واقعات وحالات تھے جو ان شعرا کو انقلابی شاعری کرنے پر مجبور کر رہے تھے انہیں شعراء میں جاں نثار اختر بھی شامل ہیں۔ان کی بہت سی ایسی نظمیں ہیں جو ان کی شاعری میں انقلابی آہنگ کی ترجمان ہیں۔ ابتدائی دور میں شاعری میں پختگی تھوڑی کم تھی ، بعد میں یہ کمی درست ہوتی چلی گئی۔ان کی انقلابی نظموں میں ''معلوم نہ تھا'، 'زندگی'، 'بیدار ہے انسان'، 'دعوت جنگ'، 'مزدور عورتیں'، 'اے اہل وطن'، 'میں ان کے گیت گاتا ہوں'، 'سویرا'، 'نگار'، 'تاب سخن'، وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو ان کے سیاسی نظریات کی ترجمانی کرتی ہیں اور احتجاجی شعور کو بھی پیش کرتی ہیں۔ان کی نظم میں 'میں ان کے گیت گاتا ہوں' جاں نثار اختر کی فکر، تخیل اور ان کے شاعری کے موضوعات کا تعین کرنے میں بڑی مدد ومعاون ثابت ہوئی ہے۔اس وقت کی گرجتی اور دہاڑتی ہوئی شاعری کو ایسا عروج حاصل ہوا کہ اس زمانے کے شعراء اسی رو میں بہہ گئے۔ جاں نثار اختر نے بھی اس بلند آہنگی کو قائم رکھتے ہوئے روایت کو برقرار رکھا۔'میں ان کے گیت گاتا ہوں' میں توپوں کی آواز' بجلی کا کوندنا' گولیوں کی سنسناہٹ وغیرہ جابجا نظر آتی ہے ۔

جو رکھتے ہیں سینے گرم توپوں کے دہانوں پر
نظر سے جن کی بجلی کوندتی ہے آسمانوں پر
میں ان کے گیت گاتا ہوں
جو نغمہ جانتے ہیں گولیوں کی سنسناہٹ کو
جو سن سکتے ہیں ظالم موت کے قدموں کی آہٹ کو
میں ان کے گیت گاتا ہوں

ہندوستان کی کسی سیاسی پارٹی سے جاں نثار اختر کا تعلق ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے کبھی نہیں رہا۔ برطانوی حکومت کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں انہوں نے ایک شاعر

کی حیثیت سے ہی حصہ لیااوراپنے قلم ہی کے ذریعہ وہ اس جدوجہد میں شامل رہے لیکن ان کی شاعری سے ان کے سیاسی شعور کا پتا چلتا ہے اور بعد کی نظموں میں توان کے نظریات واضح طور پر ظاہرہوتے ہیں۔اپنی نظم 'اے اہل وطن' میں کس طرح اپنے ہم وطنوں کے جذبۂ آزادی کو برانگیختہ کررہے ہیں،ان میں ایک انقلاب پیدا کررہے ہیں ان کی ہمت اورحوصلہ افزائی کررہے ہیں کہ ہم مل جائیں تو کیا نہیں کرسکتے،ہم انقلاب لاسکتے ہیں۔اے اہل وطن اپنی طاقت کو پہچانو اورظلم کے خلاف احتجاج کرو انقلاب کرو۔

یہ دھوپ چمکتی تیغوں کی اک آن میں ڈھل سکتی ہے ابھی
زنجیر غلامی کی کیا ہے ، اک آنچ میں گل سکتی ہے ابھی
ہم مل کے اٹھیں تو یہ دنیا اک پل میں بدل سکتی ہے ابھی
اے اہل وطن !اے اہل وطن

ترقی پسندشعراء کا مقصد مارکسزم سے زیادہ انسانیت کا وسیع تصور،معاشرے میں چین و امن، بہتر مستقبل اور پرمسرت زندگی کی کوشش کرنا تھااس لئے ہرگروہ اور ہرطبقے کے شعراء ادباء نے اس کے مقصد کو خیال میں رکھ کر اپنی تخلیق میں پیش کیا۔ ہر دور میں اس میں غیرکمیونسٹ ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد رہی ہے ۔وہ دورسیاسی شدت کا دور تھااورکیفی اعظمی بھی اسی عہد کے شاعر ہیں۔ اس وقت رومانویت کا اثرختم ہورہا تھااور رومانویت کے باغی مزاج کو انقلاب کی گھن گرج میں بڑی اپنائیت محسوس ہوئی ۔کیفی نے پوری شدت کے ساتھ اس میں حصہ لیا۔کیفی سماج کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جس نے انسان کی تذلیل اور بے حرمتی کو زیادہ قریب سے دیکھا تھا وہ کسانوں اورمزدوروں کی صورت حال،ان پرظلم واستبداد، بھوک وافلاس سے پریشان بچوں کو بڑے قریب سے جانتے تھے۔ جاگیردارانہ سماج کے جبروتشدد سے انسانیت بھی شرم سار تھی۔ ایسی صورت حال میں اگرکوئی شخص ان مظلوموں کے سر پر ہاتھ رکھے ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے جس سے بھوک سے نڈھال جسموں میں توانائی آجائے اور پریشان چہروں پرخوشیوں کی لہر دوڑ جائے ایسے شخص کومسیحا ہی سمجھا جائے گا۔کیفی جو کبھی رومان پسند تھے،آج اس وقت ان کے خون

میں بھی چنگاری کی لہر دوڑ پڑی ہے انہوں نے سب کو سرخ علم اٹھا کر چلنے کی دعوت دی ہے۔ وہ سب کا بھلا چاہتے تھے سب کی خیر خواہی چاہتے تھے ۔

کاندھے پہ رکھ کے سرخ علم آن بان سے
یہ ساز انقلاب ہے کچھ گنگنایئے

'عادت'، 'ابن مریم'، 'آوارہ سجدے'، 'ابلیس کی مجلس شوریٰ دوسرا اجلاس'، کیفی کی ایسی نظمیں ہیں جن میں ان کا سیاسی شعور ابھر کر سامنے آتا ہے اور احتجاج کا آہنگ بھی۔ وہ ایک کمیونسٹ نقطۂ نظر کے حامی اور ایک اشتراکی شاعر ہیں۔ اشتراکیت ہی ان کی طاقت ہے اور اشتراکیت ہی ان کی کمزوری۔ اشتراکیت ہی ان کی آواز ہے اور اشتراکیت ہی ان کا نغمہ۔ اس سیاسی بلند آہنگی نے انہیں کافی نقصان بھی پہنچایا۔ انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کے تقسیم ہونے پر ایک نہایت عمدہ نظم ''آوارہ سجدے'' لکھی تھی جس کے لفظ لفظ میں کیفی کا کرب سمٹ آیا ہے۔ کیفی نے اپنی ساری توانائی اور ساری زندگی پارٹی کے لیے وقف کر دی ۔

کوئی قاتل سر مقتل نظر آتا ہی نہیں
کسی کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں
اپنی لاش آپ اٹھانا کوئی آسان نہیں
دست و بازو مرے ناکارہ ہوئے جاتے ہیں

ایک وقت تھا جب کیفی زیادہ تر نظمیں فرمائش پر لکھنے لگے تھے۔ پھر شبلی اور ظفر علی خاں کی نظموں کا طرز اختیار کر لیا اس طریق کار نے وقتی شاعری کو بہت جگہ دی، ان کی بہت سی نظمیں، گاندھی جناح کی ملاقات پر، ''سویت یونین اور ہندوستان''، سوئے برلن جا رہی ہے سرخ فوج'، 'فتح برلن'، 'میں کلکتے میں کیفی آج پہلی بار آیا ہوں'، 'سلام اے دیش تیرے شعلے عجب شگوفے کھلا رہے ہیں'، 'لال جھنڈے پھینک دو اے دیش بھگتو کیا کہا'، 'قومی حکمراں'، 'ریاست ترادنگور کے مجاہدوں کا ترانہ'، 'الیکشن کے دنوں میں مولانا آزاد اور خضر حیات کی ملاقات، وغیرہ بہت مشہور ہوئیں جو ان کا کارنامہ سمجھی جاتی ہیں۔

ترقی پسندوں کی نوجوان نسل کے آتش خانے سے جو چنگاریاں نکل رہی ہیں ، ان میں ایک بہت روشن چنگاری مجروح سلطانپوری ہیں۔ وہ نہایت کم گو شاعر ہیں ۔غزل کے پردے میں انہیں عصری زندگی کے تمام ایسے پہلوؤں کو کامیابی سے برتنے کا ہنر معلوم ہے جنہیں بھی سیاسی اور سیاسی بندشوں کے سبب کہہ پانا غیر ممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ان کا شماران ترقی پسند شعراء میں ہوتا ہے جو بہت کم کہتے ہیں ،اور بہت اچھا کہتے ہیں۔غزل کے میدان میں انہوں نے اپنی ساری ذمہ داریاں پوری کیں جس کے لیے ترقی پسند شعراء صرف نظم کا پیرایہ بیان ضروری سمجھتے ہیں۔ان کے یہاں تغزل کے ساتھ ساتھ ایک تیکھا پن ہے ۔سیاسی موضوعات پر ان کی غزلوں میں جو خصوصیات ہیں وہ بہت کم غزل گو شعراء کے یہاں پائی جاتی ہیں۔مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

ہم قفس! صیاد کی رسم زباں بندی کی خیر
بے زبانوں کو بھی ، انداز کلام آہی گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

غیرت سنگ ہے ساقی یہ گلوئے تشنہ
تیرے پیمانے میں جو موج ہے تلوار سی

ان اشعار کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صبح آزادی طلوع ہونے میں اب زیادہ وقت نہیں ہے بس اب آزادی کی روشن کرنیں اندھیرے سناٹوں میں پھیل جائے گی پھر اپنے ملک پر برطانوی حکومت کا قبضہ ہٹ جائے گا اور ہم پوری طرح آزاد ہو جائیں گے۔پھر 1947ء میں جب برطانوی حکومت کی غلامی سے ہندوستان آزاد ہوا تو اس کا خیر مقدم مجروح نے بڑے ہی پر جوش اور ولولہ خیز انداز میں کیا ۔

عہد انقلاب آیا ، دور آفتاب آیا
منتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے

اب زمیں گائے گی ، ہل کے ساز پر نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے

اسی طرح کے بہت سے اشعار ان کے یہاں ہے جو آزادی کے فوراًبعد ہندوستانیوں کی خواہشات اورتمناؤں کی پوری پوری ترجمانی کرتے ہیں۔ یہاں ان کی امیدوں اورخواہشوں سے پھیلا اجالا ہی نہیں بلکہ زندگی کی ایک نئی امنگ بھی موجود ہے۔لیکن جب آزادی ملی اوراس کے کئی برس بعدبھی عوام کی خواہشات پوری نہیں ہوئیں تو سارے ملک میں مایوسی کی لہرسی دوڑ جاتی ہے اورحالات کواورزیادہ بہتر بنانے کے لئے کوشش وسعی کی جاتی ہے۔

چمن میں آتش گل پھر سے بھڑکانے بھی آئیں گے
خزاں آئی تو اب صحرا سے دیوانے بھی آئیں گے

مجروح کے یہاں ان علامتوں کا استعمال ہوا ہے جو ترقی پسندوں کے زمانے میں خاص طور سے مستعمل تھے مثلاً دارورسن، ستون دار، چم، صحرا، دیوانہ وغیرہ ۔مجروح ان علامتوں کے سہارے اپنے دوراور ماحول کو پیش کررہے ہیں جہاں ظلم واستبداد کا بازارگرم ہے اورمظلوم آواز بلند نہیں کرسکتے لیکن شاعرکے انداز بیان کے پیچھے عزم اورحوصلہ ہے جس سے حالات کوتبدیل کرنے کی ایک امنگ ہے اورخواہش ہے۔اس میں ایک ایسا جذبہ کارفرماہے جہاں محض احتجاج سے کام لیا گیا ہے۔سبھی ایسی آزادی کے منتظر تھے جو چین وامن ساتھ لائے گی اورملک کے سیاسی اورمعاشی حالات قابومیں آجائیں گے۔عوام اورفنکارسماجی برابری اورخاص طور پراقتصادی حالات کے بہتر ہونے کے خواہشمند تھے۔مجروح نے سیاسی رہنماؤں کے کردار پربھی وار کیے ہیں ۔

ڈرا کے موج و تلاطم سے ہم نشینوں کو
یہی تو ہیں جو ڈبویا کئے سفینوں کو

مجروح قافلے کے مرے ، داستاں یہ ہے
رہبر نے مل کے لوٹ لیا ، راہزن کے ساتھ

ترقی پسند شعراء میں ساحر لدھیانوی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ان کے گیت، غزل اور نغمے آج بھی لوگوں کی زباں زدعام ہیں۔وہ اپنے عہد کے پسندیدہ شاعروں میں سے ایک تھے۔ ان کے لب ولہجے میں ایک شادابی اور رنگینی تھی ان کی نظمیں بہت گہرے تجربات وشعور کی

حامل نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے اندرایک دلکشی رکھتی ہیں اوریہی ان کی مقبولیت کاراز بھی ہے۔ ساحرنہ تو فیض کی طرح ذہین اور اونچے طبقے کے شاعر ہیں،نہ ہی بلند آہنگ رکھنے والے اور کسانوں اورمزدوروں کے جلسے کے شاعر ہیں۔ان کا مخاطب متوسط طبقے کے عام تعلیم یافتہ نو جوان ہیں۔ان کے لہجے میں ایک شیرینی،وضاحت اورلطافت ہے جو براہ راست عام نو جوانوں کومتاثر کرتی ہے۔ساحرکی بہت سی نظمیں ہیں جن میں انہوں نے اپنے احتجاجی وانقلابی رویے کو پیش کیا ہے۔گریز' چکلے' بنگال' کل اورآج' اسی دوراہے پر' خودکشی سے پہلے' جاگیر' مادام' مفاہمت' شکست زنداں' لہونذردے رہی ہے حیات' وغیرہ کامیاب نظمیں ہیں۔

ساحرکی انقلابی فکر''اے شریف انسانو''میں نظرآتی ہے۔اس میں جنگ کا منظر بیان کیا گیا ہے۔ساحرکا خیال ہے کہ جنگ مسئلوں کو کیا حل کرے گی جنگ تو خودہی ایک مسئلہ ہے۔اس لئے جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہوگا۔ساحرنے بڑی بے باکی کے ساتھ جنگ کے خلاف احتجاج کیاہے اوراس سے ہونے والے نقصانات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے وہ ایک انقلاب کےخواہاں ہیں جس سے معاشرے کی برائیوں سے نجات حاصل کی جاسکے۔جو انسان کے ضمیر کوجھنجھوڑکرر کھ دے۔اورپھر جنگ کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنگ تو لڑنی ہے بھوک اور غلامی سے ،ناانصافی اوراستحصال سے ،ان مفادپرست سیاست دانوں سے جنھوں نے اپنی برتری کے ثبوت کے لئے ان خطرناک جنگوں کا اہتمام کیا ہے لڑی جائے۔

جنگ افلاس اورغلامی سے
امن بہتر نظام کی خاطر
جنگ بھٹکی ہوئی قیادت سے
امن بےبس عوام کی خاطر
جنگ سرمائے کے تسلط سے
امن جمہور کی خوشی کے لئے
جنگ،جنگوں کے فلسفے کے خلاف

امن پر امن زندگی کے لئے

ساحرکو اقبال اور جوش جیسی شخصیات کی نظمیں متاثر کرتی ہیں اور وہ ان کی ہی پیروی کرتے ہیں۔ساحر کے دل پر پنجاب لدھیانہ قتل و غارتگری اور خون خرابے کا گہرا اثر پڑا،اس کے علاوہ وہ اپنے والد کے ہی جاگیردارانہ مزاج سے بغاوت کا جذبہ،حب الوطنی اور انسانی دوستی کے قلبی میلان کو پھیلا کر دنیا کے بڑے حصے پر اجاگر ہو گئے۔ترقی پسند تحریک سے بھی متعلق ان کی الگ رائے تھی۔ان کا کہنا تھا کہ ہر وہ شاعر یا ادیب جو اپنی کسی مجبوری کے باعث اس گروپ میں شامل نہ ہو سکا لیکن اپنے عہد میں ہو رہی زیادتی،ناانصافی اور استحصال کے خلاف عوامی حقوق کی بحالی کے لیے قلم اٹھاتا ہے اسے بھی ترقی پسند ہی ماننا چاہئے کیونکہ انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے سچائی،بے خوفی،بے باکی کے ساتھ قلم اٹھالینا ہی ترقی پسندی ہے۔ایک نظم میں کہتے ہیں ۔

رجعت پسند ہوں کہ ترقی پسند ہوں
اس بحث کو فضول و عبث جانتا ہوں میں
آئینہ حوادث ہستی ہیں میرے شعر
جو دیکھتا رہا وہی کہتا رہا ہوں میں
تاروں کی انجمن سے مجھے واسطہ نہیں
انسانیت پہ اشک بہاتا رہا ہوں میں

ساحر کا احتجاج ایک الگ طرح کا احتجاج ہے وہ ترقی پسند شعراء سے تھوڑا مختلف سوچتے ہیں اس لیے ان کا اظہار بیان بھی مختلف ہے۔ان میں حق پرستی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔وہ ترقی پسند تحریک کا واحد دریا ہے۔جو''نرمدا'' کی طرح پورب سے پچھّم کی جانب بہتا ہے۔تمام ترقی پسند شعراء بغاوت اور بلند آہنگی کے دلدادہ ہیں لیکن ان کی انقلابی شاعری بھی شیرنی ہے،نغمگی ہے۔ ان کی فکر بھی ان سب سے قدرے مختلف ہے۔وہ علامہ اقبال جیسی عظیم ہستی کے اس نظریہ سے بھی منحرف نظر آتے ہیں۔اقبال کا خیال ہے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روٹی
اس کھیت کے ہر گوشۂ گندم کو جلا دو

ساحر کانظریہ تو یہ ہے ۔

جس سے دہقاں کو روزی نہیں ملنے پاتی
میں نہ دوں گا تجھے وہ کھیت جلانے کا سبق

فصل باقی ہے تو تقسیم بدل سکتی ہے
فصل کی خاک سے کیا مانگے گا جمہور کا حق

ترقی پسند شاعری میں اختر الایمان ایک نئے لب و لہجے کے ساتھ آئے تھے۔وہ شعری خلوص اوراس وقت میں رائج فیشن کے سیلاب میں نہیں بہے بلکہ اپنے جذبات وتجربات پر ایمان رکھتے تھے اورانہیں کے سہارے وہ اپنی شاعری کے تاروپود بنتے ہیں۔انہیں اس دور کے سماجی شعور کا احساس ہے اوراس کا اثران کی شاعری پر بھی پڑا ہے۔انہوں نے آنی وفانی موضوعات سے دامن بچا کرزندگی کی تہہ در تہہ حقیقت میں جانے اوراس کا تجزیہ کرنے کی طرف مائل کیا ہے۔ انہوں نے علامات واشارات کے جدیدعناصر کو اپنی شاعری میں جگہ دی اوراسے جدید ذہن سے قریب کیا،اس طرح سے علامتی اسلوب اورموضوعات کی طرف مثبت رویہ ان کووقتی شاعری کے مسائل سے ہٹا کر بنیادی حقیقتوں اوردیرپا نقش چھوڑ جانے والے شاعروں میں شامل کرتا ہے۔ان کی نظموں میں''ایک سوال''،''خاک وخون''،''تاریک سائے''،''ایک کہانی''،''پندرہ اگست''، ''آزادی کے بعد''،''غلام روحوں کا کارواں''،''جنگ''،''یوں نہ کہو''،''خیمہ نگارسے''وغیرہ سیاسی وسماجی مسائل کی ترجمان ہیں لیکن یہ محض وقتی ہنگامہ خیزی کی مثال نہیں ہیں بلکہ اپنے اندر بصیرت اورتہہ داری رکھتی ہیں۔''خاک وخون'' کے بندملاحظہ فرمائیں ۔

آپ ہوں میں نہیں انسان سے مایوس ابھی
ابھی پھوٹے ہیں شگوفے ابھی کمسن ہے بہار

شبنمی سبز لبادوں سے مہک آتی ہے
خاک وخوں توڑ ہی دیں گے کبھی دیرینہ خمار

رومانیت کی دھند میں لپٹی ہوئی اختر الایمان کی ابتدائی شاعری سنگلاخ حقیقتوں سے گریز ہی نہیں کرتی بلکہ انہیں زیادہ ٹھوس اورمحسوس طریقے پرگرفت میں لینے کی کوشش کرتی نظرآتی ہے۔دھندلی دھندلی اورموہوم رومانی شاعری سے شروع ہوکر یہ سفرٹھوس شعری پیکروں اورشفاف علامتوں سے ہوتا ہوانیا آہنگ اوراس کے بعد کی ان نظموں پرختم ہوتا ہے جہاں وہ براہ راست اظہارکی منزلوں تک پہنچتے ہیں۔ان کے چہرے پرکوئی مکھوٹانہیں ہے، ان کے ایوان شاعری میں کوئی چوردروازہ نہیں ہے۔وہ انسان دوست،روشن خیال ،جمہوریت پسند ہیں لیکن ان کی شاعری ان تمغوں کو سینے پر لگا کرداد تحسین وصول نہیں کرتی۔ان کی شاعری میں سیاسی موضوعات بھی ہیں اوروہ ایک عام شہری کی طرح سے اپنے ملک کی سیاسی وسماجی جدوجہد میں حصہ لیتے ہیں انہوں نے بھی آزادی کی جدوجہدکواپنی کئی نظموں کا موضوع بنایاہے وہ اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں۔ فرق بس اتنا ہے کہ وہ خطیبانہ اندازاورانقلابی لب ولہجہ نہیں اختیارکرتے ہیں۔''پندرہ اگست''، ''جنگ''،''یوں نہ کہو''،''قافلہ''،''تاریک سیارے''،''خاک وخون''،''موت''اور''ایک لڑکا'' وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔

نظم''ایک لڑکا'' میں اختر الایمان کافن اورفکراوربھی زیادہ ابھرکرسامنے آتا ہے۔اس نظم کا موضوع ضمیر ہے اوراس کوایک لڑکے کی علامت کے ذریعے انہوں نے آج کے سرمایہ دارانہ نظام پر بڑاہی گہراوارکیا ہے۔یہ ان کا محبوب موضوع ہے ،اس نظم کی گیری طنزآمیزتلخی دل میں اتر جاتی ہے اور ہرمصرعہ دل ودماغ پہ ایک نقش چھوڑ جاتا ہے۔اس میں ایک بچے کی معصومیت، جوانی کی بغاوت کا خوبصورت امتزاج ہے اس میں اس دورکی ہزارہادانشوروں اورباغی جوانوں کی داستان ہے جنہوں نے اس نظام کو بدلنے کے لیے کیسی کیسی امیدیں باندھ رکھی تھیں اوراس کو حاصل کرنے لیے ان کوکس سخت مراحل سے گزرنا پڑا تھا،اس درمیان حالات نے انہیں کیا سے کیا بنادیا،لیکن اب بھی ان کے دل میں چنگاریاں دبی ہوئی ہیں،اوروہ کبھی بھی جوالامکھی کی طرح بھڑک اٹھیں گی

کیونکہ وہ لڑکا اب بھی زندہ ہے جس نے اس نظام کو تبدیل کرنے کے خواب دیکھے تھے۔ یہ علامت جہاں بچے کی معصومیت کا منظر ہے وہاں اس میں حالات سے جنگ کرنے کا جذبہ بھی پنہاں ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں ؎

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج اندوہ پرور ، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں ، وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاک عالم پھونک ڈالے گا

اگر نظم یہیں ختم ہوجاتی تو یقیناً یہ اتنی بڑی نظم نہ ہوتی جتنی کہ اپنی موجودہ شکل میں ہے لیکن اس نظم کے آخری دومصرعوں میں جتنا غیر متوقع اور شدید گریز ہے وہ صورت حال کو تبدیل کر دیتا ہے ؎

یہ لڑکا مسکراتا ہے ، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب وافترا ہے ، جھوٹ ہی ، دیکھو ، میں زندہ ہوں

احمد ندیم قاسمی نے بھی ترقی پسند نظم میں احتجاجی وانقلابی نظموں کے نمونے پیش کیے ہیں ، ''طلوع''، ''تاریخ کی آواز''، ''جبر واختیار''، ''آزادی کے بعد''، ''انسان عظیم ہے خدایا'' وغیرہ فکر وفن کے اعتبار سے کامیاب ہیں ۔ان کے علاوہ دوسرے ترقی پسند شعراء میں شاد عارفی ، پرویز شاہد ، منیب الرحمان ، قتیل شفائی وغیرہ شامل ہیں جواس وقت تحریک سے وابستہ تھے۔ یہاں بعض اہم اور نمائندہ ترقی پسند شعراء اوران کی شاعری کا فرداً فرداً تبصرہ کیا گیا ہے مگر ترقی پسند شعراء کا جائزہ یہیں ختم نہیں ہوجاتا۔ 1947ء کے بعد بھی اس تحریک کے زیر اثر جو شعری سرمایہ سامنے ہے اور جس قدر شعراء اس سے وابستہ رہے ہیں ان کی فہرست تیار کی جائے تو اس کے لیے ایک دفتر درکار ہے ۔ نہ صرف ترقی پسند شعراء نے بلکہ جو شعراء اس تحریک سے وابستہ نہیں بھی تھے انہوں نے

بھی اپنی شاعری میں مزاحمت واحتجاج اورانقلاب سے اتفاق رکھتے ہوئے ترقی پسندشاعروں سے ملتی جلتی شاعری کےنمونے پیش کیے ان میں ساغرنظامی، روشن صدیقی،جمیل مظہری،جگن ناتھ آزاد، مجیدامجدوغیرہ شامل ہیں جنہوں نےتقسیم ہندکے بعد کے سیاسی وسماجی حالات کو اپنی شاعری کے ذریعے پیش کیا۔

باب چہارم

علی سردار جعفری اورمخدوم محی الدین کی نظموں کا تفصیلی جائزہ:

☆ مخدوم محی الدین

(الف) مختصر سوانح عمری

(ب) ابتدائی رومانی شاعری

(ج) مخدوم کی مزاحمتی ،احتجاجی اورانقلابی نظموں کا تفصیلی جائزہ

☆ علی سردار جعفری

(الف) مختصر سوانح عمری

(ب) ابتدائی رومانی شاعری

(ج) سردار جعفری کی مزاحمتی ،احتجاجی اورانقلابی نظموں کا تفصیلی جائزہ

مخدوم محی الدین

مختصر سوانح عمری:

مخدوم کا پورا نام ابوسعید محمد مخدوم محی الدین خدری تھا، مخدوم تخلص رکھتے تھے۔ان کے بزرگ مولوی رشیدالدین اور سید جعفر علی کئی پشت قبل ترک وطن کر کے شمالی ہند سے دکن آئے تھے اور ضلع میدک کے قصبہ منمول میں آباد ہو گئے تھے۔ان کے پردادا کا نام مخدوم محی الدین تھا۔ڈاکٹر داؤد اشرف اس ضمن میں فرماتے ہیں:

> ''مخدوم کے نانا اور دادا دونوں شمالی ہند کے رہنے والے تھے۔مخدوم کے نانا سید جعفر علی جنگ آزادی 1857 کے ہنگاموں کے نتیجہ میں شاہجہانپور (یوپی) سے میدک آئے تھے۔ان کے دادا رشیدالدین اعظم گڑھ سے حیدرآباد آئے تھے۔وہ فوج میں ملازم تھے۔'' [1]

مخدوم کے والد کا نام غوث محی الدین خدری تھا جو تحصیل کے دفتر میں صیغہ دار (کلرک) تھے۔مخدوم میدک میں پیدا ہوئے لیکن ان کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے،انہوں نے نریش کمار شاد کو جو انٹرویو دیا تھا اس میں سال پیدائش 1907 بتلایا تھا،داؤد اشرف کے مطابق 4/فروری 1908 ہے،جبکہ راج بہادر گوڑ کے مطابق 3/فروری 1908 ہے۔مرزا ظفرالحسن نے اپنی تصنیف ''عمر گزشتہ کی کتاب''میں ان کی تاریخ پیدائش سے متعلق مختلف رائے بیان کی ہے:

> ''حیدرآباد دکن کے مرحوم ماہنامہ ''صبا'' کے مخدوم نمبر (ص 277) میں نریش کمار کا ایک انٹرویو ہے جس میں مخدوم نے اپنی پیدائش 1907 کی بتائی ہے۔اسے اگر درست مانیں تو اس کی تردید جشن مخدوم سے ہو جاتی ہے جو ساٹھ (۶۰) سال کی عمر کو پہنچنے پر حیدرآباد (دکن) میں 1966 میں منایا گیا تھا۔اوراس سے سال پیدائش 1906 نکلتا ہے۔
> سید سبط حسن نے ''مخدوم اور کلام مخدوم'' کے نام سے جو کتاب شائع

---

[1] (مخدوم ایک مطالعہ۔ داؤد اشرف۔ 1967۔ انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش۔ ص 9)

کی ہے۔اس میں 1908 لکھاہے۔''صبا'' کے مخدوم نمبر(ص:25)
میں مستند جائزے کے عنوان کے تحت 1910 لکھاہے۔'' [1]

ڈاکٹر داؤد اشرف نے اپنی کتاب ''مخدوم ایک مطالعہ'' میں ان کی والدہ کے حوالے سے لکھاہے کہ جس رجسٹر میں افراد خاندان کی پیدائش کی تاریخیں درج ہیں، اس میں مخدوم کی تاریخ پیدائش 4رفروری 1908 تحریر ہے۔ان تمام شواہد کے مطابق 4رفروری 1908 کو ہی صحیح تاریخ پیدائش قرار دیا گیاہے۔چار سال کی عمر میں ہی والد کا عالم جوانی میں انتقال ہوگیا۔والدہ نے دوسری شادی کر لی لیکن وہ مخدوم کو اپنے ساتھ نہ رکھ سکیں لہٰذا مخدوم کے چچا مسمیٰ بشیرالدین نے اپنے مرحوم بھائی کے بیٹے کی پرورش کا ذمہ اپنے سر لے لیا۔

مخدوم کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔قرآن شریف کے ساتھ عربی اور فارسی کی بھی تعلیم حاصل کی۔بلا کے ذہین تھے،مطالعے کا شوق بچپن سے تھا لیکن غربت وافلاس کے باعث اس میں خلل پڑتا رہا۔گاؤں کے اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر اپنے چچا کے ساتھ سنگاریڈی جانا پڑا۔ جب وہ ہائی اسکول میں تھے تبھی سکندر نامہ، دیوان حافظ، مثنوی مولانا روم کا کچھ حصہ، اخلاق محسنی، سعدی کی گلستاں اور بوستاں کا مطالعہ کرلیا تھا۔دیگر کتابیں بھی زیر مطالعہ تھیں جس کے باعث ادب سے دلچسپی بڑھ رہی تھی۔1929 میں سنگاریڈی ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اوراسی سال حیدرآباد سے ہی منشی کا امتحان پاس کیا پھر 1929 میں ہی جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔تعلیم جاری رکھنے کے بعد مخدوم کو سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ان ہی حالات میں مخدوم نے آئی۔اے کا امتحان پاس کیا اوراسی درمیان انہیں اخبار ''شیر دکن'' میں ترجمے کا کام بھی مل گیا تھا اور ٹیوشن کے ذریعے بھی کچھ آمدنی ہوجاتی تھی۔1932 میں ایک سال ضائع کرکے انٹرمیڈیٹ کیا، 1934 میں بی۔اے اور 1936 میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔جب تعلیمی سلسلہ ختم ہوا تو فکر معاش دامن گیر ہوئی۔مخدوم نے ایک بار پھر سے اخبار میں ترجمے کا کام شروع کردیا۔1939 میں حیدرآباد سٹی کالج میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے لیکن زیادہ دنوں تک وہاں ٹک نہیں سکے کیونکہ انہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ اگر وہ ملازمت کرتے رہے تو پوری طرح سے عوام کی خدمت نہیں کرسکیں گے۔

---

[1] (عمر گزشتہ کی کتاب: فیض احمد فیض اور مخدوم کی زندگی اور تخلیقات کا تذکرہ، مرزا ظفر الحسن، 1978، ادارہ

1933 میں بے روزگاری اورنیم فاقہ کشی کے دور میں مخدوم کی شادی رابعہ مخدوم سے ہوگئی۔رابعہ مخدوم بڑی حوصلہ مند بیوی ثابت ہوئیں،محدود آمدنی اورتنگ دستی کے باوجودبھی مخدوم کی ازدواجی زندگی بے حدخوش گوارتھی۔شادی کے بعد جب تک مخدوم کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی وہ اپنے والد کے گھر رہیں۔مخدوم کی روپوشی کے زمانے میں یہی صورت حال رہی۔ان کی اولادمیں ذکیہ اساوری،سعیدالدین اور رفیعہ لیتا مخدوم کے طالب علمی کے زمانے میں ہی پیدا ہوئیں۔سعیدالدین کا کم عمری میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔نصرت محی الدین اورظفرمحی الدین بعدمیں پیدا ہوئے۔پھر رفیعہ بھی کم عمری میں چل بسی۔یہ سب بچے مخدوم کو''چچاباوا'' کہا کرتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت مخدوم''نظام نیز حیدرآباد'' کے شاہی اورمطلق العنانی کے سب سے بڑے دشمن سمجھے جاتے تھے اوراس لئے انہیں روپوش ہونا پڑا،اسی اندیشے سے ان کی اولادوں کوکہیں عتاب شاہی کا شکار نہ ہونا پڑے اس لیے مخدوم ان کے چچا کے حیثیت سے جانے جاتے تھے۔

مخدوم ایک صداقت پسندانسان تھے۔جھوٹ سے انہیں سخت نفرت تھی۔وہ اپنے بچوں کوبھی ہمیشہ سچ بولنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔حاضر دماغ اور بذلہ سنج مزاج ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت تھی،ہنسی مزاق میں طنز کا نشتر بھی چھپا ہوتا تھا۔حاضر جوابی تو کوٹ کوٹ کربھری ہوئی تھی۔حالات نے ان کی بذلہ سنجی پرضرب لگادی۔معاشی پریشانیاں اوردیگرمسائل کے زیراثران کی زندگی کا بیشتر حصہ غم اورتکلیف میں گزرا۔انہوں نے بڑی بڑی صعوبتیں آسانی سے برداشت کرلیں لیکن ایک شاعرہونے کے ناطے ان میں نازک مزاجی بھی تھی۔مخدوم کی ہنس مکھ،خوش دل اور کھلنڈری شخصیت کے پیچھے ایک سنجیدہ فکر پوشیدہ تھی۔وہ لوگوں میں خوشیاں بانٹنا چاہتا تھا،ہرفرد کو خوش دیکھنا چاہتا تھا،وہ لوگوں کے دکھ درد میں شریک تھا۔غمزدہ لوگوں کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے، ان کے اطراف کوئی بھوکا نہ رہے،کوئی نیم برہنہ نہ رہے۔مزاج کے مطابق مارکسزم کا مطالعہ شروع کردیا تھااورآہستہ آہستہ اشتراکیت کی طرف مائل ہونے لگے۔اس وقت انگریز حکمرانوں نے اشتراکیت کو ہوا بنارکھا تھا۔برصغیر کی حکومت اس کے خلاف تھی،لٹریچراور پارٹی پر پابندی تھی۔ 1936 میں مخدوم کمیونسٹ پارٹی کے رکن بن گئے۔1939 میں ناگپور کے'' کامریڈگروپ'' کی مدد سے مخدوم

نے حیدرآباد میں طلبہ تنظیم قائم کی اس سے ان کی عوامی جدوجہد کا آغاز ہوا۔

اس عوامی جدوجہد کے چلتے انہیں لاتعداد مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑا، کئی بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑی اوراس دوران روپوشی کی زندگی بھی گزارنی پڑی جس کے سبب وہ اپنے بیوی بچوں سے چھپ چھپ کر ملتے تھے اوران کے بچے انہیں ''چچاباوا'' کہہ کر بلاتے تھے۔ عوام کے محاذ پر آجانے کے بعد ٹریڈ یونین کے جلسوں میں مخدوم نے تقریریں کیں۔اب وہ ان تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔1944 میں ''قومی ہفتہ'' کے موقع پر انہوں نے جلسہ عام میں ایک ''مضرت رساں'' تقریر کی جس کی وجہ سے انہیں جیل بھیج دیا گیا۔دوسری بار 1946 میں آل حیدرآباد ٹریڈ یونین کانگریس کے اجلاس میں شرکت اور باقاعدہ صدارت کے بعد مخدوم کو جیل کی ہوا کھانی پڑی، ضمانت پر رہا ہوئے۔لیکن پھر جلد ہی 1946 میں ان کے نام وارنٹ جاری ہوا کیونکہ وہ شاہ آباد سیمنٹ فیکٹری ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں کے سلسلے میں مصروف تھے کہ پارٹی کی طرف سے اطلاع دی گئی کہ وہ روپوش ہوجائیں اور 1946 سے 1951 تک وہ روپوش رہے۔ اسی دوران 1948 میں کلکتہ میں کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانفرنس میں شرکت کی اور حیدرآباد آکر پھر روپوش ہوگئے۔آزادی کے بعد جب حکومت کا نظام کانگریس پارٹی کے ہاتھ میں چلا گیا تو اس وقت بھی مخدوم اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے حکومت پر نکتہ چینی کرتے رہے جس کے باعث 1951 میں انہیں پھر گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا لیکن انتخابات 1952 سے پہلے انہیں رہائی مل گئی اور وہ لوک سبھا کے امیدوار بھی بنے۔انہوں نے ایک نڈر لیڈر کی طرح طاقتور حکمرانوں اور سیاستدانوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا تھا لیکن موت نے انہیں بے بس کردیا اور وہ 28 اگست 1969 کو راہیٔ ملک عدم ہوگئے۔

ابتدائی رومانی شاعری

مخدوم کوبچپن سے ہی ادب سے دلچسپی تھی۔وہ چپکے چپکے ادبی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے کیونکہ گھر کا ماحول ادبی تھا اس لئے وہاں صرف مذہبی کتابیں پڑھی جاتی تھیں۔جب کہ مخدوم کا مزاج اس سے کافی جدا تھا وہ کھنڈرا اور ہنسوڑ قسم کے شخص تھے اور یوں ہی مذاق مذاق میں مزاحیہ نظم ''پیلا دوشالہ'' تخلیق کی۔نہ تو انہیں علم عروض سے آگاہی تھی اور نہ ہی کسی کا تلمذ اختیار کیا۔طالب علمی کے زمانے کی شوخی وظرافت ان کی نظم کی محرک بنی۔لیکن داؤد اشرف کا کہنا ہے کہ ''پیلا دوشالہ'' مخدوم کی پہلی نظم نہیں ہے کیونکہ یہ 1929 میں لکھی تھی اوراس سے پہلے بھی مخدوم نے دو نظمیں ''بچے''،اورنقادٗ''لکھی تھی۔وہ اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

> ''عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ''پیلا دوشالہ''مخدوم کی پہلی نظم ہے لیکن اس سے پہلے وہ ایک اور نظم ''بچے'' لکھ چکے تھے۔یہ نظم نہ تو کسی رسالے میں شائع ہوئی اور نہ اب شاعر کے یہاں موجود ہے۔ابتدائی نظموں میں ایک اور نظم ''نقادٗ'' کا بھی یہی حال ہے۔'' [1]

ترقی پسند شعراء کی شاعری کا آغاز اکثر رومانی انداز میں ہی ہوا ہے۔مخدوم کی شاعری کی ابتدا بھی رومانی انداز میں ہوتی ہے ان کے ہمعصروں میں فیض،سردار جعفری،مجاز،ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری،جذبی وغیرہ نے بھی رومانی شاعری سے ہی شروعات کی تھی۔ان کی شاعری میں حسن وعشق کے معاملات تو ہیں لیکن وہ کلاسکی شاعری سے قدرے مختلف ہیں۔ان کا محبوب روایتی محبوب سے تھوڑا منفرد ہے،اس کا انداز جداگانہ ہے۔جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ مخدوم کا بچپن غربت وافلاس،ناامیدی اور سخت مصائب میں گزرا لیکن ان کی طبیعت میں شوخی تھی اس لئے عنفوان شباب کی سرمستیوں نے انہیں تخیلات کی دنیا میں پہنچا دیا۔ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ غم وآلام اور پریشانیوں کے چلتے ان کی شاعری کا آغاز بھی اسی طرح کے مضامین سے ہوتا چونکہ رومانی شاعر اپنے حالات سے بے زار ہوتا ہے اوراس طرح وہ تخیل کی دنیا تخلیق کر لیتا ہے اس لئے مخدوم نے بھی اپنے موجودہ

---

۱ (مخدوم ایک مطالعہ، داؤد اشرف، 1967، انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش، ص 51)

حالات کے مصائب سے بے زار ہوکر اپنے تخیلات کی مدد سے رومانی شاعری کا آغاز کیا۔ اوراس میں رجائی انداز مثلاً تصویر کا روشن پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کی ابتدائی رومانی نظموں میں ''طور''،''تلنگن''،''ساگر کے کنارے''،''آسمانی لوریاں''،''سجدہ''،''محبت کی چھاؤں''، ''لمحہ رخصت''، وغیرہ میں رومانیت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے لیکن ان کی رومانی شاعری بھی خصوصیت کی حامل ہے جس میں روایتی آوارہ مزاجی،،اخلاقی قدروں کا زوال اورلذت پسندی کا مظاہرہ نہیں ہے۔ان کی رومانی نظموں سے متعلق سیدہ جعفر اپنے مضمون ''عصری حیثیت اورشعری صناعی کا شاعر میں''، رقم طراز ہیں:

> '' مخدوم نے مظاہرقدرت اورمناظرفطرت سے پس منظر کا کام لے کر اپنی رومانی نظموں کوایک خاص معنویت اورایمائیت عطا کی ہے۔ یہ سبک،رسیلی اورترنم زیرنظمیں ایک ایسی رومانیت سے سرشار ہیں جن میں مادی پس منظر اور ارضی زندگی کے جیتے جاگتے حقائق کا احساس موجود ہے۔ ارضیت کا یہ عنصر مخدوم کی اس ابتدائی شاعری کو جو بظاہر محض حسن کے نغموں کی شاعری ہے، واقعیت عطا کرتا ہے۔ان نظموں میں بار بار اس کا احساس ہوتا ہے کہ شاعر نئی بات کہنے کی ''درپے'' نہیں بلکہ اس کی انفرادیت ایک نئے لب ولہجے کی تشکیل پر اکسارہی ہے۔مخدوم کی عصری حیثیت نے ان کی رومایت کو گہرائی اوروسعت عطا کی ہے۔'' [۱]

مخدوم کا پہلا مجموعۂ کلام ''سرخ سویرا'' ہے اس مجموعے میں ان کی پہلی نظم ''طور'' ہے۔ یہ ان کی ابتدائی عشقیہ نظم ہے۔ ہئیت کے اعتبار سے یہ مخمس ہے اورکئی بندوں پر مشتمل ہے جس کے ہر بند کے پہلے چار مصرعوں کے ردیف وقوافی یکساں ہیں اور پانچواں مصرع ہر بند کے آخر میں بغیر کسی تبدیلی کے دہرایا گیا ہے۔نظم اس کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے ؂

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے
یہیں کی جرأت اظہار حرف مدعا میں نے

۱(فکرو تحقیق۔مخدوم محی الدین نمبر۔اپریل سے جون 2008،شمارہ 2۔جلد ۱۱۔قومی کونسل برائے فروغ

یہیں دیکھتے تھے عشوے، ناز و انداز حیا میں نے
یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

نوجوانی کی محبت سے متعلق اس نظم کو غور سے پڑھنے پر ایک ایک منظر سے شاعر کی پاکیزہ محبت اوراس کی معصومیت کا احساس ہوتا ہے۔ کتنے سیدھے سادے الفاظ اورآسان زبان کے ذریعے اپنے جذبات اور احساسات کو وسیلہ اظہار بنایا ہے۔مخدوم کا انداز اورلب ولہجہ دوسرے رومانی شعراء سے کافی حد تک منفرد ہے۔ان کے اچھوتے پن کی مثال ملاحظہ فرمائیں ۔

نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

مذکورہ بالامصرعہ ''خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے''پوری نظم کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے کلید کا کام کرتا ہے۔اس میں نوجوان رومانی شاعر نے اپنے اعتقاد کا اظہار کیا ہے کہ اس دنیا میں محبت سے زیادہ اہم اور کچھ نہیں ہے۔مخدوم کا پہلا مجموعہ ''سرخ سویرا''میں مقدمہ کے طور پر اس خط کو شامل کیا گیا ہے جو سبط حسن نے 25/دسمبر 1943 میں مخدوم کے نام بمبئی سے لکھا تھا، لکھتے ہیں:

> ''نظم پڑھتے پڑھتے تم جب اس مصرعہ پر پہنچتے تھے کہ ''خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے'' تو میں نے قاضی صاحب (قاضی عبدالغفار) سے کہا تھا، دیکھئے ہمارے نوجوان شاعروں میں محبت کا کتنا پاکیزہ اور معصوم تصور پیدا ہو رہا ہے۔ اور انہوں نے جواب دیا تھا کہ ''خدا اس نئی پود کو پروان چڑھائے۔ جو خدا کے سامنے پیار کرنے سے نہیں جھجھکتی اور جس کا خدا بھی اتنا شفیق اور مہربان ہے کہ اس معصوم مظاہرے پر خوش ہوتا ہے۔'' [1]

مخدوم کی ابتدائی شاعری پر رومانیت اور شباب بکھرا ہوا ہے، ان کو جہاں کہیں بھی رنگینی نظر

---

[1] (سرخ سویرا، مخدوم محی الدین، 1944ء اشاعت گھر، حیدرآباد، دکن، ص ۱۰)

آتی ہے وہ وہیں ٹھہر جاتے ہیں اور لطف اندوز ہونے لگتے ہیں۔ بھلا شاعر ایسے موقعوں سے کہاں چوکتے ہیں، ایسا نظارہ انہیں اپنی جانب کھینچتا ہے۔ جوانی کا عالم اور اس پر گرم خون، ساتھ ہی حسن و عشق کی بہاریں اپنے شباب پر ہیں۔ نظم ''ساگر کے کنارے'' میں حسن کی تصویر کچھ اس طرح سے کھینچی ہے جیسے وہ ایک مصور ہوں۔ لڑکیوں کا ساگر کے کنارے پانی بھرنا، اور اس ناز و انداز سے گگری کو سر پر لے کر چلنا ایسا لگتا ہے دنیا کا سارا حسن آج ان میں سمٹ آیا ہے۔ مخدوم کی منظر کشی کا یہ عالم ہے ۔

انگڑائیاں لیتا ہوا طوفان جوانی
ملتا ہوا آنکھیں اٹھا فتنوں کو جگانے

کچھ لڑکیاں آنچل کو سمیٹے ہوئے بر میں
گگری لئے سر پر چلیں پانی کے بہانے

چلتی ہیں اس انداز سے دامن کو سنبھالے
صدقے ہوئی شوخی تو بلائیں لیں ادا نے

پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی
کچھ شعلہ بدن اترے ہیں پانی میں نہانے

مخدوم کے یہاں دیہات کی منظر کشی اور ماحول کا بیان بڑے ہی والہانہ انداز میں ملتا ہے۔ ان کو دیہات سے کافی لگاؤ ہے۔ خصوصاً گاؤں کے کھیتوں سے۔ وہ فرصت کے لمحات میں کھیتوں میں جاتے تھے اور وہاں وقت گزارتے تھے۔ اپنی نظم ''تلنگن'' میں انہوں نے تلنگن لڑکیوں کی ہنسی ٹھٹھولی اور قہقہوں کا ذکر بڑے ہی شاندار انداز میں کیا ہے جو کھیت کے مینڈوں پہ بل کھاتی ہوئی چلتی ہیں۔ اپنے نرم اور شیریں قہقہوں کو اس طرح برساتی ہیں گویا پھول کی بارش ہو رہی ہو۔ وہ لڑکیاں بڑی نٹ کھٹ اور شریر ہیں لیکن ہمارے ہندوستانی دیہات کی بھی ایک تہذیب ہے، یہاں کی لڑکیاں خواہ شرارتی اور بے باک ضرور ہیں لیکن کسی غیر مرد کی موجودگی میں وہ اپنے دائرے میں رہتی ہیں اور بڑی تہذیب سے پیش آتی ہیں۔ لیکن شاعر یہاں ان لڑکیوں کو اسی کیفیت میں دیکھنا

چاہتا ہے لیکن جب ان چنچل لڑکیوں کو غیر مرد کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنا گانا بند کر دیتی ہیں لیکن شاعر کی حسرت کچھ اور ہے وہ ان کی اس مستی کو مزید دیکھنا چاہتے ہیں ۔

پھرنے والی کھیت کے مینڈوں پہ بل کھاتی ہوئی
نرم و شیریں قہقہوں کے پھول برساتی ہوئی

کنگنوں سے کھیلتی ، اوروں سے شرماتی ہوئی
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو ، گائے جا

ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

مخدوم کی نظم ''سجدہ'' بھی اسی قبیل کی نظم ہے جس میں ان کا محبوب بڑا شوخ ، چنچل ،خوش مزاج ہے۔مخدوم کو اس کی ہنسی ،اس کی ناز وادا، چھیڑ چھاڑ سب یاد آتی ہے جس سے وہ رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔مخدوم کے یہاں ایسی کئی نظمیں ہیں جو رومانیت سے بھرپور ہیں لیکن نظم ''انتظار'' ان کی بے چینی اور بے بسی کی ترجمان ہے۔اس نظم کا ایک ایک شعر محرومی و ناکامی کے احساس سے پر ہے۔ ابتدا میں تو انہیں یقین تھا کہ ان کا یہ انتظار ایک دن ختم ہوگا اور ان کا محبوب ضرور آئے گا لیکن دھیرے دھیرے یہ امید بھی جاتی رہی۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا
اپنا ارمان برافگندہ نقاب آئے گا

لیکن شاعر انتظار کرتے کرتے ناامید ہو گیا ہے کیونکہ اب آنے کا وقت نکلا جا رہا ہے اور اب وہ مایوسی کی طرف مائل ہو رہا ہے وہ دھیمے لہجے میں دبی ہوئی آواز میں کہہ رہا ہے ۔

شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی ایک آس تھی اب جانے لگی

اب اس کی امیدٹوٹ گئی اوراب اسے شکوہ بھی ہورہاہے۔اس طرح کی نظموں کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتاہے کہ شاعرنے واقعی عشق کیاہے۔وہ بار باراپنے محبوب سے التجا کررہاہے کہ اے محبوب تم نے میری نیندیں اڑائی ہیں اورتم اس قدر میری روح پر چھاگئے ہو، میں نے تمہیں اپنا مسجود مان لیاہے اورمیری پیشانی میں جوسجدے ہیں وہ تمہارے لئے تڑپ رہے ہیں،ان کا بھی ارمان رہ جائے اورتیرے قدموں پرسر رکھ کرمیں آسانی سے جان دے سکوں اس طرح میری دونوں خواہشیں پوری ہوجائیں ۔

میرے محبوب! میری نیند اڑانے والے
میرے مسجود میری روح پہ چھانے والے
آ بھی جاتا کہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جاتا ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

''محبت کی چھاؤں''،''لمحہ رخصت''،''یادہے''،''چارہ گر''وغیرہ مخدوم کی عشقیہ نظمیں ہیں جس میں انہوں نے اپنے جذبات واحساسات کی بھرپورترجمانی کی ہے۔حسن وعشق کی کیفیت انہوں نے بڑے ہی حقیقی انداز میں پیش کیاہے۔یہ نظمیں ان کے رومانی اندازکو بڑے ہی سلیقے سے پیش کرتی ہیں۔یہ توان کے ابتدائی دورکی نظمیں تھیں،دھیرے دھیرے وقت اورحالات تبدیل ہوتے گئے اورشاعری میں نیارنگ وآہنگ اورنئے موضوعات کوجگہ ملی۔

مخدوم کی مزاحمتی ،احتجاجی اورانقلابی نظموں کا تفصیلی جائزہ

اردوشاعری کی دنیامیں مخدوم رومانی شاعرکی حیثیت سے شامل ہوئے تھےلیکن وقت اور حالات کے مدنظرانہیں اپنے شعری موضوعات میں تبدیلی کرنی پڑی۔وہ دورترقی پسندتحریک کا تھا دورتھاجس میں شاعراورادیب ایک مقصد کےتحت ادب کی تخلیق کررہے تھے۔وہ ادب کوایک سماجی عمل قراردیتے ہیں جس کااپناایک منفردنصب العین تھا۔مخدوم کی شاعری اسی پس منظر میں ابھرکر سامنے آئی۔جس کااثرمخدوم کی شاعری پربھرپورطرح سے پڑا،مخدوم اس تحریک سے وابستہ نہ ہوتے تو شاید کچھ بھی نہ ہوتے ،وہ کافی عرصے تک اس تحریک کے روح رواں بنے رہے ان کی وجہ سے ترقی پسندتحریک نہ صرف حیدرآبادمیں بلکہ پورے آندھراپردیش میں پھیل گئی۔انہوں نے سامراجی اورجاگیردارانہ عناصرکی مخالفت کی۔مخدوم اس دورکے حالات کو بہ خوبی سمجھتے تھے اور انہیں اصولوں کواپنی زندگی اورشاعری میں بھی برتتے تھے۔انہوں نے اپنی زندگی اورشاعری دونوں کوعوام کے لئے وقف کردیا تھا۔کسانوں اورمزدوروں کوجواب تک خواب غفلت میں تھے ،بیدار کیا۔سامراجی نظام اوربڑے بڑے زمین داروں کے خلاف انہیں بھڑکایااورقومی اورسیاسی آزادی کے لیےبھی انہیں استوارکیا۔

مخدوم نے ترقی پسندی کے مفہوم کواچھی طرح سمجھ لیا تھا۔وہ انسانی معاشرے کوپستی سے نکال کر بلندی تک پہنچانے کے خواہش مند تھے اوراس کے لیے وہ جوبھی کرسکتے تھے کررہے تھے، انہیں اس بات کااحساس تھاکہ یہ رومانی شاعری اس دورکے لیے کافی نہیں ہے اوروقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے انہوں نے دوسری ترکیب نکالنی ہوگی ۔اوراس طرح وہ ترقی پسندادب سے وابستہ ہوگئے جواس وقت عوام کی آواز بلندکررہا تھا۔انہیں عوام کی قوت پر بھروسہ تھا اورانہوں نے عوام کوسیاسی اورسماجی دونوں ہی طورسے سمجھا تھا۔انہوں نے اپنے ماحول سے خاصا اثرقبول کیایہ اس کا ہی نتیجہ ہے کہ ان کی قلم سے ''اندھیرا''،''جنگ''اور''سپاہی'' جیسی نظمیں تخلیق ہوئیں۔اور اس طرح سے ان کی شاعری رومان اورانقلاب کاخوبصورت امتزاج بن گئی۔ان کی شاعری کے

متعلق مشہور ومقبول ادیب شارب ردولوی اپنے مضمون مخدوم کی نظموں کا آہنگ میں فرماتے ہیں:

''مخدوم کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی رومانی اور انقلابی شاعری۔ یہ تقسیم اس عہد کے بیشتر شعراء کے کلام میں نظر آئے گی۔ وہ عہد ہی دو طرح کے افکار کا سنگم تھا۔ ایک طرف عاشقانہ شاعری تھی جس کی ایک بڑی اور توانا روایت تھی، اس میں سطحی عاشقانہ جذبات کا اظہار بھی تھا اور فکری گہرائی بھی تھی، جس کا ایک سرا تصوف اور فلسفے سے جاملتا ہے۔ دوسری طرف سیاسی و تاریخی اثرات اپنی جگہ بنا رہے تھے اور ظاہر ہے کہ بدلتے ہوئے حالات، سرمایہ داری کی لائی ہوئی لعنتیں، غلامی، غربت، افلاس، قحط، جنگ عظیم کے ردعمل سے ایک حساس اور بیدار ذہن کیوں کر بے نیاز رہ سکتا تھا۔ اس لیے شاعری میں انحراف اور بغاوت کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ ترقی پسند تحریک کے اثرات اور مقبولیت نے اس کی رفتار کو کچھ اور تیز کر دیا تھا۔''[1]

مخدوم کی انقلابی شاعری میں سرفہرست نظم ''باغی'' ہے۔ اس نظم میں شاعر بغاوت کا اعلان کر رہا ہے جس میں نہایت گھن گرج ہے۔ شاعر کے بلند حوصلے اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ وہ ایک شیر دل بہادر کی طرح حالات سے لڑنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اب اس نے ارادہ کرلیا ہے کہ ہمارا جذبۂ بیداری اب پست نہیں ہوگا ان کے حوصلے اب دن بہ دن بڑھتے جائیں گے۔ اور اس کو اس بات پر پورا یقین ہے کہ ہم جلد ہی ان سرمایہ داروں سے نجات پا جائیں گے۔ اب ان کے ظلم وستم کو بہت برداشت کرلیا ہے ان سامراجی طاقتوں کا کاتمہ کر دیا جائے گا۔ جب تک ظلم و استبداد کو ختم نہیں کیا جائے گا تب تک اس کو چین نہیں ملے گا، اس بے قراری کے عالم میں اس کو کہیں سکون نہیں ہے۔ وہ اس اضطراب کی حالت میں پورے جہان کو آگ لگا دینا چاہتا ہے۔ وہ خود کی طاقت کو پہچان رہا ہے، خود کی قوت کا اندازہ اسے اچھی طرح ہوگیا ہے، اسے خود پر اعتماد ہے

۱(فکر وتحقیق، مخدوم محی الدین نمبر، اپریل تا جون 2008، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

کہ وہ اس سرمایہ دارانہ نظام سے ٹکر لے سکتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

رعد ہوں، برق ہوں، بے چین ہوں، پارا ہوں میں
خود پرستار ، خود آگاہ ، خود آرا ہوں میں

گردن ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں
خرمن خود جلادے وہ شرارا ہوں میں

مری فریاد پہ اہل دل انگشت بہ گوش
لا، تبر ، خون کے دریا میں نہانے دے مجھے

مخدوم کی جوانی کا محدود مشاہدہ اور شوق اظہار اس نظم میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ اردو ادب کے نامور نقاد پروفیسر احتشام حسین اپنے مضمون ''ہم صغیر انقلاب ۔مخدوم'' میں اس نظم سے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں :

''رومانیت کا فطری انداز، جوانی کے تقاضے، ٹیگور اور ورڈز ورتھ سے دلچسپی کا نتیجہ یہ تھا کہ حقیقتوں کو تخیل کی راہ سے پانے کا رجحان نمایاں ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب ہندوستان کی سیاسی جدوجہد نے بغاوت کی راہ دکھائی تو اس میں بھی تخیلی اور جذباتی خود اظہار پر حاوی ہے۔ وہ نظم جس کا عنوان ''باغی'' ہے قطعاً اسی سلسلے کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں بھی خود پرستاری ایک خامکار سیاسی ذہن پر چھائی ہوئی ہے اور اظہار کو غصہ اور جوش میں تبدیل کر دیتی ہے۔'' [1]

مخدوم کی مزاحمتی واحتجاجی شاعری میں بلا وجہ کا شور اور چیخ پکار نہیں ہے ان کی نظمیں بے کار کی نعرہ بازی اور چیخ و پکار سے عاری ہیں ۔نظم ''سپاہی'' میں محاذ پر جانے والے سپاہی کا کرب محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھر والوں پر کیا کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں اس کا احساس بھی شدت سے ہوتا ہے۔ اس کی بیوی بچے اور گھر والے اس کی آمد کے انتظار میں کس قدر بے تاب اور بے چین ہوتے ہیں اور خانہ داری نظام کس کسمپرسی کا شکار رہتا ہے۔ کتنے بچے

مفلسی کا شکار ہو جاتے ہیں، ان گنت جوانیاں بیوگی کی چادر میں دم توڑ دیتی ہیں، کچھ تو کھلتی ہیں، کچھ کِھلتی ہیں، انگڑائیاں لیتی ہیں اور کمہلا جاتی ہیں۔ بند ملاحظہ ہوں ؎

کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے
بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے

لاش جلنے کی بو آ رہی ہے
زندگی ہے کہ چلا رہی ہے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

نظم ''جنگ'' مخدوم کی پہلی سیاسی نظم قرار دی جاتی ہے۔ اس نظم کو سبط حسن نے فاشزم کے خلاف اردو کی پہلی احتجاجی صدا سے تعبیر کیا ہے۔ اس نظم میں جنگ کے خوفناک منظر کا بیان ملتا ہے جس سے نہ صرف انسانیت بلکہ تہذیب و اقتدار پر بھی کاری ضرب پڑتی ہے۔ توپوں کے دہانے سے جو خوفناک آواز نکلتی ہے دراصل یہ انسانیت کی بربادی پر نالہ ہے جسے مخدوم نے بربادیوں کے راگ سے، تعبیر کیا ہے اور انسانیت کی خوں آزاری پر فلک بھی خاموش تماشائی ہے۔ زندگی اس کسمپرسی پر شرمندہ ہے ؎

نکلے دہان توپ سے بربادیوں کے راگ
باغ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ

خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زندگی
قربان گاہ موت پہ رقصاں ہے زندگی

اردو شاعری میں مشرق و مغرب استعاراتی شکل میں استعمال ہوئے ہیں۔ مشرق حق، روشنی، ایثار و قربانی و وفاداری کا استعارہ ہے جب کہ مغرب اس کے برعکس باطل، تاریکی، اور مادیت کا استعارا سمجھا جاتا ہے۔ مخدوم نے نظم ''مشرق'' میں فرسودہ نظام کو چیلنج کیا ہے اور مشرق میں پنپتی مفلسی، بدعنوانی اور مادیت میں لپٹی ہوئی تہذیب پر بے لاگ چوٹ کی ہے اور تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔ مثال

ملاحظہ کیجئے ۔

جہل ، فاقہ ، بھیک ، بیماری نجاست کا مکان
زندگی ، تازگی ، عقل و فراست کا مسان

وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام

مخدوم نے ''مشرق'' کوکسی اور ہی روپ میں دیکھا ہے اوراس کے چہرے سے نقاب اٹھا کر اس کا اصل روپ دکھا دیا ہے۔یہی ان کی مشرق سے بیزاری کی دلیل ہے لیکن ''مشرق'' یعنی اپنے ماحول سے بیزاری مخدوم کی انقلابی حرارت میں تبدیل ہوگئی ہے جو جوالامکھی طرح پھوٹ پڑی ہے۔انہوں نے مایوسی اور نا امیدی کے اندھے کنویں میں پڑے مشرق کی تصویر کشی کی ہے جس کے بازوجھڑ چکے ہیں اور جو مریض دق کی طرح کھل کر سانس لینے میں بھی خود عاجزی محسوس کرتا ہے۔ یہ ایک بے گور وکفن ننگی نعش جیسا ہے جو مغرب کی ہوس کا شکار ہوکر اپنی عزت وآبرو کا سودا کر چکا ہے ۔

جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اس مشرق کو دیکھ کر
کھیلتی ہے سانس سینے میں مریض دق کو دیکھ کر

ایک ننگی نعش ہے گور وکفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی

پوری نظم میں ایک مایوسی ، یاس اور غم کی کیفیت طاری ہے شاعر مشرق کے اس نظام سے نہایت غم زدہ اور مایوس ہے جہاں صدیوں سے گھنا اندھیرا چھایا ہے اور جہاں کے لوگ اصحاب کہف کی طرح صدیوں سے محوخواب ہیں ۔

اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں
خواب اصحاب کہف کو پالنے والی زمیں

نظم میں کل آٹھ اشعار ہیں جس میں سے سات مایوسی ، کرب اور نا امیدی کی آغوش میں

لپٹے ہیں۔نظم کا آخری شعر احتجاج کی صورت میں ابھرتا ہے جیسے گہرے اندھیرے میں اچانک روشنی کی کسی کرن کا گزر ہو جائے۔اس شعر میں شاعر فرسودہ نظام کو اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے ساتھ ہی ایک نئی دنیا کی تعمیر کی بات کرتا ہے جہاں بسنے والے نئی فکر اور نئی سوچ سے لبریز ہوں گے ۔

اس زمین پر موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

اس کے بعد نظم ''موت کا گیت'' بھی باغی اور انقلابی تیور لیے ہوئے ہے۔شعر کے ایک ایک مصرعے سے بغاوت کی چنگاریاں پھوٹ رہی ہیں۔حیوان کی شکل میں انسان،انسان کے خون سے بہت کھیل چکا ہے اب یہ تماشہ بند ہونا چاہئے۔اس کے لیے شاعر کہتا ہے ۔

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگر گوں کر دیں
قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

اس نظم میں مخدوم کی آواز ان کی خود کی آواز اور تیور سے یوں مختلف ہے کہ اس سے قبل اس طرح کے تیور ان کی شاعری میں اس بے باکی سے ادا نہیں ہوئے ہیں۔یہ جبر کے خلاف ایک طرح کا مزاحمتی رویہ ہے جو ان کی اب تک کی شاعری میں ناپید تھا۔پہلے وہ سسٹم کو تبدیل کرنے کی بات کرتے ہیں اور اس کے لیے نرم لب و لہجے کا استعمال کیا ہے مگر اب وہ نظام کو تبدیل کرنے کے بجائے قصر شاہی کو پھونکنے کی بات کرتے ہیں اور اس نظام کو بھسم کرنے اور بدلنے کی بات کرتے ہیں جس نظام کے تحت یہ دنیا ناپاک کرۂ ارض میں تبدیل ہو چکی ہے۔چند اشعار دیکھیں ۔

پھونک دو قصر کو گر گن کا تماشہ ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

زلزلو آؤ ، دہکتے ہوئے لاؤ آؤ
بجلیو آؤ گرج دار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ

آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

فیض نے مجاز کوانقلاب کا مطرب کہا تھا کیونکہ وہ انقلابی نظمیں پڑھتے ہیں اورانقلاب کے نغمے گاتے ہیں۔لیکن وہ بھی جبر کی حکومت کے سامنے مزاحمتی رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔وہ سوال کرتے ہیں کہ دل میں جوشعلہ بھڑک اٹھا ہے اسے کس کے سپرد کیا جائے،صبر کا پیمانہ چھلک گیا ہے اس کا کیا کیا جائے اور سینے کے زخم جو ناسور بن چکے ہیں ان کا مداوا کیسے ہو.....؟ چاروں اطراف مفلسی کے مناظر ہیں،سیکڑوں جابر وظالم حکمران ہیں آخران سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے....؟ آخروہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جبر کا مقابلہ جبر سے کیا جائے یعنی ظالم حکومت کے قصراورتخت وتاج کو نذرآتش کردیا جائے ذیل بند ملاحظہ کیجئے ؎

لے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تخت سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دو

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

مجاز کے بعد جس شاعر کے یہاں انقلابی نغمے طرب ونشاط سے مزین ہیں وہ بلا شبہ مخدوم ہی ہیں۔مخدوم کی شاعری احتجاجی ومزاحمتی اورانقلابی وبغاوتی ہوتے ہوئے بھی اس قدر دل قریب اور دل آویز ہے کہ اس احتجاج ومزاحمت کے باوجود شعری حسن کے تمام تر لوازمات سے آراستہ و پیراستہ ہے جس میں لطافت ہے،نغمگی ہے،دلفریبی ودل آفرینی ہے،دلکشی ورعنائی ہے۔جوفطری شاعری کے تمام عنوانات اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔مخدوم کے شعری کائنات میں ترقی پسند

رجحانات کی نشاندہی کرتے ہوئے پروفیسر سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

''مخدوم جن کے یہاں سیاسی اور سماجی شعور کی ابتدا ہو چکی تھی جنہوں نے فاشزم کے گھناؤنے پن کا ذکر اپنی نظم ''جنگ'' میں کیا تھا، ترقی پسند تحریک میں اپنی پوری شعوری قوت سے شریک ہو گئے۔اس کے پہلے اثرات '' مشرق'' اور ''موت کا گیت'' نامی نظموں میں ظاہر ہوئے۔ جہاں شعور محض جذبے پر غالب ہے اور گہرے تاثرات کے اظہار سے فن کی جلا ہو رہی ہے۔تبدیلی کے اس عمل میں دوسری جنگ عظیم نے نہ صرف اور تیزی پیدا کر دی بلکہ غور و فکر و شعور فن کے نئے راستے کھول دئے۔کوئی شاعر اپنی ذات کو نظر انداز کر کے تخلیق تو کر ہی نہیں سکتا۔ہاں ذات سے ماحول اور کائنات کے رشتے کو نئی طرح جوڑ کر اظہار ذات کے طریقوں کو نیا فنی پیکر عطا کر سکتا ہے۔مخدوم نے بھی یہی کیا، کبھی آزادی وطن کے سپاہی کے روپ میں کبھی مستقبل کے خواب دیکھنے والے کے بھیس میں اور کبھی کٹھن راہوں پر چلنے والے مسافر کی شکل میں اپنے ہی کو دیکھا۔کیونکہ وہ اپنی شاعری کو اپنی زندگی کے وسیع تر مقصد اور عظیم تر نصب العین سے ہم آہنگ بنانا چاہتے تھے۔وقت انہیں بدل رہا تھا اور وہ اسے اپنی شاعری میں قید کرنا چاہتے تھے۔'' [1]

مخدوم نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں، آزادی کے متوالے ترانہ آزادی گنگنا رہے تھے جو وطن کی محبت سے لبریز تھے۔ساتھ ہی جن میں انقلاب واحتجاج کی صدائیں گونج رہی تھی اور آزادی کے لئے نغمۂ جوش نغمۂ حیات بن کر مچل رہا تھا۔مخدوم نے شاعری کا آغاز کیا تو وہ ان احساسات سے ناآشنا نہ تھے۔وطن کی محبت ان کے دل میں ہچکولے لے رہی تھی، وہ بھی آزادی کا خواب دیکھتے تھے اور وطن کے روشن مستقبل کے گیت گاتے تھے۔نظم '' آزادئ وطن''میں مخدوم کے

---

۱ (ہم صفیر انقلاب، مخدوم) پروفیسر احتشام حسین، مشمولہ کلیات مخدوم محی الدین، مرتبہ فاروق ارگلی

وطن کے تئیں جذبات واحساسات بخوبی محسوس کئے جاسکتے ہیں ساتھ ہی نظم عزم، حوصلہ، ہمت اعلیٰ، جواں مردی، مستحکم قوت ارادی سے لبریز ہے۔نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجئے ؎

کہو ہندوستاں کی جئے کہو ہندوستاں کی جئے

قسم ہے خوں سے سینچے ہوئے رنگیں گلستاں کی
قسم ہے خون دہقاں کی قسم خون شہیداں کی

یہ ممکن ہے کہ دنیا کے سمندر خشک ہو جائیں
یہ ممکن ہے کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سو جائیں

جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے
روانی ترک کردیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے

زمین پاک اب ناپاکیوں کو ڈھو نہیں سکتی
وطن کی شمع آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی

مخدوم کی شاعری میں ترقی پسندرجحانات کا غلبہ ہے۔ان کی نظموں میں ناآسودگی، بغاوت، احتجاج اورانقلاب جگہ جگہ موجود ہیں۔مفلسی اورکسمپرسی نے مخدوم کوبکھرنے کے بجائے ایک منظّم فکر سے مالا مال کردیا۔بچپن میں جس کسمپرسی اورتنگ حالی کا وہ شکار تھے معاشرے کوکہیں اس سے زیادہ چیلنج درپیش تھے ۔مخدوم نے اپنی شاعری کے ذریعہ صدائے احتجاج بلندکیا۔بھوکوں، ناداروں، مفلسوں اورکمزوروں کے مسائل کواپنی شعری کائنات میں جگہ دی جوترقی پسندمنشور کے عین مطابق تھا جوایسے نظام کی طرف داری کرتا ہے جومساوات اور برابری کی تعلیم پرعمل پیرا ہو۔اس نظام پر عمل پیرا جہان کومخدوم نے ''جہان نو'' کہاہے۔اس نظم میں مخدوم کا ''جہان نو'' منعکس نظرآتا ہے ؎

نغمے شرر فشاں ہوں اٹھا آتشیں رباب
مضطرب بے خودی سے بجا ساز انقلاب
معمار عہد نو ہو ترا دست پر شباب

باطل کی گردنوں پہ چمک ذوالفقار بن

مخدوم ایک نیا جہان قائم کرنے کے خواہشمند تھے جہاں انسان انسان کے کام آئے وہ ایک دوسرے کے دشمن نہ ہوں بلکہ انسانی دوستی کا جذبہ پیدا ہو۔مگر جب وہ پرانی اورفرسودہ روایت کا ذکرکرتے ہیں تو ان کا جلال نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔وہ اس دور میں رائج جاگیردارانہ نظام سے سخت نفرت کرتے ہیں۔مزدوراورسرمایہ دار کے درمیان حقوق کی غیرمساواتی تقسیم کو وہ فرسودہ اورلغوقراردیتے ہیں۔انہوں نے مذہب کوبھی اہمیت نہیں دی ہے۔مذہب ان کے یہاں لایعنی سی چیز ہے اوراس کی آڑ میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام پرورش پارہے ہیں۔انہوں نے سماج کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا ہے۔وہ سماج جہاں انسانی زندگی ترقی پذیرتو ہے لیکن اس کی حیثیت بس ایک ''حویلی'' کی سی ہے جوبوسیدہ ہوچکی ہے اورایک کھنڈر کے مانند ہے جہاں مہاجن اور امیروں کا بول بالا ہے،ان ہی کا راج چلتا ہے اوردوسری طرف کاشی کے برہمن اورکعبے کے فقیر ہیں جو مذہب کی آڑ میں عوام کولوٹ رہے ہیں ۔اس دنیا میں ہرطرف ایک ہی طرح کا نظام ہے جو عوام کا استحصال کررہا ہے ۔ ہرطرف سناٹا ہے،تاریکی ہے بس کچھ نظرآتا ہے تو وہ ہے اس بوسیدہ ''حویلی'' کا کھنڈرجس کا منظرنہایت ہولناک ہے اورجس کے مکینوں کا کچھ پتہ نہیں ۔نظم ''حویلی'' کے چند بند ملاحظہ ہوں ۔

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مردوں سے خراج

اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام ودر
جس طرف دیکھو اندھیرا جس طرف دیکھو کھنڈر

مار وکژدم کے ٹھکانے جس کی دیواروں کے چاک
اف یہ رخنے کس قدر تاریک کتنے ہولناک

جن میں رہتے ہیں مہاجن ،جن میں بستے ہیں امیر
جن میں کاشی کے برہمن ، جن میں کعبے کے فقیر

مخدوم نے جو بوسیدہ حویلی کی منظرکشی کی ہے اوراس کے پس پردہ جن مزاحمتی واحتجاجی رویوں کوپیش کیاہے وہ قابل صدتحسین ہے۔انہوں نے بظاہرمذہب پرکھلے عام چوٹ کی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیاکے جنرل سکریٹری سی راجیشورراؤ ''ہمارامحبوب مخدوم'' کےعنوان سے لکھتے ہیں:

> '' 1942 میں مجھے پہلی مرتبہ مخدوم سے ملاقات کاموقع ملااور میں نے اس کی انقلابی نظمیں بھی سنیں۔ان نظموں اورخاص طورپر ''حویلی'' نے مجھے بے حدمتاثرکیاجس میں اس نے گرتے ڈھلتے جاگیردارانہ سماج پرگہراطنزکیاہے۔'' [ا]

مخدوم نے رومان سے انقلاب اوربغاوت کی دنیامیں قدم رکھایعنی مخدوم کاشعری سفر رومان سے انقلاب تک کاہے۔ان کی شعری کائنات کاخاصہ حصہ آزادی،بغاوت،احتجاج کابیان ہےلیکن بہت سے حصے رومانی اثرات سے عاری ہیں۔ان کی نظمیں خواہ رومانی ہوں،انقلابی ہوں، باغی ہوں یااحتجاجی نوعیت کی ہوں سب پرنہیں تو بیشتر حصوں پررومان کی جھلک ضروردکھائی دیتی ہے۔بعض دفعہ نظم کےعنوانات بھی ان کے رومانی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں۔''زلف چلیپا'' ایک ایسی ہی نظم ہے۔یہ نظم سرمایہ داری نظام کے لیےانتباہ ہے جواپنی بربادی کی داستان خوداپنے ہاتھوں سے رقم کررہاہے۔پوری نظم طنز،احتجاج اورباغی لب ولہجے کے باوجودباغیانہ اورمزاحمتی لے کی شدت سے محروم ہے اوروہ ہی مخدوم کااصل سرمایہ ہے۔مخدوم نے زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ بیشتراوقات غم وغصہ اوریاس وناامیدی قریب آنےنہیں پاتے۔مخدوم فطرتاًرومانی اورعملاًباغی شاعرہیں جن کی شاعری میں یہ دونوں جذبے روح اورحیات کی طرح آپس میں گڈمڈہیں۔مثال کےبطورذیل اشعارملاحظہ کیجئے ؎

زرگری کا رقص ہے سود وزیاں کا رقص ہے
ہر گلی کوچے میں مرگ ناگہاں کا رقص ہے

ا (نیاآدم۔مخدوم محی الدین نمبر،جلد9، جنوری1970، حیدرآباد،ص:8)

اب کسی سینے میں روح شادماں گاتی نہیں
زندگی کی اب کہیں ہلچل نظر آتی نہیں

برہمی زلف چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی
برہمی دیکھی تھی ، ایسی برہمی دیکھی نہ تھی

پی اور اپنے ہاتھ سے پی، لے کے سرمائے کانام
موت کا لبریز ساغر، عصر حاضر کے غلام

عزم آزادی سلامت ، زندگی پائندہ باد
سرخ پرچم اور اونچا ہو ، بغاوت زندہ باد

مخدوم کے اس رومانی اور انقلابی رویے کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر سلمان اطہر جاوید اپنے مضمون ''مخدوم ۔رومان اور انقلاب کا امتزاج'' میں رقم طراز ہیں:

''مخدوم کی شاعری میں انقلابی فکر ضرور ہے لیکن اسی کے ساتھ رومانیت کی شگفتگی بھی جلوہ آرا ہے۔ اس انقلاب اور رومان میں کچھ ایسے حسن واہتمام سے اورفطری طور پر ہم آہنگی ہے کہ یہ کہنا درست ہوگا کہ مخدوم کی شاعری رومانی انقلابی یاانقلابی رومانی ہے۔'' [1]

ظلم وزیادتی، سماجی نابرابری، مزدوروں کا استحصال، سرمایہ کی غلط تقسیم جیسے وجوہات اشتراکیت کی بنیاد پر ٹھہرے تھے۔ ادیب جوکہ طبعاً اورفطرتاً ترقی پسند ہوتا ہے اور معاشرے کا حساس ترین فرد بھی وہ بھلا اس طرح کی بے جا زیادتیوں پرخاموش لبی کا ظہار کیوں کر کرے، لہٰذا سماج میں نابرابری اور ظلم واستحصال کے خلاف ایک جماعت بغاوت پر آمادہ ہوگئی، احتجاج کی صورت دن بہ دن شدید سے شدید تر ہوتی گئی۔ شعرا ہنگامی نظموں کے ذریعہ قوم کو بیدار کرنے اور حقوق کے مطالبے پر اکسانے لگے، بغاوت کا جذبہ عام ہندوستانیوں کے دلوں میں سراٹھانے لگا۔ زندگی کو حیات بخشنے والے نغمے جو اسیری میں آہ وفغاں کی تاب جنبش نہ رکھتے تھے، جن کے مقدر میں اندھیرے کے سیاہی کے سوا

---

[1] (تنقیدی شعور، ڈاکٹر سلمان اطہر جاوید، جنوری 1971، نیشنل بک ڈپو حیدر آباد، ص:76)

اور کوئی وراثت نہ تھی، جس قفس کے آہنی دیواروں سے سورج بھی ٹکرا کر دبے پاؤں رخصت ہو جاتا تھا جن کے مکینوں کے لیے زندگی موت سے بدصورت کوئی شئے نہیں جو بطور سزا انہیں عطا کی ہوئی تھی ۔ یہ تحریک ان گنت ناداروں، مجبوروں اور مظلوموں کے حق میں نغمہ آزادی تھی، اسیروں کے لیے پروانۂ آزادی۔

مخدوم کے پاس انسپریشن کی کمی نہیں ہے اگر چہ وہ رومان اور انقلاب کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں اس لیے ان کی انقلابی شاعری بھی رومانیت کے اثر سے خالی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری رومان اور انقلاب کی خوبصورت امتزاج ہے۔ مخدوم ہمیشہ سے انقلاب کے خواہاں تھے وہ پرانے نظام کو درہم برہم کر دینا چاہتے تھے اور اس کی جگہ نیا نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس کے لیے انقلاب کی ضرورت تھی لیکن یہ انقلاب کوئی عام انقلاب نہیں تھا مخدوم نے اسے محبوب کے حسین ترین پیکر میں ڈھالنے کی کوشش وسعی کی ہے جو بہت حد تک کامیاب بھی ہوئی۔ لیکن انقلاب کا ایسا رومانی تصور دوسرے شعرا کے یہاں مشکل سے ملتا ہے۔ وہ ایسے انقلاب کی بات کرتے ہیں جس کا انتظار سبھی کو بڑی شدت سے ہے۔ زمین وآسمان اس انقلاب کے لیے بے قرار ہیں اور سرراہ گزرنے والوں کا ہجوم اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب ان سے اور انتظار نہیں ہو رہا ہے ؎

اے جان نغمۂ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سرے رہ گزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

اس نظم کا سارا انسپریشن صرف ایک مصرع ''گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے'' میں ڈھل گیا ہے۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

''وہ انقلاب کا انتظار بھی اس طرح کرتا ہے جیسے کوئی کسی خوش جمال محبوب کا انتظار کرتا ہے۔''[1]

امیر عارفی کو دئے گئے انٹرویو میں نظم انقلاب کے متعلق مخدوم اظہار خیال کرتے ہیں:

---

[1] (اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، 2007۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ ص 141)

''اس نظم میں گو انقلاب کو دعوت دی جارہی ہے لیکن اس میں
رومانیت اور جمالیاتی عنصر زیادہ پیدا ہوگیا ہے جن کو آپ Lyrical
بھی کہہ سکتے ہیں۔'' [۱]

نظم ''اندھیرا'' جو مخدوم کے مجموعے ''سرخ سویرا'' کے آخری چند نظموں میں ہے اس میں غلامی، افلاس، مجبوری، مایوسی اور کرب گرفتاری وقید کو بہت شدت سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔اس نظم کی ساخت بھی عام نظموں سے جداگانہ ہے اس کے ابتدائی چھ مصرعے پابند نظم کی پاسداری کرتے ہیں جبکہ بقیہ نظم آزاد نظم کی صورت صفحۂ قرطاس پر درج ہے۔مختصراً نظم ملاحظہ کیجئے ؎

اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
''وہ تہذیب کے زخم''
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑختے ہوئے سر
میتیں ہات کٹی پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے اس پار تلک
سرد ہوا
نوحۂ ونالۂ وفریاد کناں
شب کے سناٹے میں رونے کی صدا
کبھی بچوں کی کبھی ماؤں کی
چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا

۱(مخدوم محی الدین سے ایک انٹرویو، امیر عارفی مشمولہ کتاب، لکھنؤ، مارچ 1966، ص 10)

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

مخدوم کی یہ نظم ان کی شاعرانہ انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے۔اس میں چمکتے ہوئے تاروں اور دمکتے ہوئے چاندکو رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری کہا ہے کیونکہ ان کو یہ اجالا بھیک میں ملا ہے اور یہ ''ملبوس عروسی'' ان کا کفن ہے ایسے اندھیرے میں مرتے ہوئے جسموں کی کراہ،عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ بن جاتی ہے اور یہ تہذیب کے زخم ہیں۔اس نظم میں جو منظرکشی کی گئی ہے بے حد اثرانگیز ہے۔اس نظم سے متعلق زبیر رضوی اپنے مضمون ''مخدوم کی نظم'' میں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''مخدوم نے نظم ''اندھیرا'' میں جو جنگ کے خلاف اٹلی اور جرمنی کی سرزمین سے اٹھنے والے فاشزم کے طوفان کی ایک طاقت ور مزاحمت کا درجہ رکھتی ہے اپنے اس نظمیہ ڈکشن کی بنیاد رکھ دی تھی جس کی آبیاری انہوں نے ''گل تر'' کی نظمیں لکھ کر کی۔''اندھیرا'' نظم اپنے آہنگ اوراثر میں بڑی دیرپا ہے اس طرز کی نظم اوپر مذکورہ کسی شعری مجموعے میں نظر نہیں آتی۔'' [۱]

آزاد نظم نگاری کی دنیا میں اس نظم کی اپنی ایک حیثیت ہے۔مخدوم نے دوسری جنگ عظیم کی پوری تباہ کاریوں کا نقشہ کھینچ کررکھ دیا ہے۔ان کی دوسری نظموں میں جس طرح ''اسٹالن'' جمبول جابر کی نظم کا ترجمہ ہے اسی طرح ''اندھیرا'' فرانسیسی مصور پکاسو کی تصویر ''گورینکا'' کا ترجمہ ہے۔ایسا لگتا ہے کہ پکاسو کی تصویر کو مخدوم نے نظم کیا ہے۔اصل میں دونوں ایک ہی موضوع سے تعلق رکھتی ہیں،دونوں نے فاشزم کی تباہ کاریوں کو پوری شدت سے محسوس کیا ہے اور پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے اوراس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔مخدوم نے اس تصویر کو گویا زبان بخشی ہے۔آخری شعر میں تو کتنے حسین استعارے پیش کئے ہیں۔رات اور آزردہ ستاروں کا ہجوم کتنے خوبصورت استعارے ہیں پھر خورشید درخشاں جو کہ انقلاب کی علامت ہے۔صرف یہ شعر پوری نظم کا بدل قرار دیا جاسکتا ہے۔اس نظم سے متعلق ڈاکٹر فیروز کا خیال ہے:

---

۱ (ذہن جدید، مخدوم محی الدین نمبر، جلد 17، شمارہ 49، ستمبر تا نومبر 2007، نئی دہلی، ص 93)

’’یہ نظم تلخی ہیجان اور کرب کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے .....یہ
اندھیرا غلامی کا اندھیرا ہے۔افلاس کا اندھیرا ہے۔لاعلاج امراض میں
گرفتار مایوس مریضوں کی زندگی کا اندھیرا ہے اوراس سب کو بیان
کرنے میں مخدوم کا لہجہ انتہائی تلخ اور کرخت ہوگیا ہے۔‘‘ ؎[1]

مخدوم کی ایک نظم جن کا عنوان ’’جنگ آزادی‘‘ ہے اپنے زمانے کی بے حد مقبول اور مشہور نظم ہے اس نے مخدوم کو شہرت اور مقبولیت کی اعلیٰ منزلوں پر پہنچا دیا۔اس نظم کی زبان اتنی سادہ اور انداز اتنا دلکش ہے کہ اپنے زمانے میں یہ خواص وعام کی زبان پر تھی اور آج بھی بہت پسند کی جانے والی نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخدوم نے دہقانوں اور مزدوروں ہندوستانیوں اور آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے لیے ایک ترانہ بنادیا ہے جس میں ہر جگہ یکجہتی نظر آ رہی ہے۔اس نظم کا کینوس نہایت وسیع ہے اوراس کا ماخذ قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔سب مل کر ایک ہی مقصد کے لیے آواز بلند کر رہے ہیں ؎

یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی

نظم کے پہلے بند میں محض ایک اپیل ہے لیکن دوسرے بند میں یہ اپیل آفاقیت میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔سب سے پہلے وہ ہندوستانیوں کو خطاب کرتے ہیں کہ یہ ان کی جنگ ہے پھر محکوموں اور مجبوروں سے بھی کہہ رہے ہیں ، پھر آزادی کے خواہاں کو بھی شامل کرلیا ہے اوراپنے محبوبوں ، دل نشینوں مثلاً دہقانوں اور مزدوروں سے بھی مخاطب ہیں۔اس طرح سے یہ نظم خواص کے ساتھ عوام میں بھی بے حد مشہور ہوگئی۔مخدوم کو صرف اپنے ہندوستانیوں کی ہی فکر نہیں بلکہ وہ سارے جہان کے لیے فکر مند ہیں۔نظم جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی ہے روانی ، جوش وولولہ، تیزی اور بلند آہنگی اپنے شباب پر پہنچ جاتی ہے۔چنانچہ پورے سنسار کے لیے کہتے ہیں ؎

---

[1] (کلیات مخدوم۔مرتب فاروق ارگلی۔ 2011 ۔فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمٹیڈ نئی دہلی۔ص:33)

سارا سنسار ہمارا ہے　　پورب پچھّم اتر دکھن
ہم افرنگی ، ہم امریکی　　ہم چینی جاں بازان وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن　　آہن پیکر فولاد بدن

یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

اس نظم میں محض الفاظ اور آواز کے بنا پر ہی جوش وولولہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے جو اس نظم کی اہمیت کو دوبالا کر دیتی ہے وہ ہے اس کا صوتی آہنگ اور جس کے چلتے جب سب ایک ساتھ ایک آواز اور ایک لئے میں یہ نظم پڑھتے ہیں تو ماحول اور زیادہ گرم ہو جاتا ہے۔ پروفیسر ظہیر علی اپنے مضمون ''مخدوم کی نظمیں'' میں اس نظم سے متعلق فرماتے ہیں:

''جنگ آزادی'' ایک رجز ہے اور اس میں براہ راست عوام کے دلوں کو گرمایا جارہا ہے، جوش دلایا جارہا ہے اور ان کا حوصلہ بڑھایا جا رہا ہے۔ یہ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر لطف اندوز ہونے کی چیز نہیں۔ رجز کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ اس میں شاعر اور عوام ایک دوسرے کی آواز میں آواز ملا کر انقلابیوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتے ہیں..... اکثر دفعہ مصرعوں کی تکرار سے ایک تند اور تیز صوتی آہنگ جنم لیتا ہے اور جب اسے عوام الناس اجتماعی طور پر گاتے ہیں تو ان کا خون جوش مارتا ہے اور دلوں میں ظالم اور جابر طاقتوں سے لوہا لینے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ ''جنگ آزادی'' رجز کے تمام تقاضوں اور مطالبوں پر کھری اترتی ہے اور اسی لیے اس رجز کو ہندوستان گیر مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔'' [1]

مخدوم نے جب انقلابی نظمیں کہنی شروع کی تھیں تو ابتدا میں ان کی آواز تھوڑا دبی دبی تھی اور لہجہ بھی مدھم تھا اور ان نظموں میں انقلابی آہنگ کم اور رومانیت کا اثر زیادہ ہوتا تھا لیکن جب وہ انقلابی تحریک سے وابستہ ہوگئے تو ان کی شاعری ایک نئے لب ولہجہ سے ہم آہنگ ہوئی۔ اس سے

---

[1] (مخدوم کی نظمیں۔ پروفیسر ظہیر علی مشمولہ۔ نوائے ادب مخدوم محی الدین نمبر۔ جنوری تا مارچ۔ 2004

پہلے وہ قنوطیت کے شکار تھے، ان کی آواز پھنسی پھنسی تھی لیکن بعد میں وہ براہ راست جذبات کا اظہار کرنے لگے۔ اس دوران انہوں نے کئی نظمیں تخلیق کی۔ نظم ''استالن'' اسی دور کی نظموں میں سے ہے حالانکہ یہ نظم قزاقستان کے ایک بوڑھے تاتاری شاعر جمبول جابر کی نظم کا آزاد ترجمہ ہے لیکن یہ نظم طوفان کے مانند ہے جو برسوں سے مخدوم کے سینے میں کروٹ لے رہا تھا لیکن اسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس نظم کے ذریعہ انہیں اپنے ولولہ خیز جذبات کو ظاہر کرنے کا موقع مل گیا۔ جابر انقلاب روس سے پہلے کا انقلابی شاعر ہے، جس کا رنگ آج بھی قائم ہے۔ اس کی نظموں کے مجموعے کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس نظم میں مخدوم نے خود کو تماشائی بن کر میدان جنگ میں اترنے پر احتجاج کیا ہے اگر میدان جنگ میں محض ایک تماشائی بنے رہنے کے لئے جنگ میں حصہ لوں تو اس سے اچھا ہے کہ میں اس جنگ میں حصہ ہی نہ لوں۔ میں اس جنگ میں مجاہد کی حیثیت سے آیا ہوں اور میں اپنی جنت کو جہنم کے حوالے نہیں کر سکتا۔ یہاں میں سے مراد ہر وہ شخص ہے جو لڑنے کی طاقت رکھتا ہو خواہ وہ لڑائی میدان جنگ کی ہو یا سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف۔ ہر ایک کو وطن کی خاطر تلوار اٹھانا لازم وملزوم ہے ۔

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں
کیا مجاہد نہ بنوں ؟
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر
میرے پیارے مرے فردوس بدن کی خاطر

اس نظم کے بارے میں راج بہادر گوڑ کا خیال ہے۔:

''حبّ وطن کے پاکیزہ جذبے سے معمور یہ نظم اپنی شوکت لفظی کے لیے بھی مخدوم کو بہت عزیز تھی اور سننے والوں میں بہت مقبول ہوئی۔'' [1]

قحط بنگال کا موضوع اردو ادب کی تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ بہت سے شاعر اور ادیب نے اس سے متعلق ناول، افسانے تخلیق کیے ہیں ایسے میں بھلا شاعر کب پیچھے رہتے۔ چنانچہ مخدوم نے بھی

ا (ادبی جائزے، راج بہادر گوڑ، 1990، دنیا پبلی کیشنز دہلی، ص 97)

نظم ''بنگال''،تخلیق کی جواس جان لیوا قحط کے بارے میں ہے جواس وقت ہندوستان کے اس صوبے میں پھوٹ پڑا تھا۔مخدوم کی اس نظم میں ان عظیم بنگالی عوام کے المیے کا درد بھی ہے جنھوں نے ہندوستان کو بے شمار مفکر، شاعر، جنگ آزادی کے مجاہد دیے،اس نظم میں سبھی عوام کو کسی مذہب یا سیاسی جماعت سے تعلق کا خیال کیے بغیر متحد ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔شاعر کا خیال ہے کہ جب ہم متحد ہو جائیں گے تب کوئی ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا۔اب سیاسی رہنماؤں کو بھی متحد ہونے کی ضرورت ہے اوران سے متعلق پارٹی کو بھی بیدار کرنا ہوگا۔ہندوستان کے ہر گوشے گوشے میں زندگی کی لہر کو پہنچانا ہوگا۔اس خیال کا اظہار نظم میں پانچ بار دہرائے جانے والے چار مصرعوں میں کیا گیا ہے ۔

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگریس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

اسی طرح سے تلنگانہ کے دیہاتوں میں بھی بغاوت جنگ کے دوران ہی بھڑک اٹھی تھی۔ کسانوں سے حد سے زیادہ کم قیمت پر اناج کی جبری خرید آخری ضبط تھی اس کے بعد عوام کا صبر ٹوٹ گیا اور وہاں کسانوں کی انقلابی تحریک کا آغاز ہوگیا۔مخدوم اس میں پیش پیش رہے لیکن بعد میں انہیں روپوش ہونا پڑا۔انہوں نے اس موضوع کو بھی نظم ''تلنگانہ'' کے عنوان سے صفحہ قرطاس کے سپرد کیا۔نظم کی گونج سارے تلنگانہ اور بعد میں سارے ہندوستان میں عرصے تک سنائی دیتی رہی۔مخدوم کی ایسی کئی نظمیں ہیں اس نوعیت کی ہیں۔ جو کافی وقت گزر جانے کے بعد بھی عوام کی زبان پر تھیں ان میں ''قید''،''چپ نہ رہو''،''وادی فردا''،''فریاد''،''وقت بے درد مسیحا''، ''دھواں'' وغیرہ ہیں جن میں ان کے مزاحمتی اوراحتجاجی رویے جابجا نظر آتے ہیں،کبھی وہ قید خانے کی چہار دیواری میں قید رہ کر بھی عوام کے دکھ درد کو سمجھتے ہیں تو کبھی مزدوروں اور کسانوں کے لیے علم بغاوت بلند کرتے ہیں اور ایک نئے نظام کو لانے کے خواہش مند ہیں۔

ایسی ہی دیگر نظموں میں ''چاند تاروں کا بن''ایک بہترین نظم ہے جو 1958 میں تخلیق کی

گئی۔آزادی سے بعد اورآگے لکھ کر انہوں نے اشارہ کر دیا کہ نظم تین حصوں پر مشتمل ہے۔نظم جہد آزادی کی داستان ہے جس کے لیے شہیدوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔صرف ایک امید پر کہ آزادی ان کے ملک کے مستقبل کو ایک نیا سورج عطا کرے گی جس سے ملک کا ذرہ ذرہ روشنی سے نہا جائے گا ۔

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے

لیکن جب مقصود حاصل ہوگیا تو آزادی کے متوالے غازیوں کے تمام ارمان آن کی آن میں چکنا چور ہو گئے ۔سارے خواب ٹوٹ کر بکھر گئے ۔فسادات نے کھل کر ننگا ناچ کیا،خون کی ہولی کھیلی گئی ،عصمت ملبوس چادریں تارتار ہوگئیں ۔سیاستدانوں کے' زہریلے بول بچن' نے ایسی اتحاد و اتفاق اورمحبت واخوت کوخونی پیکر میں تبدیل کرڈالا ۔مکان کے ساتھ مکین بھی سفا کی سے نذر آتش کرڈالے گئے ۔اماماں صد فکروفن کے سینوں کے کالے دھوئیں نے پوری نورسحرکوتاریکی سے نہلا دیا۔ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

صبح دم ایک دیوارِغم بن گئے
خارزارالم بن گئے
رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو
جوئے خوں بن گیا
کچھ اماماں صدمکر وفن
ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمیں گاہ سے

پھینک کر اپنی نوک زباں
خون نورِ سحر پی گئے

شاعر مخدوم کے لیے یہ آزادی نہیں تھی بلکہ فریب آزادی تھا۔ مکمل سحر نمودار نہیں ہوئی تھی بلکہ رات کی تلچھٹ ابھی برقرار تھی۔ یہ وہ سحر نہیں تھی جس کا قوم کے ہر بندے نے خواب دیکھا تھا۔ فیض کے لفظوں میں یہ شب گزیدہ سحر تھی۔ یہ داغ داغ اجالا تھا ؎

یہ داغ داغ اجلا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اور نظم کے آخر میں ؎

ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

ایسی ہی امید مخدوم کی مذکورہ نظم میں دکھائی پڑتی ہے۔ وہ دوستوں کو آواز دیتے ہیں کہ منزل مقصود تک ابھی رسائی نہیں ہوئی ہے لہٰذا ابھی ضرورت ہے اس آخری بت کو گرانے کی جو راہ آزادی میں حائل ہے۔ شاعر اپنے ہمدموں کو آواز دیتے ہوئے کہتا ہے ؎

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ، اجالا بھی ہے
ہمدمو!
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھاتے چلو

مخدوم کی رومانی شاعری روایتی انداز سے یکسر مختلف ہے، یہاں ہجر کا کرب، گریہ وزاری، معشوق کی ستم ظریفی، دلفریبی، ناز وادا، دل کشی اور دل آویزی سے اترانا محسوس ہوتا ہے۔ان کی شاعری کی علامتیں، آہنگ، حسن کاری اس قدر طمانیت بخش ہے کہ گناہ کا احساس بھی نہیں ہونے پاتا۔ایسے شاعر نے جب ایک نئی راہ کا انتخاب کیا اور جداگانہ موضوعات پر طبع آزمائی تو ایسے ایسے عنوانات قائم کیے جس سے ایک نیا احساس بیدار ہوتا ہے جو ہلکی ہلکی اوس کی مانند دلوں پر برس رہی ہو اور جو کبھی کبھی ہمارے جذبات کو برانگیختہ بھی کر دیتی ہے۔

ابن آدم کو سولی چڑھاتے رہو
زندگانی سردار گاتی رہے
یاد یاراں میں اک جام غم اور دو
رات کی تیرگی سوز گاتی رہے

علی سردار جعفری

مختصر سوانح عمری:

علی سردار جعفری کی پیدائش قصبہ بلرامپور کے زمیندار گھرانے میں ہوئی۔ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ان کی بہن ستارہ جعفری اپنے مضمون ''سردار بھائی'' میں لکھتی ہیں:

> ''پانچ بہنوں اور ایک بھائی کے بعد 26 بقرعید بمطابق 26 نومبر 1913 کو بلرامپور میں پیدا ہوئے۔'' [۱]

دوسری جانب سردار جعفری کے دوستوں کی بات مانی جائے تو ان کی پیدائش 29 نومبر 1913 ہے۔ان کے دوستوں سے دریافت کرنے پر سردار جعفری نے یہی تاریخ بتائی تھی۔ان کے ایک دوست ایوب واقف اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ''ان کا سنہ پیدائش 29 نومبر 1913 ہے۔'' [۲]

سردار جعفری اپنے گھر میں سب سے زیادہ ذہین اور حاضر جواب تھے اس لیے گھر کے سبھی افراد ان کو بے حد پیار کرتے تھے۔لیکن شروع سے ہی ان کا مزاج باغیانہ قسم کا تھا۔ان کے والدین نے انہیں محض سات یا آٹھ سال کی عمر میں مذہبی تعلیم دینے کے لیے ''سلطان المدارس'' (لکھنؤ) بھیج دیا لیکن انہیں مدرسے کا تنگ اور سختی سے پر ماحول پسند نہیں آیا اس لیے وہ وہاں پر نہ رہے۔ان کو انگریزی تعلیم سے دلچسپی تھی اس لیے ان کے والدین نے نہ چاہتے ہوئے بھی سردار جعفری کے لیے انگریزی تعلیم کا انتظام کیا۔جب وہ چوتھی جماعت کے قابل ہوئے تو ان کا داخلہ بلرامپور کے انگریزی اسکول ''لائل کالجیٹ اسکول'' میں کرا دیا گیا،لیکن سردار کا ذہن تخلیقی تھا شاعری سے تو انہیں بے پناہ دلچسپی تھی۔چونکہ بلرامپور میں مرثیہ کا ماحول تھا جس کے زیر اثر سردار بھی مرثیہ گوئی کی جانب مائل ہوئے۔وہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے اس طرح ان کی ادبی زندگی کی آغاز ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے ابتدائی طالب علمی کے زمانے میں ہو گیا تھا۔اپنی کتاب ''لکھنؤ کی

۱(علی سردار جعفری اپنی بہنوں کی نظر میں۔مرتبہ کالی داس گپتا رضا1990۔ساکار پبلشرز پرائیوٹ لمیٹڈ بمبئی۔ص16)

پانچ راتیں'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کلمہ اور تکبیر کے بعد شاید میرے کانوں نے پہلی آواز انیس کی سنی ہے۔ میں شاید پانچ چھ برس کی عمر سے ممبر پر بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھنے لگا تھا، سلام اور مرثیے کے علاوہ ویسے بھی مجھے بے شمار اشعار یاد تھے۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ میں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کر دیے تھے۔''[1]

اس طرح سے امام حسین کی حق پرست اور دلیر شخصیت ان کے دل میں جگہ بنا چکی تھی اور اس سے متاثر ہو کر انہوں نے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور صداقت کے لیے جان کی بازی لگانے کا سبق حاصل کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اقبال کا مطالعہ کیا جس کے زیر اثر زندگی، سلطنت، سرمایہ و محنت پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی صلاحیت آ گئی۔ اقبال کی طرح ان کی شاعری بھی بلند آہنگی کے ساتھ انقلابی رویہ اختیار کر رہی تھی۔ اقبال کے مطالعے سے ہی انسانی عظمت، ظلم کے خلاف احتجاج، مزدوروں کی حمایت، کسانوں کی پریشانیاں، مساوات کی نابرابر تقسیم جیسے موضوعات پر سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئے۔

سردار جعفری نے جب تخلیقی دینا میں قدم رکھا تو سیاسی سطح پر آزادی کی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں۔ انقلاب کے نعرے فضاؤں میں گونج رہے تھے۔ جنگ عظیم کی تباہ کاریوں نے دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ انقلاب روس کے واقعہ نے بھی ایک سنسنی پھیلا دی تھی۔ ان سبھی موضوعات پر دنیا کے تمام صاحبان قلم نے آواز اٹھائی اور نئے ادبی رجحانات پیدا کیے۔ دوسری جنگ عظیم کے بادل عالمی فضاؤں میں منڈلانے لگے۔ اس وقت جب سردار جعفری نے قلم اٹھایا تو ایسے میں ان کے پاس ڈھیر سارا مواد تھا۔ بے شمار سماجی اور سیاسی مسائل تھے جو کسی صاحب قلم کے منتظر تھے۔ سردار جعفری بہت جلدی افسانے بھی لکھنے لگے۔ ان کی بہن ستارہ جعفری نے اس زمانے کے ان کے چار ابتدائی افسانوں، بالترتیب، آتش قمیص، لالۂ صحرائی، ہجوم و تنہائی اور تین پاؤ گندھا ہوا آٹا، کا ذکر کیا ہے۔ اس میں آخری افسانے میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا عنصر شامل ہے۔ یہ افسانے

---

[1] (لکھنؤ کی پانچ راتیں، سردار جعفری، 2013 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ص: 20)

ہفتہ وار اخبار ''ہم صفیر'' میں شائع ہوئے جوان کے بھائی نے کانپور سے لوٹنے کے بعد نکالنا شروع کیا۔ ''ہم صفیر'' کے نکلتے ہی تبادلے میں نیرنگ خیال، ساقی اور دوسرے بہت سے اردو رسائل گھر میں آنے لگے جنہوں نے سردار جعفری کی ادبی، سماجی اور سیاسی افکار کی دنیا کو اور بھی وسیع کر دیا۔ اگر چہ انہوں نے افسانے بھی لکھے لیکن شاعری کو کبھی ترک نہیں کیا، ابھی وہ شاعر اور خاص طور پر مرثیوں کے لیے جانے جاتے تھے۔ان کے عہد نے ان کے ذہن کو بغاوت کی طرف مائل کرنا شروع کر دیا تھا۔ایک بار وہ قصیدہ پڑھنے گئے تھے اور عین موقع پر وہ قصیدے کی محفل سے غائب ہو گئے اور جواہر لال نہرو کے ایک جلسے میں شریک ہو کر انگریزوں کے خلاف تقریر کی۔اس کے علاوہ اب وہ مزدوروں اور کسانوں پر ہو رہے ظلم واستبداد سے بھی کافی غمزدہ تھے۔ان کے یہاں ایک مولوی صاحب روز ان کو پیغمبروں کی کہانیاں سناتے تھے جس کے باعث سردار کے دل میں صداقت کے لیے جان قربان کرنے کا جذبہ بیدار ہو گیا۔اس زمانے میں سردار نے دو کتابیں ُمہاتما گاندھی کی ''تلاش حق'' اور پلوٹارک کی کتاب ''مشاہیر یونان وروما'' پڑھی جس کے ذریعہ ان کی زندگی میں مزید تبدیلی آ گئی۔

سردار نے 1933 میں میٹرک کا امتحان پاس کر لیا اور اسی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا۔ چنانچہ علی گڑھ پہنچتے ہی سردار جعفری نے لائبریری سے استفادہ کرنا شروع کر دیا۔رفتہ رفتہ ان کی ملاقات کا دائرہ بڑھ رہا تھا۔سبط حسن، اختر حسین رائے پوری، حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، شکیل بدایونی، مجاز، جاں نثار اختر، عصمت چغتائی اور آل احمد سرور جیسے طالب علموں سے ان کے رابطے ہوئے ۔ان عزیزوں سے تبادلۂ خیال کا انہیں موقع ملا جو اس وقت اپنی تخلیقات کے ذریعے لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کر رہے تھے۔سردار ان سے کافی متاثر ہوئے۔ ان کے علاوہ خواجہ منظور حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر رشید جہاں اور ڈاکٹر محمد اشرف جیسے اساتذہ کی سرپرستی بھی حاصل ہوئی، جن کی صحبت سے کافی فیضیاب ہوئے اور ان کا ذوق ادب اور بھی نکھر گیا۔ وقت اور حالات کے مدنظر سردار جعفری بہت جلد ان ادباء اور شعراء کے ہم مزاج بن گئے۔ اب وہ اپنی تحریروں میں سیاسی، سماجی اور اخلاقی معاملات کو جگہ دینے لگے۔اسی دوران انہوں نے لینن کی سوانح عمری پڑھی جس کے زیر اثر ان

کے انقلابی جذبات کو مذید تقویت بخشی۔یہی وجہ ہے کہ اب سردار جعفری انگریزی حکومت کے ظلم و جبر کے خلاف کھل کر بولنے لگے تھے اور مزدوروں اور کسانوں کے حق کے لیے آواز بلند کرنے لگے تھے۔

1936 کے ابتدائی زمانے میں ترقی پسند تحریک کی سرگرمیاں تیز ہوگئی تھیں۔سجاد ظہیر اپنی بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر کے ہندوستان لوٹ آئے تھے۔ہندوستان کی تحریک آزادی بھی اپنے شباب پر تھی۔فضا میں ہر طرف انقلاب زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے۔جنگ عظیم کی تباہ کاریوں نے دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔انقلاب روس کے واقعہ نے بھی ایک سنسنی پھیلا دی تھی۔ان سبھی موضوعات پر دنیا کے تمام صاحبان قلم نے آواز اٹھائی اور نئے ادبی رجحانات پیدا کئے۔دوسری جنگ عظیم کے بادل عالمی فضاؤں میں منڈلانے لگے۔اس وقت جب سردار جعفری نے قلم اٹھایا تو ایسے میں ان کے پاس ڈھیر سارے مسائل تھے۔بے شمار سماجی اور سیاسی مسائل جو کسی صاحب قلم کے منتظر تھے۔ اسی زمانے میں علی گڑھ میں ترقی پاسند مصنفین کا پہلا جلسہ خواجہ منظور حسین کے مکامن پر منعقد ہوا۔ اس میں سردار جعفری نے ''جدید اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات'' کے عنوان سے اپنا پہلا تنقیدی مضمون پڑھا جو علی گڑھ میگزین کے تیسرے شمارے 1936 میں شائع ہوا۔

سردار جعفری ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ایک شاعر کی حیثیت سے تو انہوں نے اردو ادب میں اپنا خاص مقام بنالیا تھا علاوہ ازیں افسانے ڈرامے،مضامین اور صحافت کے میدان میں بھی کامیاب رہے۔جب وہ علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے تو انہوں نے بہت سے افسانے، ڈرامے اور مضامین لکھے جو علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا کرتے تھے۔

سردار جعفری کو صحافت کا پہلا تجربہ اپنے گھر سے ملا۔ان کے بڑے بھائی کانپور سے اپنی پڑھائی مکمل کر کے گھر لوٹے تو انہوں نے بلرامپور سے ''ہم صفیر'' نام کا ہفتہ وار نکالنا شروع کیا۔اس میں سردار جعفری کے افسانہ شائع ہوتے تھے۔''ہم صفیر'' کے نکلتے ہی تبادلے میں نیرنگ خیال اور ساقی اور بھی دوسرے بہت سے اردو رسائل گھر میں آنے لگے جنہوں نے سردار جعفری کی ادبی، سماجی اور سیاسی افکار کی دنیا کو اور بھی زیادہ وسیع کر دیا۔ان کی انقلابی تحریر کے ساتھ شعلہ بیان تقریر نے بھی خاص دھوم مچا رکھی تھی۔طالب علمی کے زمانے میں ہی انہوں نے علی گڑھ میں ایک دن

ہڑتال کے دوران رات کے بارہ بجے برطانوی حکومت کے خلاف زبردست تقریر کی جس کے نتیجے میں وائس چانسلر نے انہیں یونیورسٹی سے نکال دیااس کے بعد وہ اسی سال اینگلو عرکالج (دہلی) میں داخل ہوئے جہاں سے انہوں نے 1938 میں بی۔اے کی تعلیم مکمل کی۔اس دوران انہوں نے افسانے،ڈرامے،انشائیے اورتنقیدی مضامین بھی لکھیں جو کالج کے ترجمان ''عربک کالج میگزین'' میں شائع ہوئے۔اردو کے علاوہ انہوں نے انگریزی میں بھی مضامین لکھے۔وہ کالج کے تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔

علی گڑھ یونیورسٹی سے نکالے جانے کے بعدسردارجعفری لکھنؤ پہنچے تو وہاں انہیں ایک صحت مند ادبی فضا میسر آئی اورایک اعلیٰ ادبی حلقہ نصیب ہوا۔یہ عہدترقی پسندتحریک کا انتہائی پر جوش دور تھا۔اس وقت لکھنؤ میں نہ صرف ایک باغیانہ ادبی فضا قائم تھی بلکہ ایک اچھی خاصی صحافتی فضا بھی موجود تھی۔اس وقت جوش ملیح آبادی کی ادارت میں کلیم ، جاری تھا اورانہیں کی سرپرستی میں تین نوجوان مجاز، سبط حسن اورسردارجعفری نے ایک ماہنامہ ''نیاادب'' 1939 میں جاری کیا جس میں جوش کارسالہ ''کلیم'' ضم ہوکر ''نیاادب اورکلیم'' ہوگیا۔انہوں نے ایک ہفت روزہ ''پرچم'' بھی لکھنؤ سے جاری کیا۔سردار جعفری کا یہ صحافتی دوران کے تخلیقی ادب کے آغاز کا بھی دورتھااوران کامطالعہ بھی اس وقت محدود نہ تھا۔''نیاادب'' کے پہلے پرچے میں سردارجعفری کا ایک مضمون ''ترقی پسند مصنفین کی تحریک'' کے عنوان سے شامل تھا اس میں انہوں نے سماجی،سیاسی وادبی رجحانات،نوجوانوں کے رجحانات نئی نسل کے مسائل اوراس کے پس منظر میں ابھرتی ہوئی ترقی پسندتحریک کا ذکر کیااورادب برائے زندگی کے حوالے سے اجتماعی ادب پرزوردیا۔سردارجعفری نے ایک سہ ماہی ادبی مجلّہ ''گفتگو'' جاری کیا جواچھا خاصاضخیم رسالہ تھا۔یہ رسالہ ادبی حلقوں میں بہت جلد مقبول ہوگیااوراس کا ''ترقی پسندنمبر'' توایک دستاویز کی حیثیت رکھتاہے۔اس کے ذریعے انہوں نے ترقی پسندتحریک کا بھرپور جائزہ پیش کیا۔سردار جعفری ماضی کے حمایتی تو تھے لیکن انہوں نے کبھی نئ تہذیب کی عظمت سے انکارنہیں کیا۔ماضی سے ہمیشہ استفادہ کر کے حال کوروشن کرنے اورمستقبل کو تابناک بنانے کافن ان میں جابجا موجود تھا۔اس طرح انہوں نے ماضی،حال اورمستقبل میں امتزاج پیدا کردیا۔اپنی مایۂ نازتصنیف ''ترقی پسندادب''

میں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''یہ تحریک اس اعتبار سے ماضی کی بہترین روایات کا تسلسل ہے کہ یہ
> انسان دوستی، عقل پسندی، حب الوطنی، سامراج دشمنی اور آزادی کے
> جذبے کو لے کر آگے بڑھتی لیکن اس اعتبار سے بالکل نئی تحریک ہے
> کہ اس نے عوام کی زندگی پر ادب اور فن کی بنیاد قائم کی۔'' [1]

اپنی انقلابی تحریر وتقریر کے باعث سردار جعفری کو کئی بار جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑی۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرر تھے اور جلسے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا فن بخوبی جانتے۔ باغیانہ لہجے اور دل میں آزادی کے جذبات کا خوبصورت امتزاج ان کی شخصیت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔لیکن اکثر و بیشتر معاملات میں ان کو اس کا نقصان بھی اٹھانا پڑتا تھا۔ظلم واستبداد کی مخالفت اور مظلوم کی حمایت میں وہ اس قدر جوش وولولے کے ساتھ تقریر کرتے تھے کہ ظلم کے خلاف اپنے غم وغصے کو روک نہیں پاتے تھے۔ اس طرح کے احتجاج میں ہمیشہ ہی پیش پیش رہتے تھے۔حکومت نے اس وقت اس طرح کے جلسوں پر پابندی لگا دی تھی لیکن انقلاب کے متوالے کہاں ماننے والے تھے ان پر تو بس دن رات یہی دھن سوار تھی کہ کیسے ملک کو برطانوی حکومت کے چنگل سے آزاد کرائیں۔سردار جعفری اسٹوڈنٹ یونین کے سکریٹری تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی میں مزاحمتی واحتجاجی جلسے میں سرگرم رہتے تھے انہیں وجوہات کے باعث ایک انگریز گورنر نے لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو یہ ہدایت دی کہ سردار جعفری اور دوسرے باغی طالب علموں کو یونیورسٹی سے نکال دیا جائے۔یکم دسمبر 1940 کو سردار جعفری گرفتار کر لیے گئے۔ یہ ان کی پہلی گرفتاری تھی۔ دوسرے دن یعنی 2 دسمبر 1940 کو انہیں لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا گیا۔ انہیں چھ مہینے کی سزا سنائی گئی۔لیکن ان کی یہ گرفتاری محض جسمانی تھی، تخیل اب بھی قید وگرفتاری سے باہر تھا،اس پر کوئی پابندی نہ تھی چنانچہ اپنی مشہور نظم ''پتھر کی دیوار'' رقم کی۔تقریباً چھ مہینے زنداں کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے بعد وہ رہا ہو کر بلرامپور گئے لیکن گورنمنٹ آف انڈیا کے آرڈر کے مطابق انہیں ایک سال تک بلرامپور میں ہی نظر بند رہنا ہوگا۔ان کے والد نے سرکاری اہل کاروں سے بات کی جس کے تحت معاملہ چھ مہینے کی نظر بندی پر طے ہوگیا۔

---

[1] (ترقی پسند ادب، سردار جعفری، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، 1957، ص:182)

نظر بندی کی مدت ختم ہوتے ہی سردار کو اپنی تعلیم کی فکر ہوئی۔ ہزار کوششوں کے باوجود بھی لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے فائنل کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہ مل سکی۔اب ان کو اپنے مستقبل کی فکر ہوئی پھر سجاد ظہیر اور پی۔سی۔جوشی نے انہیں کمیونسٹ پارٹی کے اخبار 'قومی جنگ' کے اردو ایڈیشن میں کام کرنے کا مشورہ دیا اس کے بعد وہ گھر والوں سے اجازت لے کر بمبئی چلے گئے۔بمبئی جانے کے بعد ان کا کینوس اور بھی وسیع ہو گیا اور انہیں بڑے بڑے شاعر و ادیب کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔یہاں سے ان کی زندگی نے دوسرا رخ لے لیا۔بمبئی میں ان کی ملاقات سلطانہ جعفری سے ہوئی حالانکہ وہ سلطانہ کو لکھنؤ یونیورسٹی سے ہی جانتے تھے اور پسند بھی کرتے تھے۔وہاں سردار جعفری کے والدین ان کی شادی کے لیے پریشان تھے۔انہوں نے سردار سے شادی کے متعلق بات کی،سردار نے سلطانہ کا نام پیش کر دیا۔شادی 30؍جنوری 1948 کو ہوئی،شام کا وقت تھا اور یہ خوبصورت تقریب بس ختم ہی ہونے والی تھی کہ گاندھی جی کے قتل کی خبر سے پورے ماحول میں افراتفری مچ گئی،خیر جیسے تیسے لوگ اپنے اپنے گھر پہنچے۔

سردار جعفری کی دوسری گرفتاری 1949 میں ہوئی۔سلطانہ جعفری حاملہ تھیں اور ان کے بڑے بیٹے ناظم جعفری کی پیدائش کا وقت قریب تھا۔سردار کی یہ گرفتاری بمبئی میں بھیمڑی کانفرنس منعقد کرانے کے جرم میں ہوئی تھی۔سردار کو تقریباً ڈیڑھ سال بعد رہائی ملی۔دوران قید سردار جعفری کا دوسرا مجموعہ ''خون کی لکیر'' بمبئی سے پہلی بار شائع ہوا۔اس کے بعد امن کا ستارہ،اور طویل نظم ''ایشیا جاگ اٹھا'' شائع ہوئے۔جو انہوں نے سینٹرل جیل ناسک میں تخلیق کی تھی۔یکے بعد دیگرے کئی شعری مجموعے اور نثری کتابیں شائع ہوئیں۔شعری مجموعوں میں ''پتھر کی دیوار'' (1953) ''ایک خواب اور'' (1965) ''پیرہن شرر'' (1966) ''لہو پکارتا ہے'' (1978) اور نثر میں ''ترقی پسند ادب'' (1951) ''لکھنؤ کی پانچ راتیں'' (1964) '' پیغمبران سخن'' (1970) ''اقبال شناسی'' (1976) ''ترقی پسند تحریک کی نصف صدی'' (1987) ''غالب کا سومنات خیال'' (1997) اور سرمایہ سخن (2001) جیسی کتابیں منظر عام پر آئیں۔

سردار جعفری کی ادبی خدمات کے لیے بہت سارے اعزازات سے نوازا گیا۔ان میں پدم شری 1967،سجاد ظہیر ایوارڈ لکھنؤ 1974،سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ،اتر پردیش اکیڈمی ایوارڈ 1977،

اقبال میڈل (پاکستان) 1978، ڈی لٹ (اعزازی سند) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، 1986 گیان پیٹھ ایوارڈ 1998 وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اب تک اردو کی ترقی اور ملک کے لیے دن رات فکرمند رہنے والے سردار جعفری کے اعصاب پر رفتہ رفتہ جمود طاری رہنے لگا تھا۔ انہیں اب کوئی بات یاد نہیں رہتی تھی اور وہ پہلے کی طرح گفتگو بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جون 2000 میں پتہ چلا کہ ان کے دماغ کے اگلے دونوں حصوں میں ٹیومر ہے۔ اوراسی کی باعث وہ بہت کم اور بہت دھیمی آواز میں گفتگو کرتے تھے۔ اس وقت کا منظر ڈاکٹر نریش کے الفاظ میں کچھ اس طرح ہے:

'' مرنے سے پہلے ہی خاموش ہوگئے تھے سردار جعفری۔ وہ آواز ڈوب گئی تھی جو کئی دہائیوں تک مشاعروں، سیمیناروں، کانفرنسوں، جلسوں، جلوسوں میں اپنی گھن گرج کے ساتھ گونجتی رہی تھی، وہ آواز جو کسانوں اور مزدوروں کو جگا کر ایک نئی صبح کی آمد کی امید بندھاتی رہی تھی، وہ آواز جو مارکسی نقطۂ نظر سے کہی گئی نظمیں سنا کر سامعین سے بھرپور داد حاصل کرتی رہی تھی۔'' [1]

آہستہ آہستہ ان کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ مرض جسم میں اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ بامبے اسپتال کے SPECIAL EXECUTIVE I.C.U میں وہ زندگی کی آخری سانس سے لڑتے رہے۔ اور یکم اگست 2000 کو راہی ملک عدم ہوگئے۔ پروفیسر سید محمد عقیل رضوی اپنے مضمون ''لو تم بھی آ گئے!!'' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

'' چلیئے اس دور کی اردو کی انقلابی شاعری کی آخری چنگاری بھی بجھ گئی۔ یکم اگست 2000 کو ممبئی میں اردو کے ایک عظیم شاعر علی سردار جعفری کا 87 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ترقی پسندی کی سب سے روشن مشعل بھی خاموش ہوگئی۔'' [2]

---

[1] (ڈاکٹر نریش، ایک چراغ اور بجھا، مشمول آج کل، علی سردار جعفری نمبر (دہلی) اکتوبر 2000، ص 27)

ابتدائی رومانی شاعری

دیگر ترقی پسند شعراء کی طرح سردار جعفری بھی اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں کافی حد تک رومان پسند تھے پھر وقت اور حالات کے ساتھ تبدیلی آئی۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستانی عوام اپنی جدو جہد اور کوششوں سے ملک کو برطانوی حکومت کے چنگل سے آزاد کرانے میں مشغول تھے۔ اس دوران ترقی پسند تحریک بھی اپنے شباب پر تھی اور سردار نے دونوں تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ملک آزاد ہو جانے پر بھی تقسیم ہند کے حادثے نے دونوں ملک کے عوام کو بے حد متاثر کیا۔ یہ وہ حالات ہیں جن کو سردار جعفری نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور نہ صرف دیکھا بلکہ اس کے کارکن بھی رہے اور کئی بار جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ اپنی تخلیقات میں ان حالات کی عکاسی بھی کی جن میں رومان اور انقلاب دونوں شیر و شکر ہیں۔ اکثر ترقی پسند شعرا اور ادبا نے کبھی بھی رومان اور انقلاب کو دو الگ الگ رخوں کے طور پر پیش نہیں کیا۔ بلکہ ان دونوں کو انہوں نے کچھ اس طرح ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا الگ تصور کر پانا مشکل ہے۔ رومان اور انقلاب کے اس حسین امتزاج کو پیش کرنے میں کم ہی لوگوں کو کامیابی حاصل ہوئی ہے، بیشتر ناکام رہے ہیں۔ فیض، مجاز، مخدوم وغیرہ کو اس میں مہارت حاصل ہوئی اور ان سب سے بڑھ کر سردار جعفری ہیں جن کی پوری شاعری مزاحمت واحتجاج اور رومان وانقلاب کے حسین امتزاج کی عکاس ہیں۔

سردار جعفری کے سب سے پہلے شعری مجموعے ''پرواز جو 1944 میں اشاعت گھر حیدر آباد دکن سے شائع ہوا تھا، اس میں کل 63 رنظمیں ہیں جن کے ذریعے سردار کے رومانی اور انقلابی آہنگ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ کئی نظمیں تو خالص رومانی ہیں جس میں حسن وعشق کے معاملات کے سوا کچھ بھی نہیں اور بعض نظموں میں رومانی اور انقلابی رویے صاف نمایاں ہوتے ہیں۔ حالانکہ ترقی پسند شعرا میں ایسے بہت سے شاعر تھے جنہوں نے رومان اور انقلاب کو ایک ساتھ پیش کیا ہے لیکن ان میں سب کا انداز جداگانہ ہے۔ کسی نے اسے ڈھکے چھپے انداز میں پیش کیا ہے تو کسی نے کھلے عام برہنہ گفتاری کا سہارا لیا۔ اس دور میں جو رومانی شعراء ہیں وہ اپنی رومانی تخلیقات میں پورے طور سے کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ''پرواز'' میں ایسی کئی نظمیں ہیں جو خالص رومانی ہیں۔ ''انگڑائی''،

''لکھنؤ کی ایک شام''،''انتظار نہ کر''،''فراموش کردند''،''عشق حسن سوگوار''،''غم کا ستارہ''، ''ایک خط کا جواب''،''اکیلا ستارہ''،'' سرراہ''،''خوشی''،''جھلک''،''عورت''،''حسن ناتمام''، ''محبت کافسوں'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو خالص رومانی چاشنی سے لبریز ہیں۔1936ء میں تخلیق کی ہوئی نظم ''انگڑائی''میں سردار جعفری کا رومانی لب ولہجہ پورے طور پر نمایاں ہے۔وہ محبوب کی انگڑائی کا ذکر بڑے ہی دل کش انداز میں کرتے ہیں۔ان کا محبوب جب مسکرا کراور ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لے رہا ہے تو ان کی ہستی کی لاکھوں دھجیاں اڑ رہی ہیں۔ انگڑائی لینے سے اور بھی کیا کیا کیفیت طاری ہورہی ہے نظم میں ملاحظہ فرمائیں ؂

مسکرا کر ہاتھ اٹھا کر یوں نہ لے انگڑائیاں دامن ہستی کی ہوجائیں گی لاکھوں دھجیاں
کھنچ کے آجائے گی نیچے آسماں کی انجمن چھوڑ دیں گی بجلیاں گھبرا کے اپنا بانکپن
رقص اپنا بھول جائے گا سنہرا آفتاب گر پڑے گا چھوٹ کر زہرہ کے ہاتھوں سے رباب
کوئی کونپل پھر حیا سے سر اٹھا سکتی نہیں پھر کلی بھی گلستاں میں مسکرا سکتی نہیں

سردار کی ایک نظم ''لکھنؤ کی ایک شام'' جو1939 میں تحریر کی تھی،رومانیت کے جذبات سے بھر پور ہے۔سردار نے اس میں لکھنؤ کی شام کا بڑے ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔منظر کشی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شام اودھ سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔اس زمانے میں وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔اے(سال اول) کے طالب علم تھے۔انہوں نے شام کے وقت مال روڈ کی چہل پہل کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے اوراس کے بعد اژدہام میں حسینوں کی شوخی، خوبصورتی، بل کھانا،اترانا اور ناز وادا سے شام کو اس طرح سے سجانا کہ ہر کوئی اس میں مست بے خود ہو جائے۔شاعر نے ہر طرح سے رومانیت سے لبریز شعر کہنے کی کوشش کی ہے۔چند بند پیش نظر ہیں ؂

یہ مال روڈ یہ گرمی کی شام کیا کہنا وفود جلوۂ دیدار عام کیا کہنا
دلہن کی طرح آراستہ دکانوں پر جوانیوں کا حسین اژدہام کیا کہنا
کشیدہ قامت و گل پیکر وسبک اندام غزل وحشت و آہو خرام کیا کہنا
کسی کی شوخی انداز و لغزش پا میں ہزار ناز و نیاز و پیام کیا کہنا

سردار جعفری کی نظم ''حسن ناتمام''فراموش کردند عشق''اور جھلک'' تقریباً ایک ہی موضوع

سے مناسبت رکھتی ہیں۔اس میں شاعر نے اپنے خوبصورت اور دل کش محبوب کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ ان کا محبوب کسی اور ہی دنیا سے آیا ہے اورسب سے حسین ہے،سب سے جداگانہ ہے۔اسی زمانے میں سردار سلطانہ کے عشق میں گرفتار ہوئے تھے اور اپنے دل کی ساری کیفیات خواہ وہ محبوب کی خوبصورتی ہو یا عشق کی بے قراری سب کچھ بیان کر کے رکھ دیا ہے۔لہجہ نہایت نرم اور بے حد شیریں ہے۔کسی حسین دوشیزہ کے حسن ورعنائی کا بیان اس طرح کیا ہے جس میں اسلوب کی ساری لطافتیں موجود ہیں۔تشبیہ واستعارے کے برمحل استعمال سے نظم میں جان پڑ گئی ہے۔''حسن ناتمام'' کے چند اشعار ملاحظہ کریں ؂

کس قدر شاداب و دلکش ہے وہ حسن ناتمام
جس کی فطرت غنچگی ،دوشیزگی ہے جس کا نام

جس طرح پچھلے پہر کا صاف و پاکیزہ افق
جس کے سینے سے ابھی پہلی کرن پھوٹی نہیں

جس طرح ساغر میں صہبا جیسے مینا میں شراب
جو ابھی مچلی نہیں ، چھلکی نہیں ، ابلی نہیں

جس طرح اک شوخ بجلی بادلوں کی آڑ میں
جو ابھی تڑپی نہیں ، چمکی نہیں ، ٹوٹی نہیں

اسی طرح نظم ''جھلک''میں بھی اپنے محبوب کی اس طرح تعریفیں کی ہیں جیسے رومانیت پورے شباب پر ہے ؂

رنگ بن کر بکھر گیا کوئی صرف لہرا کے رہ گیا آنچل
دل کو چھو کر گزر گیا کوئی گردش خوں رگوں میں تیز ہوئی

پھول سے کھل گئے تصور میں
دامن شوق بھر گیا کوئی

اس طرح سے ان کی بہت سی نظمیں ہیں جو عشق وعاشقی میں پوری طرح سے ڈوبی ہوئی ہیں۔ان کا محبوب پورے آب وتاب کے ساتھ نظر آتا ہے جس کی منظرکشی میں سردار نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ وہ

اپنے پورے ناز و انداز سے حسن کی رعنائیاں بکھیر رہا ہے۔کبھی اترانا،کبھی اٹھلانا جس کی ساری لطافتیں اس میں سمٹ آئی ہیں۔سردار جعفری کی اس طرح کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے حد رومانی شاعر تھے اور انقلابی شاعری ان کے بس کی بات نہیں تھی لیکن جب اس رومان میں انقلاب شامل ہوگیا تو رومان اور انقلاب کے خوبصورت سنگم سے اس کا حسن دوبالا ہوگیا اور ایک الگ قسم کا لطف پیدا ہوگیا۔

سردارجعفری کی مزاحمتی،احتجاجی اورانقلابی نظموں کا تفصیلی جائزہ

مدت تک اردوشاعری میں لب ورخساراورلعل وناب کی حاکمیت رہی ہے۔نالے اور بھالے کی شاعری بے جا چیخ،آہ وبکا کا سامان بے سوز تھی۔قدامت پرستی اورفرسودگی میں جکڑی شاعری کوترقی پسندتحریک نے نئی سمت عطا کی۔جنگ عظیم اورانقلاب روس نے دنیاکے ہرذی حس کو متاثر کیا۔جس سے ہندوستان میں رہنے والے شعراءاورادباءبھی متاثر ہوئے۔اقبال اس کے رہنما ٹھہرے جن کی شاعری اورفکر نے قدامت پرستی کی جڑیں کھوکھلی کردیں اورشاعری کے لیے نئی فضا اورراہ ہموارکی۔اقبال اس عہدکی واحدآواز ہےجس کی آمد پرلوگوں نے لبیک کہااورجس نے اردو شاعری کی نئی تقدیررقم کی۔اقبال کےفکری وشعری بطن سے جن شعرا کا جنم ہوتا ہے ان میں سردار جعفری کا ذکراولاً آتا ہے ؎

کھل گیا در ، پڑ گیا دیوار زنداں میں شگاف
اب قفس میں جنبشیں صدبال و پر ہونے کو ہے

سردارجعفری کی شاعری اپنے باغیانہ تیوراورظلم واستحصال کے خلاف صرف نعرے بازی کی شاعری نہیں ہے۔ان کا شعری احتجاج جزوی یاوقتی احتجاج نہیں ہے بلکہ انہوں نے بغاوت واحتجاج کوایک شعری استعارہ بنادیاہے۔انہوں نے اردوشاعری کونئی تکنیک اورموضوعات سے آشنا کرایا۔کرداروں کوعلامتوں کا پیراہن عطا کیا۔واقعات سے پیدا شدہ احساسات وجذبات اور تاثرات کواپنی شعری کائنات کا جزوبنایا۔پروفیسرسیداحتشام حسین سردارجعفری کے شعری سفرکو رومان سے انقلاب کا سفرگردانتے ہیں جب کہ مجنوں گورکھپوری کے خیال اس کے برعکس ہیں۔یعنی سردارمیں مزاحمتی وانقلابی رویہ اول سے ہی پیدا تھا۔رومان نے اس دوران سفران کا ہاتھ تھاما ہے۔

سردارجعفری کا تعلق علمی شیعہ گھرانے سے تھا۔آنکھ کھولتے ہی مرثیہ کی آوازکانوں میں پڑنے لگی۔ساتھ ہی حضرت امام حسین کے جرات مندانہ کرداراورحق وصداقت کے لیے جاں بسیاری کے جذبے نے انہیں گہرائی تک متاثر کیا۔لہٰذا یہی جذبہ ان کی شاعری کا محرک بھی بنا۔یوں دیکھا جائے توان کی شاعری کا سفرانقلاب سے رومان کا سفرہے۔سردارکی ابتدائی شاعری کے مطالعے سے

عیاں ہوتا ہے کہ ان کے ہاں انقلاب اور بغاوت ہم آہنگ ہیں۔مثال کے طور پر ذیل اشعار دیکھے جا سکتے ہیں ۔

مرے ہونٹوں پہ نغمے کانپتے ہیں دل کے تاروں کے
میں ہولی کھیلتا ہوں خون سے سرمایہ داروں کے

حقیقت سے مری کیوں بے خبر دنیائے فانی ہے
بغاوت میرا مسلک ہے مرا مذہب جوانی ہے

مذکورہ بالا نظم کے بعد ہی ان کی نظم ''بغاوت'' ہے جوان کے نظریہ سیاست ،سماج کے تئیں ان کے نظریات اور مذہبی خیالات کی تفصیلی وضاحت کی عمدہ مثال ہے۔نظم بغاوت کا منشور معلوم ہوتی ہے اور جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے کہ اس نظم کو باغیوں کا ترانہ کہا جانا چاہئے۔شاعر نے اس نظم میں زندگی اور سماج سے متعلق ہر صنعتی اشیا،فکر،خیال اور علامت سے بغاوت کا اعلان کیا ہے۔جھوٹی تہذیب وتمدن ،ابلیس سیرت یا پارسا شخصیت ،امر قوانین،بے حس حاکم،مفلسی ومذہبی علامتوں کے ساتھ ساتھ ماضی کی پارینہ داستانوں اور دور حاضر کے سیاسی افکار سے اعلان بغاوت کیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

بغاوت زرگری کے مسخ مذہب کے ترانوں سے
بغاوت عہد پارینہ کی رنگیں داستانوں سے

بغاوت دور حاضر کی حکومت سے ریاست سے
بغاوت سامراجی نظم و قانون و سیاست سے

بغاوت سخت پتھر کی طرح بے حس خداؤں سے
بغاوت مفلسی کی عاجزانہ بد دعاؤں سے

بغاوت درد سہنے سے بغاوت دکھ اٹھانے سے
بغاوت ہاں بجز انسان کے سارے زمانے سے

بغاوت حریت کے دیوتا کا استانہ ہے
بغاوت عصر حاضر کے سپوتوں کا ترانہ ہے

سردار جعفری کے پہلے شعری مجموعے ''پرواز'' میں اس طرح کی بہت سی انقلابی نظمیں موجود ہیں جو مزاحمتی واحتجاجی آہنگ سے لبریز ہیں۔ان میں ہر جگہ بغاوت نظر آتی ہے۔ان کا یہ الگ الگ رنگ کسی اور دوسرے شاعر سے مختلف ہے۔ان کا اپنا اسلوب ہے جو سب سے جداگانہ ہے۔ابتدائی دور کی شاعری میں گھن گرج مزید بلندی کے ساتھ اپنے شباب پر ہے۔پروفیسر عبدالستار رودلوی اپنے مضمون ''ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار کی شاعری'' میں فرماتے ہیں:

> ''جعفری صاحب کی شاعری کا یہ زمانہ سرمایہ دارانہ ظلم واستبداد کا زمانہ تھا،سامراجی استحصال کا دور تھا،لہٰذا اس میں ظلم واستبداد اور سامراجی استحصال کے خلاف اعلان بغاوت ہے۔یہ احتجاج جس کا نقطۂ آغاز انگریز سامراج کے ہندوستانی مزدور،کسان اور غریب طبقہ کے استحصال سے ہوکر اس عہد کے جاگیردارانہ نظام کے خلاف دعوت عمل دیتا ہے،آہستہ آہستہ وسیع تر معنی ومفہوم اختیار کرلیتا ہے۔'' [1]

اسی طرح سردار جعفری کی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' فرنگی ظلم سے پیدا شدہ تاثرات کا نتیجہ ہے۔نظم کی تخلیق کا سبب ایک چھاپہ مار جس کا تعلق یوگوسلاویہ سے ہے کا ایک خط ہے جو اس نے اپنی موت سے قبل اپنے مولود ہونے والے بچے کے نام لکھا تھا۔ایک ضعیفہ کی کینسر کے مرض سے موت بھی اس نظم کا محرک ہے۔حرف اول میں ملک میں پنپ رہی مایوسی،افلاس،فاقہ کشی اور ظلم وجبر کو ہدف تنقید بنایا ہے۔اس کی عکاسی کے لیے سردار نے ''سیاہ'' لفظ کا بار بار استعمال کیا ہے جو خود کئی منفی معنی رکھتا ہے۔سیاہ رنگ علامت کے بطور مختلف اور متعدد مسنون استعمال کی مثال کے لیے ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے ؂

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اڑتے ہیں
کھڑی ہوئی سیہ رات سر اٹھائے ہوئے

سیاہ سینوں کو تانے ہوئے سیاہ پہاڑ
سیاہ لوہے کی دیوار سی بنائے ہوئے

سیاہ وادی صحرا سیاہ دریا ہیں
سیاہ دشت سیہ کھیت لہلہاتے ہوئے

---

1 (ایوان اردو، سردار جعفری نمبر، جلد 14، شمارہ 5، ستمبر 2000، نئی دہلی، ص 28)

حرف اول کے آخر میں شاعر کا اس کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ رات دراصل عہد غلامی کی تیرگی کی رات ہے جو روشنی میں حق سے منھ چھپا رہی ہے۔اور پھر سوال کرتے ہیں کہ صبح انقلاب کی روشنی کہاں ہے اور انسان کے ضمیر کو منور کرنے والے آفتاب کہاں چھپ گیا ہے ؂

ضمیرعہد غلامی کی تیرگی ہے یہ رات
جو پھر رہی ہے اجالے سے منھ چھپائے ہوئے

کہاں ہے روشنی صبح انقلاب کہاں؟
ضمیر حضرت انسان کا آفتاب کہاں ؟

یہ نظم 1840 مصرعوں پر مشتمل ہے۔اس کے کردار،کردار نہیں بلکہ علامتیں ہیں جس میں ایک باغی مرد جاوید اور اس کی بیوی مریم کی کہانی ہے جو برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔سردار جعفری اس نظم کے ذریعے فرنگی ظلم کے خلاف ہندوستانیوں کی جدوجہد کو منظر عام پر لاتے ہیں اور بے حد خوبصورت علامتوں کے سہارے مجاہدین آزادی کو اپنی جدوجہد آزادی کو جاری و ساری رکھنے کے لیے حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔برطانوی حکومت سے ٹکر لینے کے جرم میں جاوید کو پھانسی کی سزادی جاتی ہے ادھر مریم حاملہ ہے اس لیے جاوید نے مرنے سے پہلے اپنے ہونے والے بچے کے لیے ایک خط لکھا ہے جس میں ہندوستان میں ایک نئی دنیا کی جھلک نظر آتی ہے جہاں ان پر انگریزی حکومت کا ظلم ختم ہو جائے گا اور ملک میں ایک نئی آزادی کی فضا قائم ہو گی۔سب سے زیادہ اہم کردار وہ بچہ ہے جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوا ہے۔وہ محض ابھی تصور ہی ہے۔وہ نئی دنیا کی علامت ہے، بشارت ہے،اس کی معصوم روح پوری نظم پر حاوی ہے۔اس طرح پوری نظم میں علامتی کردار ہیں اور اس علامت کے ذریعے جدوجہد آزادی کی لہر کو اور تیز کیا جا رہا ہے۔چند بند ملاحظہ ہوں ؂

ڈیڑھ سو سال کی مفلسی اور غلامی
ڈیڑھ سو سال کی کوڑھ نے کھا لیا ہے

آج ہندوستان جاگ اٹھا ہے
یہ جبس بوستاں جاگ اٹھا ہے

اس کی انسانیت اور روحانیت جاگ اٹھی ہے
بچے گہواروں سے رینگ کر آج باہر نکل آئے ہیں

اور انگریز سے اپنا کھویا ہوا بھولا پن مانگتے ہیں
عورتیں اپنی کھوئی ہوئی عصمتیں

مائیں بے آب سینوں کی شادابیاں مانگتی ہیں
دست کار اپنے مضبوط انگوٹھے

اور صناع و معمار اپنی سبک انگلیاں مانگتے ہیں
جنگ آزادی میں لڑنے والے سپاہی

کارخانوں کے مزدور کھیتوں کے دہقاں
اپنے دریا و دشت و جبل اپنا ملک و وطن مانگتے ہیں

یہ جبس بوستاں ہے ہمارا
سارا ہندوستاں ہے ہمارا

ہم اس اپنے وطن، اپنے گلزار میں اور کچھ بھی نہیں
صرف جینے کا حق مانگتے ہیں

یہاں سردار جعفری علامتوں کے سہارے ہندوستان کے عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور انہیں یہ امید بھی دلا رہے ہیں کہ آنے والا کل اس سے بہتر ہوگا۔ آج بھوک، افلاس، بے کاری، بے روزگاری، قحط، وبا وغیرہ پریشانی کا سبب ہیں لیکن مستقبل میں یہ پریشانی ختم ہو جائیں گی ۔ جاوید کی زبانی سردار نے کہا ہے کہ آج ہندوستان میں کوئی چین سے نہیں ہے سب غمزدہ ہیں ۔ ڈیڑھ سو سال سے برطانوی حکومت کا ظلم برداشت کرنے والے غلام اور مفلس ہندوستانی کب تک یوں ہی بے کار پڑے رہیں گے۔ ایک نہ ایک دن ہمیں اپنے حق کے لیے آواز اٹھانی ہوگی اور انقلاب و بغاوت کا نغمہ چھیڑ کر آزادی حاصل کرنے کے لیے کھڑے ہونا ہوگا۔ اب ہندوستان جاگ گیا ہے، انسانیت بھی جاگ اٹھی ہے، ایک نیا زمانہ آنے کو مضطرب ہے ،جس سے ہر سو خوشیاں ہوں گی اور

ہندوستان کاایک ایک فرد اپنے کھوئے ہوئے وقار کوواپس پانے کے لیے نکل پڑا ہے جس کا وہ حقدار ہے۔

''نئی دنیا کوسلام'' سردار کی رومانی اورانقلابی شاعری کا مرقع ہے۔کئی جگہوں پراقبال کا شعری اثراس قدرحاوی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے سردار نے اپنے خیال کواقبال کے شعری تضمین میں ضم کردیا ہے۔موضوع کی مناسبت سے بہت معقول تونہیں لیکن شعری اورفکری اعتبار سے اجمالی طور پر ذکر کیے جانے والی ضرور ہے۔مثال کے طور پر ذیل اشعار پراقبال کی نظم ''ساقی نامہ'' کا اثر ملاحظہ کیجئے۔

یوں اڑ رہا ہے نشان زندگی کا
تھکتا نہیں کارواں زندگی کا

تسلسل حقیقت تسلسل فسانہ
تسلسل ہی ہے زندگی کا ترانہ

کرن سے کرن اس طرح پھوٹتی ہے
کہ جس طرح پھلجھڑی چھوٹتی ہے

مذکورہ نظم کےمتعلق پروفیسرشکیل الرحمٰن کا خیال ہے کہ:

''نئی دنیا کوسلام ایک خوبصورت تخلیق ہے،یہ تمثیل نظم غلام ہندوستان کے حالات اوران حالات میں عوام کی آرزوؤں اورتمناؤں کوجذب کئے ہوئے شدید جمالیاتی ردعمل کااظہارکرتی ہے.......نئی دنیا کوسلام میں جذبات اہم ہے ہیں،جذبوں کی بنیادہی پراس تمثیلی نظم کے موضوعات اور واقعات ابھرتے ہیں،متاثرکرتے ہیں اورجمالیاتی انبساط عطا کرتے ہیں۔'' [1]

نظم ''جنگ اورانقلاب'' میں اشتراکی نظریہ کی بھرمار ہے۔نظم کے لفظ لفظ سے بغاوت اور انقلاب کی چنگاریاں پھوٹ رہی ہیں۔تابناک مستقبل کی تہارت اور غلامی سے آزادی کا نوید بھی

---

[1] (شکیل الرحمٰن،نئی دنیا کوسلام:جمالیاتی جہتیں، مشمولہ فکروتحقیق،اکتوبرتادسمبر 2001، دہلی، ص:7)

یہاں ہے۔سرمایہ داری نظام اور ظلم کے تسلط کے خاتمہ کا اعلان اور خوشی اور جشن وطرب کی گھڑی کا منظر بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ان سب کے باوجود ایک چیز جو قابل غور ہے،سردار جعفری کا لب ولہجہ اور انداز بیان۔الفاظ میں چنگاریاں جب کہ لب و لہجے میں چاشنی،دلکشی اور جاذبیت ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

رقص کرائے روح آزادی کہ رقصاں ہے حیات
گھومتی ہے وقت محمود پہ ساری کائنات

اڑ رہا ہے ظلم و استبداد کے چہرے سے رنگ
چھٹ رہا ہے وقت کی تلوار کے ماتھے سے زنگ

وقت کے پہیئے کی گردش رک نہیں سکتی کبھی
عمر کی نبضوں کے جنبش رک نہیں سکتی کبھی

روح آزادی کو سینے میں جکڑ سکتا ہے کون؟
ناچتے سورج کی کرنوں کو پکڑ سکتا ہے کون؟

روسی انقلاب(1917-1923)غلامی تاریخ کے اہم ترین واقعات میں شمار ہوتا ہے۔ اس انقلاب نے دنیا کے ہرذی روح کو متاثر کیا اور دنیا میں انقلاب کے جیالوں کے لیے مشعل راہ کا کام کیا۔سردار نے انقلاب روس میں بکھرے اور ٹھکرائے ہوئے مفلس اور درماندہ عوام کے لیے امید کی کرن کا جلوہ دیکھا۔جس نے زندگی کو نئی تجلی اور نور عطا کیا،جس نے عمل کی راہوں میں حوصلے کی مشعل روشن کی،جس نے ظلم کے نشیمن پر بجلیاں گرائیں۔اس انقلاب نے لشکروں کی بستیاں خاشاک میں تبدیل کر دی۔اس انقلاب نے ان کے سینوں پر سرد قلم سے 'انقلاب' لکھ دیا۔اس نے پرانی دنیا کے رسم و رواج جس میں ظلم و استبداد کا بول بالا تھا،آن کی آن میں تہہ و بالا کر دیا، غلاموں کو لذت آزادی سے آشنا کیا اور بتایا کہ وقت کی باغ ڈور محنت کش عوام کے ہاتھوں میں ہے۔محنت کش عوام ہی کسی ملک کی تقدیر لکھتے ہیں۔اس طرح اس انقلاب میں سردار کو دنیا کے حسین مستقبل

کا نور دکھائی دیتا ہے۔ایسا نور جس کی مدھم روشنی پژمردہ چہروں پر زندگی کی رمق کا شاخسانہ ہے۔نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

رخ حیات کو بخشیں تجلیاں تو نے
بکھیر دی ہیں فضاؤں میں سرخیاں تو نے

جلائی عزم کی مشعل عمل کی راہوں میں
دیا ہے منزل مقصود کا نشاں تو نے

جہان پیری کی طرح کہن بدل ڈالی
مٹائے فرقہ وطبقات کے نشاں تو نے

بجھے بجھے سے پڑے تھے جو رہ گزاروں میں
بنا دیا انہیں ذروں کو کہکشاں تو نے

انقلاب روس سے متعلق ایک اور نظم ''تعمیر نو'' ہے جس میں سردار نے اس انقلاب کی جی کھول کر پذیرائی کی ہے۔یہ نظم پچھلی نظم کے خیال سے کچھ خاص مختلف نہیں ہے۔چند بند پیش نظر ہیں ۔

انقلاب روس نے مشرق میں چھیڑا ہے رباب
ایشیا کی روح میں ہے زندگی کا اضطراب

زندہ باد اے انقلاب

رسم پرویزی گئی ، آئین چنگیزی گیا
اب ہمیشہ کے لیے دستور خوں ریزی گیا

زندہ باد اے انقلاب

جیسا کہ ماقبل ذکر کیا جا چکا ہے کہ جعفری کو روسی انقلاب نے بہت متاثر کیا۔اوران کی نظموں میں بھی اس کے واضح اشارات درج ہیں۔یہ انقلاب جن کی کاوشوں سے تاریخ میں رقم کی جانے والی حوصلہ افزا تحریک کی شکل میں درج ہوسکا ہے ان میں اسٹالن کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔سردار نے نظم ''استالن کتھا'' میں اس جانباز سپاہی کو خراج عقیدت پیش کا ہے اوراس کے

کارناموں کا ذکر بھی نہایت خوش دلی سے کیا ہے۔سردار نے نظم میں تعلقہ عہد کے ہندوستان اور روس کے حالات کا موازنہ بھی پیش کیا۔روسی راجہ (ژار)اور ہندوستانی رہنماؤں کوانسانی خون کا پیاسا بتایا ہے۔مثلاً ذیل اشعار دیکھیں ۔

آزادی کے لڑنے والو، سنو کتھا استالن کی
سارے جگ میں جس کے دم سے اجیاری ہے لینن کی

روس کی پرجا بھوکوں مرتی جیسے ہند کی پرجا آج
روس کا راجہ لہو کا پیاسا جیسے ہند کا نیتا آج

اس نظم میں اسٹالن کی تعریف کے ساتھ ساتھ سردار نے ان حالات کا بھی ذکر کیا ہے جن حالات نے عوام میں بغاوت کے جذبے کوفروغ بخشا۔مالک کس طرح مزدوروں کا استحصال کرتا ہے اوربھوک وافلاس کی چادر میں لپٹی عوام کی زندگی کس قدر دشوارکن ہو چلی تھی،سردار نے نظم میں مفصل بیان کیا ہے۔لینن اوراسٹالن نے کس طرح مزدوروں کومتحداور مجتمع کیا،انہیں آزادی کے خواب دکھائے اورکیسے غریب مزدوروں نے لال پرچم تلے اپنی پلکوں کی سارے خواب چن کررکھ دیے ۔

کچا چٹھا بتلائے مل والوں دھن والوں کا
گر سکھلائے محنت کرنے والوں کو ہڑتالوں کا

بارہ گھنٹے محنت کرکے چھ گھنٹے کی اجرت پائیں
مل والوں کی دولت باڑھے محنت والوں کی بپتائیں

کب تک یہ اندھیر نگر چوپٹ راجہ کا تخت و تاج
اپنی محنت ، اپنا منافع ، اپنی دولت اپنا راج

محنت کو یہ خواب دکھایا ، لینن اور استالن نے
محنت کش دنیا کو جگایا ، لینن اور استالن نے

اس کی دھار نے جنتا کے پیروں کے بندھن کاٹ دیے
سرمایہ داری کے سنہرے ہاتھ کے کنگن کاٹ دیے

مختصراً یہ کہ یہ پوری نظم اشترا کی نظام کی وکالت کرتی ہے اور ہندوستانی عوام سے اشارتاً اس انقلاب سے سبق لینے کا درس بھی دیتی ہے۔ پوری نظم سردار کے باغیانہ اورمزاحمتی روپ کو پیش کرتی ہے اورعوام کو بیداری کے پیغام سے آشنا کرتی ہے۔

''رومان سے انقلاب تک'' سردار جعفری کی ایک اور انقلابی نظم ہے جس میں سردار نے پندرہ برس کی ترقی پسند شاعری پر تنقید کی ہے۔اس میں شاعروں کو رومانی شاعری کے بجائے انقلابی شاعری کرنے کے لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ وقت تبدیل ہورہا ہے اوراس تبدیلی کے ساتھ چلنے کے لیے انقلابی آہنگ کی ضرورت ہے۔ جب تک نغموں میں فولاد و بارود کا زور،تلوار کی دھاراور بجلی کی سی تیزی نہیں ہوگی تب تک انقلاب نہیں آئے گا۔محض اشکوں کے طوفان اورخوابوں کے رومان، شاعری کو تبدیل نہیں کرسکتے اس کے لیے انسانی خون میں گرمی کی ضرورت ہے ۔جو جوش وولولے کو زندہ کردے۔ اس سے پہلے قدامت پسند شاعری میں محض افسوس ،ماتم،خواب،رومان اور نا امیدی والتجاہی پر زوردیا گیا تھا۔ جووقت کے لحاظ سے تبدیلی کا خواہاں ہے،بغاوت کا خواہش مند ہے۔سرداراپنے ولولہ خیز لہجے اوراحتجاجی شاعری کے ذریعے اپنے ہم وطنوں کوانقلاب سے آشنا کرانا چاہتے ہیں۔اس کے علاوہ سردارجعفری نے بے مقصدشاعری سے ناآسودگی کااظہارکرتے ہوئے شعراء کوواضح اورمقصدی شاعری کرنے پرمتوجہ کیاہے۔وہ شاعروں سے اس طرح مخاطب ہیں ؎

شاعروساتھیو
کاکلوں کی گھنی چھاؤں سے
سرخ پرچم کے گھنے سائے میں آؤ
اورنئے گیت گاؤ
گاؤمزدور کے ساز پر
گاؤ جمہور کے ساز پر
آہنی کاروانوں کے قدموں کی آواز پر
گاؤ جس طرح میدان میں کوئی مجاہد رجز پڑھ رہا ہو

گاؤ جیسے سمندر میں طوفاں کا دیوتا چڑھ رہا ہو
گاؤ گاؤ گرجتے ہوئے بادلوں کی طرح
گاؤ گاؤ کڑکتی ہوئی بجلیوں کی طرح
آندھیوں کی طرح
زلزلوں کی طرح
گولیوں کی طرح اپنے الفاظ دشمن پر برساؤ
سارے عالم پہ چھا جاؤ

سرادر جعفری نے فیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' کی طرز پر نظم ''انتظار نہ کر'' تخلیق کی جس میں وہ اپنے محبوب سے مخاطب ہیں اور ہندوستان کی موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے اپنے محبوب سے ان کا انتظار نہ کرنے کی بات کہہ رہے ہیں۔دراصل سردار جعفری ،فیض ہی کی طرح عشق کے پردے میں رومانی دنیا کو چھوڑ کر حقیقی دنیا کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔اب وہ عشق وعاشقی کے مزے،حسن کاری، وصال کا لطف ان سب کو قربان کر کے عام انسانی زندگی اس کے مسائل،اخلاقی اقدار،انسانی اقدار کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔اس نظم میں ان کا احتجاج ایک الگ شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔وہ اپنے محبوب کو بھولے بھی نہیں ہیں لیکن اس کو انتظار کا حق بھی نہیں دے رہے ہیں۔اب ان کی منزل ان کے راستے کچھ اور ہی ہیں جس کی ان کو خود خبر نہیں ہے۔چند بند ملاحظہ فرمائیں ۔

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

عجب گھڑی ہے میں اس وقت آ نہیں سکتا
سرور عشق کی دنیا بسا نہیں سکتا
میں تیرے ساز محبت پہ گا نہیں سکتا
میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر
نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

''ایشیا جاگ اٹھا'' سردار جعفری کی طویل نظم ہے۔سردار نے سینٹرل جیل ناسک میں اسیری کے دوران تخلیق کی تھی۔اس میں ۸۸/اشعار پر مشتمل' حروف اول' کے عنوان سے نظم کا آغاز ہوتا ہے۔اس کے بعد اصل نظم شروع ہوتی ہے۔جس میں تقریباً775 مصرعے ہیں جس کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پوری نظم میں سردار جعفری نے ایشیا کا تاریخی تجزیہ پیش کیا ہے۔سب سے پہلے ''حرف اول'' میں ہندوستانیوں کوآزادی ملنے کی خوشی کا ذکر ہے، پھرانگریزوں سے مخاطب ہوکر پورے ایشیا کوانگریزوں کی سیاست سے آزادکراکر، مذہبی،تہذیبی وثقافتی یکجہتی قائم کرنے کی بات کہی ہے ۔

ایشیا کی جنگ آزادی ہے اک دنیا کی جنگ
ہے ہمارے زخم دل میں سارے عالم کی امنگ
ہاں بدل جانے کو ہے اب مشرق ومغرب کا رنگ
آج سب مل کر پکارو ،مل کے سب نعرے لگاؤ
'ایشیا سے بھاگ جاؤ'
'ایشیا سے بھاگ جاؤ'

اس کے بعد جونظم شروع ہوتی ہے اس میں پوری ایشیائی تاریخ کا تجزیہ کیا گیا ہے اور یہاں کے مختلف کارناموں کوبھی پیش کیا گیا ہے۔انگریزوں کی آمد،ان کی حکومت،اوراستحصال کا ذکر بھی کیا گیا ہے کہ کس طرح سے برطانوی حکومت کے دور میں ہندوستان جس طرح بھوک،افلاس،قحط اور سماجی وسیاسی استحصال سے دوچار تھا اوراس سے عوام کس طرح متاثر ہوئے اس کا بڑے ہی انقلابی انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔انگریزوں کی نئ نئ پالیسی،کبھی ریلوے لائن توکبھی ڈاک،تار اور دخانی جہاں وغیرہ کے متعلق سردار نے اظہار خیال کیا ہے کہ یہ تمام اشیا انگریز اپنے مفاد کے لیے ہندوستان لائے تھے اور یہاں پر اپنی تہذیب بھی چھوڑ گئے جس کی بہت مخالفت کی گئی۔اس کے بعد سوویت یونین کا ذکر کرتے ہیں جوکہ ان کی شاعری کا اہم جز ہے۔وہ اسے ساری دنیا کی پریشانی ختم کرنے والا نظام بتاتے ہیں جوانہیں استحصال سے نجات دلاکر ظلم وستم بھی مٹائے گا۔اس طرح سوویت یونین کے ذریعے عوام میں بیداری اورظلم کے خلاف احتجاج کرنے کا سبق دیا جارہا ہے۔

سردار جعفری کی پوری شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ احتجاج ان کی تخلیق میں ہی شامل ہے۔ وہ ایسے شاعر ہیں کہ جن کے کلام کے گوشے گوشے سے انقلاب کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں ایسی نظموں اور غزلوں کی بھرمار ہے جن میں مزاحمتی و احتجاجی آہنگ موجود ہے۔ ''پتھر کی دیوار'، 'ایک خواب اور'، ' پیراہن شرر'، 'لہو پکارتا ہے' وغیرہ میں بھی ایسی نظمیں موجود ہیں جن میں انقلابی رویہ بدرجہ اتم موجود ہے۔

باب پنجم

علی سردارجعفری اورمخدوم محی الدین کی نظموں کاتقابلی جائزہ:

☆ سردار جعفری اور مخدوم کی نظموں میں مزاحمتی، احتجاجی اور انقلابی صورتوں میں یگانگت

☆ علی سردار جعفری اور مخدوم کی نظموں میں مزاحمتی، احتجاجی اور انقلابی آہنگ ۔ایک تقابلی جائزہ

سردار جعفری اور مخدوم کی نظموں میں مزاحمتی ، احتجاجی اور انقلابی صورتوں میں یگانگت

جیسا کہ پچھلے ابواب میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ پوری ترقی پسند شاعری رومان اور انقلاب کا خوبصورت امتزاج ہے جو مزاحمتی واحتجاجی رویے سے پر ہیں۔جس میں کہیں کہیں بلند آہنگی اور نعرہ بازی اس قدر حاوی ہوجاتی ہے کہ شاعری کا فن مجروح ہوتا نظر آتا ہے لیکن ترقی پسند شاعری کی اپنی ایک منفرد حیثیت ہے، اپنا ایک مختلف مزاج ہے اور یہ بلند آہنگی جو کہ شاعری کا عیب معلوم ہوتی ہے دراصل یہی شاعری کا حسن ہے۔ترقی پسند شعرا نے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے وہی لب ولہجہ اختیار کیا جس سے اپنے جذبات کا اظہار کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔ان کو جذبات اظہار میں کامیابی بھی ملی اور ساتھ ساتھ اردو شاعری کے مختلف روپ دیکھنے کو ملے جو اردو شاعری کا ایک بہت وسیع سرمایہ ترقی پسند شاعری کے نام سے محفوظ ہوگیا۔ترقی پسند شاعری کا ایک مقصد تھا جس کے تحت شاعری سے معاشرتی تبدیلی کا کام لیا جائے۔اس طرح سے شاعر کی حیثیت عوام سے بلند ہوکر ایک رہنما کی ہوجاتی ہے۔اب شاعر کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے، وہ معاشرے کا باشعور فرد ہے۔ اس کو عوام کی زندگی بہتر بنانی ہے۔اس وقت اس پر دو ذمہ داریاں ہیں ایک حقیقت کی عکاسی اور دوسری مستقبل کی نشاندہی۔اس ضمن میں عقیل احمد صدیقی اپنی کتاب جدید اردو نظم: نظریہ وعمل میں فرماتے ہیں:

> ''دراصل ترقی پسند شعری جمالیات ''افادیت'' اور ''مقصدیت'' کے اصول پر قائم ہے جس کی رو سے شاعروں پر یہ ذامہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اجتماعی زندگی کی ترجمانی کریں اور بہتر زندگی کی راہ دکھلائیں۔اجتماعی زندگی کی ترجمانی اس وقت ممکن ہے کہ شاعر عام انسانوں کی زندگی میں رونما ہونے والی کشمکش کو اجاگر کرے یہ ایک پہلو ہے کہ جانا مکمل ہے۔حسن کے لیے تکمیل ضروری ہے اور یہ تکمیل

> ترقی پسند نقطۂ نظر کے مطابق اسی وقت ممکن ہے کہ جب فنکار ''افادیت'' کو بھی فن پارے میں جگہ دے۔ادب کا یہ تصور فنکار کو رہبر یا پیغمبر کے روپ میں دیکھتا ہے گویا شاعر عوام کا ایک حصہ ہی نہیں بلکہ عوام سے بلند ہو کر وہ ایک ایسا پیغمبر ہے کہ جو انہیں بہتر زندگی کی راہ دکھاتا اور اس پر چلنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔'' [۱]

ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری کو آسمان کی بلندیوں سے اتار کر زمین پر کھڑا کر دیا۔اب جو مسائل زمین پر رہنے والے عام انسان کے تھے وہی ترقی پسند ادب کے تھے۔اگر موضوع کے اعتبار سے دیکھیں تو تمام ترقی پسند شعرا کے یہاں اکثر وہی موضوعات ملتے ہیں جو عہد متعلقہ کے اہم مسائل میں شامل ہیں۔مثلاً انقلاب روس، جنگ انقلاب، جہد آزادی، مکمل آزادی کا خواب، برطانوی حکومت سے نجات کی کوشش وسعی، بھوک، افلاس، سرمایہ دار اور جاگیردار کے مظالم، کسانوں اور کمزوروں کا استحصال، لینن، اسٹالن وغیرہ کے کارنامے، قتل وغارت گری، سیاست دانوں کی ناانصافی، عورتوں کے مسائل، سویت یونین، زنداں کی صعوبتیں اور ایک نئی صبح کی امید وغیرہ اس دور کے اہم مسائل ہیں جس کو ہمارے ترقی پسند شعرا نے اپنی تخلیق میں خصوصاً جگہ دی ہے۔ یہاں اکثر شعرا کے موضوعات میں تقریباً یکسانیت ہے لیکن طرز اظہار اور لہجہ ایک دوسرے سے کافی حد تک مختلف ہیں۔

علی سردار جعفری اور مخدوم محی الدین ترقی پسند شاعری کے اہم ستون ہیں۔تمام ترقی پسند شعرا کی طرح ان کی شاعری میں بھی یکسانیت ہے۔موضوع کے اعتبار سے ان دونوں کی کئی نظمیں ایک جیسی ہیں چونکہ ان دونوں کا زمانہ ایک تھا اس لیے اس دور کے مسائل بھی وہی تھے اور دونوں نے بہت سی نظمیں ایک ہی موضوع پر تخلیق کی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی بعض نظموں کے عنوان بھی ایک جیسے ہی ہیں مثال کے طور پر ''جوانی''، ''استالن''، ''بنگال''، ''اقبال''، ''تلنگانہ''، ''شاعر''، ''غالب''، ''نیند''، ''نیا سال''، ''جواہر لال نہرو'' وغیرہ۔ان نظموں میں موضوعات کے اعتبار سے یکسانیت ہے۔

نظم 'جوانی' جو دونوں شعرا کے یہاں ایک ہی عنوان سے لکھی گئی ہے اس کا خیال بھی تقریباً

---

۱ (جدید اردو نظم نظریہ و عمل، عقیل احمد صدیقی، 1990، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ص:69)

ایک ہی ہے۔ مخدوم کے یہاں طفلی سے آگے بڑھ کر جوانی کا رنگ چھڑ رہا ہے۔ جس طرح سے بچے جوانی سے پہلے غفلت میں رہتے ہیں، ان کے خوابیدہ جذبات بڑے ہی نازک ہوتے ہیں۔ یہاں مخدوم نے بچپن اور لڑکپن سے جوانی کے سمت جانے والے ہراس جذبات کو بیان کیا ہے جس سے بچپن اور جوانی کی کیفیت میں فرق نظر آتا ہے۔ یہاں ہراس تبدیلی کا ذکر ہے جس سے بچپن اور جوانی میں محسوس کیا جاتا ہے اور جس سے واقفیت ہوتی ہے کہ یہ تبدیلی محض خارجی نہیں بلکہ داخلی بھی ہے۔ بچہ جب جوانی کی طرف جاتا ہے تو اس میں صرف جسمانی تبدیلی نہیں آتی بلکہ وہ ذہنی تبدیلی کے عمل سے بھی گزرتا ہے اب اس کے طور طریقے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اشعار دیکھیں ۔

بیدار ہوئی مہر جوانی کی شعائیں
پڑنے لگیں عالم کی اسی سمت نگاہیں

خوابیدہ تھے جذبات بدلنے لگے کروٹ
روئے شرر طور سے ہٹنے لگا گھونگھٹ

بھرنے لگے بازو تو ہوے بند قبا تنگ
چڑھنے لگا طفلی پہ جوانی کا نیا رنگ

سردار جعفری کی نظم ''جوانی''، میں بھی کم وبیش اسی جذبات کی ترجمانی ہے۔ ان کے یہاں بھی خوابیدہ جزبات ہیں جو عالم جوانی کے منتظر ہیں۔ جو اپنے سینے میں بہت سے ارمان لے کر جی رہے ہیں۔ جنہیں اس دن کا انتظار ہے جب ان کے ادھورے خواب پورے ہوں گے جب ان کی خواہشیں ایک نیا موڑ لیں گی۔ وہ ہاتھ جنہوں نے انہیں پال پوس کر بڑا کیا ہے وہ آنکھیں جو ان کے لیے رات دن خواب دیکھتی ہیں۔ یہاں انہوں نے کافی رومانی انداز اختیار کیا ہے جس نے نظم کو زندہ جاوید کر دیا ہے ۔

امنگوں نے مجھے دودھ اپنے سینے سے پلایا ہے
ہزاروں ولولوں نے میرا گھوارہ ہلایا ہے

کھلایا ہے مجھے گودوں میں جرات نے حمیت نے
سلایا لوریاں دے کر مجھے ہمت نے غیرت نے

مخدوم اور سردار دونوں نے اسٹالن پر بھی نظمیں کہی ہیں، دونوں کا عنوان بھی ایک ہے۔ مخدوم کی نظم ''اسٹالن'' دراصل قزاقستان کے ایک بوڑھے تاتاری شاعر جمبول جابر کی نظم کا آزاد ترجمہ ہے۔ یہ نظم ایک ایسے طوفان کے مانند ہے جو برسوں سے مخدوم کے سینے میں کروٹ لے رہا تھا لیکن اسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔اس نظم کے ذریعے انہیں اپنے ولولہ خیز جذبات کو ظاہر کرنے کا موقع مل گیا۔ جابر انقلاب روس سے پہلے کا انقلابی شاعر ہے، جس کا رنگ آج بھی قائم ہے۔اس نظم میں مخدوم نے خود کو تماشائی بنا کر میدان جنگ میں اترنے پر احتجاج کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اگر میں میدان جنگ میں محض ایک تماشائی بنے رہنے کے لیے جنگ میں حصہ لوں تو اس سے اچھا ہے کہ جنگ میں حصہ ہی نہ لیا جائے۔پوری نظم پر اشتراکی انقلاب کا اثر ہے۔مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان جو جنگ چل رہی ہے یہ نظم اس کی نقیب ہے۔مخدوم نے یہاں سخت انقلابی رویہ اختیار کیا ہے۔اپنے عزیز ساتھیوں کو للکار رہے ہیں کہ وہ جوش میں آئیں اور دشمنوں کے خلاف تلوار اٹھائیں ۔

قرۃ العین ! میری جان عزیز
او میرے فرزندو!
برق پا، وہ مرا راہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں میری تلوار کہاں ہے لانا
مرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالار جہاں استالن

دوسری طرف سردار جعفری نے نظم 'استالن کتھا' میں اس جانباز سپاہی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اور اس کے کارناموں کا ذکر بھی نہایت خوش دلی سے کیا ہے۔ اسٹالن کی تعریف کے ساتھ ساتھ سردار نے ان حالات کا بھی ذکر کیا ہے جن حالات نے عوام میں بغاوت کے جذبے کو فروغ بخشا۔

مالک کس طرح مزدوروں کا استحصال کرتا تھا اور بھوک وافلاس کی چادر میں لپٹی عوام کی زندگی کس قدر دشوار کن ہو چلی تھی، سردار نے نظم میں مفصل بیان کیا ہے۔لینن اوراسٹالن نے کس طرح مزدوروں کو متحد اور مجتمع کیا، انہیں آزادی کے خواب دکھائے اور کیسے غریب مزدوروں نے لال پرچم تلے اپنی پلکوں کی سارے خواب چن کر رکھ دیے۔ پوری نظم اشترا کی نظام کی وکالت کرتی ہے ۔

کچا چٹھا بتلائے مل والوں دھن والوں کا
گر سکھلائے محنت کرنے والوں کو ہڑتالوں کا

بارہ گھنٹے محنت کر کے چھ گھنٹے کی اجرت پائیں
مل والوں کی دولت باڑھے محنت والوں کی بپتائیں

کب تک یہ اندھیر نگر چوپٹ راجہ کا تخت و تاج
اپنی محنت ، اپنا منافع ، اپنی دولت اپنا راج

محنت کو یہ خواب دکھایا ، لینن اور استالن نے
محنت کش دنیا کو جگایا ، لینن اور استالن نے

قحط بنگال کا موضوع اردوادب کی تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔اس موضوع پر بہت سے شعرانے نظمیں کہیں ہیں چنانچہ مخدوم اور سردار نے بھی ''بنگال'' کے عنوان سے نظم تخلیق کی جو اس جان لیوا قحط سے متعلق ہے جو اس وقت ہندوستان کے صوبہ بنگال میں پھوٹ پڑا تھا، دونوں شعرا کے یہاں اس موضوع میں کافی مناسبت ہے۔نظم میں اس عظیم بنگال کے عوام کے المیے کا درد بھی ہے جنہوں نے ہندوستان کو بے مثال مفکر، شاعر اور جنگ آزادی کے مجاہد دیے۔اس بنگال کا حال نہایت افسوسناک ہے۔ قحط نے پورے صوبے میں ہنگامہ مچا رکھا ہے۔بھوک وافلاس اور غربت سے ہر طرف تباہی کا منظر نظر آ رہا ہے۔سیکڑوں سڑتی ہوئی لاشیں راہ میں بچھی ہیں۔میتیں اس طرح بے گور و کفن پڑی ہیں کہ اس پر غبار کی چادر سی جم گئی ہے۔بھوک کے مارے عورتوں کا برا حال ہے اوران کے بھوکے شیر خوار بچے اپنی ماں کی چھاتیوں سے دودھ پینے کی کوشش کررہے ہیں لیکن ماؤں کی چھاتیاں اس قدر سوکھ گئی ہیں کہ اس میں ایک بوند بھی دودھ نہیں ہے۔ان بھوکے بچوں کی چیخ وپکار سے دھرتی کانپ

جاتی ہے۔دونوں شعرانے اس وقت کی منظرکشی میں کوئی کسرنہیں چھوڑی۔مخدوم کہتے ہیں ۔

امت مرحوم ہو یا ملت زنار دار
ان کے فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار

مرد و زن ، شیخ و برہمن ، سب قطار اندر قطار
آہ سوکھی چھاتیوں کی چیخ ، بچوں کی پکار

سردار جعفری نے بھی بڑا جاندار نقشہ کھینچا ہے ۔

سیکڑوں سڑتی ہوئی لاشوں سے اٹھتا ہے بخار
میتیں ہیں بے کفن چادر اڑھاتا ہے غبار

چھاتیاں ماؤں کی جن سے دودھ کی بہتی ہے دھار
بے بسی سے آج ان کو چوستے ہیں شیر خوار

دونوں شعرانے عوام کوکسی مذہب یاسیاسی جماعت سےتعلق کا خیال کیے بغیر متحد ہوکرلڑنے کی دعوت دی ہے۔دونوں کا خیال ہے کہ جب ہم متحد ہوجائیں گے تب کوئی ہمارا کچھ بگاڑنہیں سکتا۔اب سیاسی رہنماؤں کوبھی متحد ہونے کی ضرورت ہے اوران سےمتعلق پارٹی کوبھی بیدار کرنا ہوگا۔ہندوستان کے ہرگوشے گوشے میں زندگی کو پہنچانا ہوگا۔مخدوم نے توان چارمصرعوں کو پانچ بار دہرایاہے ۔

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں
خون کا بھرپور دریا پار کرسکتے ہیں ہم

کانگریس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

سردار جعفری نےنظم کے آخر میں متحد ہوکراٹھنے کی بات مثالوں کے ذریعہ پیش کی ہے ۔

متحد ہو کر اٹھو جس طرح دریا میں ابال
متحد ہو کو بڑھو جس طرح صحرا میں غزال

متحد ہو کر اٹھو جس طرح شاعر کا خیال
متحد ہو کر چلو مانند بادِ بر شگال

پھر بہار آجائے شاخ آرزو پھلنے لگے
کھیتیاں شاداب ہو جائیں ہوا چلنے

ترقی پسند شعرا اکثر و بیشتر اقبال سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چونکہ ترقی پسند نظریہ کی حمایت اقبال نے پہلے ہی کی تھی جب اس کا وجود بھی نہیں تھا۔ اقبال کے یہاں مزدور، کسان، سرمایہ دار، اور جاگیردار کا ذکر بہت پہلے سے تھا، لینن اور مارکس کا نظریہ بھی ان کے یہاں عام تھا۔ ترقی پسند شعرا نے اقبال کو نہ صرف پڑھا بلکہ ان کے نظریہ کو پوری طرح اپنایا بھی۔ سردار اور مخدوم دونوں کی شاعری میں اقبال کے افکار شامل ہیں۔ دونوں نے ہی 'اقبال' کے عنوان سے ایک پوری نظم تخلیق کی ہے اور دونوں شعرا کے خیالات بھی تقریباً ایک ہی ہیں۔ اقبال کے آنے سے قبل اردو شاعری کا جو دور تھا، تاریکی میں گم تھا۔ ہر سو اندھیرا تھا، مایوسی تھی اور دور دور تک روشنی کا نام و نشان نہ تھا۔ ایسے میں اقبال جیسا شاعر و مفکر ایک نور کے مانند پھیل گیا، جس سے مشرق میں اجالا نظر آنے لگا اس اجالے کو مخدوم نے مشرق کے اجالے سے تعبیر کیا ہے اور آسمان میں اڑنے والے شرارے سے تشبیہ دی ہے۔ دوسری جانب سردار نے اقبال کو چشمۂ خورشید کے سیلاب کو نور سے تشبیہ دی ہے اور اقبال کو ایسے اجالے کے مانند بتایا ہے جس کے آگے سارے چراغ کا نور پھیکا پڑ جاتا ہے۔

تلنگانہ میں جو تحریک چلائی گئی اس پر بھی ترقی پسند شعرا کے قلم نے خراج عقیدت پیش کی۔ چنانچہ سردار اور مخدوم نے بھی اس موضوع پر نظم تخلیق کی جو 'تلنگانہ' کے عنوان سے ہی دونوں کے یہاں موجود ہے۔ کسانوں سے حد سے زیادہ کم قیمت پر اناج کی جبری آخری ضبط تھی، آزادی کے بعد بھی کسانوں اور مزدوروں کے مسائل حل نہیں ہوئے۔ اس کے بعد عوام کا صبر ٹوٹ گیا اور وہاں کسانوں کی انقلابی تحریک کا آغاز ہو گیا۔ سردار جعفری اور مخدوم محی الدین نے قومی حکومت کے خلاف صف آرائی کے لیے مزدوروں اور کسانوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس نظم میں ان کا موضوع بھی ایک ہے اور فکر و لہجے میں بھی یکسانیت نظر آتی ہے۔ دونوں شعرا پورے جوش اور مزاحمتی و احتجاجی

آہنگ کے ساتھ نظم کا آغاز کرتے ہیں ۔

دیار ہند کا وہ راہبر تلنگانہ
بنا رہا ہے نئی اک سحر تلنگانہ

بلا رہا ہے بہ سمت دگر تلنگانہ
وہ انقلاب کا پیغامبر تلنگانہ

سردار جعفری کچھ یوں کہتے ہیں ۔

یہ مجاہد ، یہ بہادر ، یہ جیالے ، یہ کسان
برق و باراں کے حریف
جن کے چہروں پہ ہے دھرتی کا سکوں اور وقار
اور ہتھیلی میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
کیاریاں بوتے تھے اشکوں کی لہو کاٹتے تھے

مختصر یہ کہ سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی اور بہت سی نظمیں ہیں جن میں ان کے مزاحمتی، احتجاجی اور انقلابی رویوں میں مماثلت نظر آتی ہے۔مشور ومعروف نقاد مجنوں گھورکھپوری سردار جعفری کے پہلے شعری مجموعے ''پرواز'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''ترقی پسند شاعروں کی جماعت میں علی سرداراورمخدوم محی الدین صرف دوہستیاں ایسی نظر آتی ہیں جن کی شاعری میں دورتک کہیں انفرادیت کی مہک محسوس نہیں ہوتی۔ان لوگوں کا سارافن غیر شخصی ہے اوراس فن کو یہ لوگ فن لطیف بنانے میں حیرت ناک حدتک کامیاب ہیں۔'' [1]

---

1 (کلیات سردار جعفری، مرتب علی احمد فاطمی، 2004 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ص:40)

علی سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی نظموں میں مزاحمتی، احتجاجی اور انقلابی آہنگ۔ ایک تقابلی جائزہ

ترقی پسند نظم کو مزید بلندی پر لے جانے والے شعرا میں سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی نظموں میں جس طرح موضوع کے اعتبار سے مماثلت ہے اسی طرح انفرادیت بھی ہے۔ دونوں شعرا کے یہاں بعض ایسی نظمیں موجود ہیں جن کے عنوان بھی ایک ہیں اور ان نظموں میں ان دونوں شعرا کے خیال اور فکر میں بھی مماثلت ہے۔ لیکن ذرا غور سے مطالعہ کرنے اور مزید گہرائی میں جانے پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دونوں شعرا کے یہاں انفرادیت بھی ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں ایسی بھی ہیں جس کے عنوان تو ایک ہیں لیکن اس میں ان دونوں شعرا کے فکر و خیال الگ الگ ہیں، جن میں فرق تو معلوم کیا جا سکتا ہے لیکن کسی کو غلط نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ ادب میں سب کے اپنے اپنے نظریات ہوتے ہیں اور کوئی بھی نظریہ حرف آخر نہیں ہے۔ بہر کیف سب سے پہلے یہاں ان لفظوں کا تقابلی جائزہ مزاحمت اور احتجاج کے حوالے سے پیش کیا جا رہا ہے جن کے عنوان تو ایک ہیں اور کچھ حد تک موضوع بھی لیکن ان میں دونوں شعرا کی فکر جداگانہ ہے۔

نظم ''جوانی'' سردار اور مخدوم دونوں شعرا کے یہاں ایک ہی عنوان سے ہے اس کا موضوع بھی تقریباً ایک ہی ہے لیکن پھر بھی دونوں کی نظموں میں خیالات کا فرق ہے۔ مخدوم کے یہاں بچپن ،لڑکپن سے جوانی تک کے سمٹ جانے والے ہر جذبات کا بیان ہے جن سے بچپن اور جوانی کی کیفیت میں فرق نظر آتا ہے۔ دوسری طرف سردار کے یہاں بھی اسی طرح کی کیفیت ہے۔ ان کے یہاں بچپن کے خوابیدہ جذبات ہیں جو عالم جوانی کے منتظر ہیں۔ پھر بھی دونوں میں کافی فرق ہے۔ موضوع کے لحاظ سے مخدوم کے یہاں پوری نظم رومانیت کی عکاسی کرتی ہے۔ انہوں نے بچپن سے لیکر جوانی تک انسان کی کیفیات و احساسات کس حد تک تبدیل ہوتے ہیں اس کا ذکر بڑے ہی دلکش انداز میں کیا ہے۔ جوانی کا وہ ناز و انداز، وہ اترانا، وہ بل کھانا، وہ کمسنی کے قصے، وہ بننا سنورنا وغیرہ کو پیش کرنے میں مخدوم نے کمال فن دکھایا ہے ۔

اعضا میں لچک ہے تو ہے اک لوچ کمر میں
اعصاب میں پارہ ہے تو بجلی ہے نظر میں

آنے لگی ہر بات پہ رک رک کے ہنسی اب
رنگین تموج سے گراں بار ہوئے اب

وہ دیکھ کہ کس گل کی مہک پھیلی ہے ہر سو
وہ دیکھ کہ ہے کون رواں بجتے ہیں گھنگھرو

دوسری جانب سردار کے یہاں بھی جوانی کا ذکر ہے لیکن وہ مخدوم سے کافی منفرد ہے۔ ان کے یہاں آغاز میں تھوڑی سی رومانیت دیکھنے کو ملتی ہے لیکن بعد میں ان کا انداز اور لب ولہجہ انقلابی ہوجاتا ہے۔ان کے یہاں جوانی عمر کی وہ کیفیت ہے جہاں خوابیدہ شرارے جاگ اٹھتے ہیں اور نفس کے تار کو چھیڑنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ان کی شاعری میں ان کے جاہ وجلال کے نعرے بلند ہونے لگتے ہیں اور یہ بلند آہنگی ہی ان کی نظموں کو مخدوم کی نظموں سے الگ کرتی ہے۔سردار کی نظم میں قیدیوں اور یتیموں کی صدائیں موجود ہیں۔آگے چل کر اشتراکیت کو شاعری میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سلطان کو تخت سے اٹھا کر کسان کو بٹھا دیا ہے۔ پھر اشتراکی فکر سے متاثر ہوکر سرمایہ داروں کے خلاف نفرت کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے خلاف احتجاج کرتے ہیں ۔

مرے نعروں میں ہے جاہ جلال جوش طوفانی
میری آہنوں پہ بل کھاتی ہوئی موجوں کی طغیانی

پکڑ کر ہاتھ مسند سے اٹھا دیتا ہوں سلطاں کو
بٹھا دیتا ہوں لا کر تخت پر قیصر کے دہقاں کو

مرے ہونٹوں پہ نغمے کانپتے ہیں دل کے تاروں کے
میں ہولی کھیلتا ہوں خون سے سرمایہ داروں کے

مخدوم کی نظم 'استالن' میں وہی موضوع ہے جو سردار کی نظم 'استالن کتھا' میں ہے۔سب سے پہلے یہ بات قابل غور ہے کہ نظم 'استالن' مخدوم کی تخلیق نہیں ہے بلکہ قزاقستان کے بوڑھے تاتاری

جمبول جابر کی نظم کا ترجمہ ہے۔اس نظم میں مخدوم نے خود کو تماشائی بنا کر میدان جنگ میں اترنے پر احتجاج کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اگر میں میدان جنگ میں محض ایک تماشائی بنے رہنے کے لیے جنگ میں حصہ لوں تو اس سے اچھا ہے کہ میں جنگ میں حصہ ہی نہ لوں۔میں اس جنگ میں مجاہد کی حیثیت سے آیا ہوں اور میں اپنی جنت کو جہنم کے حوالے نہیں کرسکتا۔یہاں میں سے مراد ہر وہ شخص ہے جو لڑنے کی طاقت رکھتا ہو،خواہ وہ لڑائی میدن جنگ کی ہو یا سرمایہ دارانہ جاگیردارانہ نظام کے خلاف۔ہر ایک کو وطن کی خاطر تلوار اٹھانا لازم ہے ؂

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کردوں
کیا مجاہد نہ بنوں؟
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر
میرے پیارے مرے فردوس بدن کی خاطر

سردار جعفری کی ''استالن کتھا'' ان کی خود تخلیق کردہ ہے جس میں انہوں نے بھی مخدوم کی طرح استالن کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔لیکن سردار نے اس نظم میں متعلقہ عہد کے ہندوستان اور روس کے حالات کا موازنہ بھی پیش کیا ہے۔روسی راجہ (ژار) اور ہندوستانی رہنماؤں کو انسانی خون کا پیاسا بتایا ہے۔اشعار دیکھیں ؂

آزادی کے لڑنے والو ، سنو کتھا استالن کی
سارے جگ میں جس کے دم سے اجیاری ہے لینن کی

روس کی پرجا بھوکوں مرتی جیسے ہند کی پرجا آج
روس کا راجہ لہو کا پیاسا جیسے ہند کا نیتا آج

لینن اور استالن نے کس طرح مزدوروں کو متحد اور مجتمع کیا،انہیں آزادی کے خواب دکھائے اور کیسے غریب مزدوروں نے لال پرچم تلے اپنی پلکوں کی سارے خواب چن کر رکھ دیے۔پوری نظم اشتراکی نظام کی وکالت کرتی ہے اور ہندوستانی عوام سے اشارتاً اس انقلاب سے سبق لینے کا

درس بھی دیتی ہے۔ پوری نظم سردار کے باغیانہ اور مزاحمتی رویوں کی عکاس ہے۔

نظم ''شاعر'' میں مخدوم اور سردار نے ایک ہی موضوع پر بات کی ہے۔اس میں دونوں شعرا کے یہاں بڑی عمدہ منظر کشی دیکھنے کو ملتی ہے۔اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قدرت کے کن کن چیزوں سے شاعر وجود میں آیا ہے۔شاعر قوس قزح کی رنگت سے نکھر گیا ہے۔اور نور تاروں سے لیا ہے۔ پھولوں کی مہک اور شاخوں سے لچک اور جنگل کی دوشیزہ کلیوں نے اپنا سرمایہ تک دے ڈالا۔مخدوم کے یہاں رومانی رنگ حاوی ہے وہ ایک ایسے شاعر کا ذکر رہے ہیں جیسے وہ کسی شاعر کی تخلیق ہوں۔

بکھری ہوئی رنگیں کرنوں کو آنکھوں سے چن کر لاتا ہوں
فطرت کے پریشاں نغموں سے اک اپنا گیت بناتا ہوں

فردوس خیالی میں بیٹھا اک بت کو تراشا کرتا ہوں
پھر اپنے دل کی دھڑکن کو پتھر کے دل میں بھرتا ہوں

سردار نے بھی آغاز میں اسی طرح کے خیالات کو شامل نظم کیا ہے جس میں رومانیت کی چاشنی نے چار چاند لگا دیے ہیں لیکن بعد میں انہوں نے سنجیدگی اختیار کر لی۔ایک شاعر کی شخصیت میں کن کن چیزوں کی شمولیت ہے اس کا بیان بھی بڑی تلخی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ایک شاعر جو کہ اپنے جذبات کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہے تو آپ انہیں داد دیں گے لیکن کسی کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ یہ جذبات تو شاعر کے اپنے ہیں نہ۔کتنے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے اسے اپنے سوئے ہوئے جذبات کو جگانا پڑتا ہے۔اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کیا سے کیا بن جاتا ہے ۔

کذب کی تاریک راتوں میں صداقت کا ظہور
وقت کے سادہ افق پر رنگ صبح زرنگار
موت کی پر ہول وادی میں ہوں طوفان حیات
غم کے سینے پر مسرت کا سنہرا آبشار

مخدوم کی نظم ''نیا سال'' اور سردار کی نظم ''سال نو'' نئے سال کے موضوع سے وابستہ ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ ہر نیا سال ایک نئی امید،نئی آرزو لے کر آتا ہے۔پھر وہ اس دنیا کو مسخری کہنے

لگتے ہیں اوراس کا مزاق اڑاتے ہیں کہ یہ دنیا ہر نیا سال اس لیے مناتی ہے کیونکہ اس میں کچھ امیدیں، کچھ خواہشیں چھپی ہوتی ہیں لیکن یہ خواہشیں ادھوری ہی رہیں اور نیا سال آ گیا تو یہ پوری نہیں ہورہی ہیں۔سب وہی پرانا ہے اور جب دنیا نئے سال میں خود کونئی کہتی ہے تو اس کا مزاق بنایا جاتا ہے ۔

کروڑوں برس کی پرانی
کہیں سال دنیا
یہ دنیا بھی کیا مسخری ہے
نئے سال کی لاش اور لٹے
بہ صد طنز ہم سب سے یہ کہہ رہی ہے
میں تو نئی ہوں
ہنسی آرہی ہے

سردار جعفری بھی نظم کا آغاز بڑی خوش دلی سے کرتے ہیں۔اس زمانے کے تہذیب کے متعلق کسی نے ٹیلی فون پر ان کو سال نو کی مبارک باد دی اوراس کے ساتھ ہی شاعر کی تمنا رقص کرنے لگتی ہے اور تخیل گنگنانے لگتا ہے۔ان کا تصور انہیں ایک نئے احساس کی جنت میں لے آتا ہے۔نئے سال کے ساتھ نئی آرزوئیں نئی امیدیں بھی جنم لیتی ہیں اور نہ جانے کتنے نئے خواب آنکھوں میں بسنے لگتے ہیں۔ پرانے سال کی اچھی بری سبھی یادیں سمٹ سی جاتی ہیں اور نئے دن کا نیا سورج آسمان پر جگمگانے لگتا ہے۔سردار نے منظر کشی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔نئی خواہشیں کس قدر اپنی جگہ بنارہی ہیں۔ان سب کو شاعر نے نہایت پر لطیف انداز میں پیش کیا ہے لیکن آخر میں آ کر وہ اپنا نظریہ واضح کرتے ہیں اور بالکل سنجیدہ ہوجاتے ہیں۔ نئے سال کی خوشی کے ساتھ بہت سارے غم بھی منسوب ہیں ،شاعر کواس بات کا احساس ہوتا ہے۔ ان کو غم ہے تو اس بات کا کہ اس نئے سال میں بھی ہمارا ملک اب بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور ہمارے دو محکومی کی مدت بڑھتی جارہی ہے۔ یہ احساس ان کی خوشی کو غم میں تبدیل کر دیتا ہے۔سردار کو یہ بھی فکر ہے کہ اب ان کو

نہ جانے اور کتنے سال غلامی دیکھنی ہوگی۔نہ جانے کب ملک آزاد ہوگا اور ہم پر سے حکومت کی سختی ختم ہوگی۔ان کو اپنے ہم وطنوں سے شکایت بھی ہے کہ وہ ملک کی آزادی کے لیے اس طرح سے کام نہیں کررہے ہیں جس تیزی سے کرنا چاہیئے اس طرح سست گامی سے کام نہیں چلنے والا۔ یہاں ان کے انداز میں مزاحمت کے ساتھ شکوہ بھی ہے اور مخدوم کے یہاں مزاحمت کے ساتھ طنز ہے ۔

ہمارے دور محکومی کی مدت بڑھتی جاتی ہے
غلامی کے زمانے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے

یہی انداز گر باقی ہیں اپنی سست گامی کے
نہ جانے اور کتنے سال اور آئیں گے غلامی کے

سردار اور مخدوم نے ''غالب'' کے عنوان سے بھی نظم تخلیق کی ہے۔مخدوم نے غالب سے مخاطب ہوکر دہلی کی زوال پذیر معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے۔وہ بات تو غالب سے کررہے ہیں لیکن اس کے پس پردہ دہلی کے حالات بیان کررہے ہیں۔غالب سے کہہ رہے ہیں کہ اگر تم اس وقت دلی میں آ جاؤ تو تم خود کو یہاں اجنبی کی طرح محسوس کروگے کیونکہ اب کی دلی اور تمہارے زمانے کی دلی میں بڑا فرق آ گیا ہے۔تم یہاں کے راستے بھٹک جاؤگے اور منزل تک رسائی نہ ہو پائے گی۔ یہاں کے دن خیس کے مانند ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں اور رات دامن تہی کی طرح ہوگئی ہے۔ انہوں نے دن کو خیس اور رات کو دامن تہی سے تشبیہ دی ہے۔یہ اشارے دہلی کی تباہ و بربادی کی طرف ہیں۔مخدوم کا کہنا ہے کہ آج دہلی بالکل اجڑ چکی ہے اور یہاں اس قدر تبدیلی آ چکی ہے کہ وہ غالب کے زمانے سے بالکل مختلف ہے۔اس میں مخدوم کا احتجاج صاف طور پر نظر آتا ہے جو کہ طنز کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے ۔

وہ زباں جس کا نام ہے اردو
اٹھ نہ جائے کہیں خوشی کی طرح

ہم زباں کچھ ادھر ادھر سائے
نظر آئیں گے آدمی کی طرح

تم تھے اپنی شکست کی آواز
آج سب چپ ہیں منصفی کی طرح

نظم ''غالب'' میں سردار جعفری غالب کی شاعرانہ عظمت کو بیان کررہے ہیں۔ان کے یہاں غالب کو اس بلندی پر بٹھایا جارہا ہے جہاں تک کسی کی بھی رسائی نہیں ہوئی ہے۔ جہاں صرف چاند اور تارے چمکتے تھے جس بلندی پر کہکشاں کا مقام ہے، غالب کو وہ عروج و مقام حاصل ہے۔ یہاں سردار نے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور غالب کو داؤدِ سخن سے تشبیہ دی ہے۔ غالب کے بحر بیکراں تخیل کو لامحدود آسمان کے مانند بتایا ہے اوران کا نغمہ،نغمہ نہیں بلکہ ساحری ہے جس کو سن کر ہر کوئی دنیا بھول جاتا ہے۔سردار غالب کے شعر کو معجزہ قرار دیتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ ان کی شاعری صداقت کی ترجمان ہے،حقیقت کی عکاس ہے۔مختصر یہ کہ غالب کی شاعری میں سب کچھ ہے اس کے ہم پلہ کوئی اور نہیں۔غالب نے اپنی شاعری کے ذریعہ دماغ کے بند دریچوں کو کھول دیا۔سردار کہتے ہیں کہ ہم سبھی شعراء غالب کی طرح ہی شاعری کرنے کے خواہش مند ہیں اور غالب کی شاعری سے متاثر ہیں۔سردار کے یہاں رومانیت ہے اوراس نظم میں مخدوم نے جو طنزیہ لہجہ اختیار کیا ہے وہ بھی بڑے ہی دل نشیں انداز میں وہ قابلِ تحسین ہے۔

مخدوم کی نظم ''نیند'' جو سردار کے یہاں بھی اسی عنوان سے ہے، اس میں مخدوم نے بے حد رومانی انداز اختیار کیا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ وہ شدید نیند کے خمار میں ہیں اوراپنی بے کیف تنہائی کو بڑا رنگین خیال بنا کر رہے ہیں۔نیند کی جنبش ان کی پلکوں کو چھورہی ہیں اوراس کے پیراہن کی سرسراہٹ گنگنا رہی ہے۔آنکھوں میں کسی شوخئ لب کا تصور ہے جس کے نشے کی وجہ سے شاعر کو سخت نیند آرہی ہے۔ بڑے ہی سکون کا ماحول ہے اور نیند کا خمار اس قدر بڑھ گیا ہے اس کے قوس وقزح کی چھاؤں میں پہروں سونے کی تمنا ہے۔گویا پوری نظم پر رومانیت کا خمار ہے۔

مخدوم کے بہ نسبت سردار کے یہاں ایک منفرد موضوع اور خیال وہ بھی منفرد لہجے میں منظر عام پر آتا ہے۔سردار کی نظم ''نیند'' انہوں نے اپنے بچے کی پہلی سالگرہ پر اپریل 1950 میں لکھی تھی۔ جب وہ سینٹرل جیل ناسک میں قید تھے۔دوران اسیری انہوں نے قید خانے کی راتوں میں جو

بھی محسوس کیا وہ نظم میں بیان کیا ہے۔وہ رات کی تنہائیوں کومحسوس کرتے ہیں جس کیفیت میں نیند کا خمار غالب ہوتا ہے۔لیکن پھر بھی وہ نیند کی آغوش میں نہیں جانے پاتے اور کہتے ہیں ؂

رات خوبصورت ہے　　　نیند کیوں نہیں آتی

پھر آگے نیند نہ آنے کا سبب بھی بیان کررہے ہیں ۔اس رات کی سیاہی میں دن کی ساری روشنی کھوگئی ہے جس کے ساتھ سارے ارمان،ساری امیدیں بھی سوگئی ہیں لیکن بےقراری ہے کہ سونے نہیں دیتی۔کہیں لوہے کے کڑے ہاتھوں میں شور مچارہے ہیں تو کہیں جکڑے پیر کی بیڑیوں سے جھنکاریں آرہی ہیں۔کہیں قیدیوں کی سانسوں کی تیزاوردھیمی آوازیں پریشان کررہی ہیں۔ کہیں جیلروں کی بدکاریاں اوران کی گالیوں کی آوازسونے نہیں دیتی۔ہم یہاں اتنے بےبس ہیں کہ سوائے فریاد کے اور کچھ نہیں کرسکتے ؂

دن کی خشمگیں نظریں　　　کھو گئیں سیاہی میں
آہنی کڑوں کا شور　　　بیڑیوں کی جھنکاریں
قیدیوں کی سانسوں کی　　　تند و تیز آوازیں
جیلروں کی بدکاری　　　گالیوں کی بوچھاریں
بے بسی کی خاموشی　　　خامشی کی فریادیں

نظم ’’نہرو‘‘ مخدوم کی شاندارنظم ہے جس میں انہوں نے کافی اختصار کے ساتھ ہمارے آزاد ہندوستان کے پہلے وزیراعظم ،پنڈت جواہرلال نہرو کی شان میں رقم خراج پیش کیا ہے۔مخدوم نے بہت ہی کم الفاظ میں جواہرلال نہرو کی عزت وعظمت کا بیان کیا ہے۔انہوں نے نہروکوصندل وگل کا غبار اور مشت بہار سے تشبیہ دی ہے جو وادئ جنت میں جا کر اپنی خوشبو بکھیر رہا ہے۔زندگی اور موت تو قدرت کا قانون ہے ،جس سے ایک دن سبھی کوگزرنا پڑتا ہے۔نہرو بھی اس شش جہات عالم کا اسیر اب ہم سے بہت دور جا چکا ہے۔نظم ملاحظہ فرمائیں ؂

ہزار رنگ ملے ایک سبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں

مگر وہ صندل و گل کا غبار ،مشت بہار
ہوا ہے وادی جنت نشاں میں آوارہ

ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے بہت دور جستجو بن کر

سردار جعفری کی نظم ''جواہر لال نہرو کے نام'' مخدوم کی نظم بالکل مختلف ہے۔اس میں جعفری ہندوستانیوں کو للکار رہے ہیں کہ اس وقت ساری دنیا ہنگاموں سے معمور ہے پھر بھی ہندوستانیوں کے سینوں میں کوئی طوفان برپا نہیں ہے۔ ہندوستانیوں کو بس یورپ کی تباہی کا ہی خیال ہے مگر وہ اپنی بربادی کی کوئی خبر نہیں رکھتے۔وہ ابھی خود کی تباہی سے آشنا نہیں ہیں۔پھر انگلینڈ کی تہذیب کے متعلق کہتے ہیں کہ انگلینڈ کی تہذیب جو آج ہندوستان میں تیزی سے پھیل رہی ہے وہ انگریزوں کے لیے کتنی عزیز ہے اور ایک ہم ہندوستانی ہیں جو اپنی تہذیب سے بے نیاز ہیں،ہم غیروں کی تقلید کر رہے ہیں اور اپنی تہذیب کو ترک کر رہے ہیں۔آج ہم پر انگریزوں کی حکومت ہے لیکن کل جب ہم آزاد ہو جائیں گے تب بھی وہ مکمل آزادی نہ ہوگی۔ہم تب تک ان کی تہذیب میں اس طرح گھل مل جائیں گے کہ ہم اپنی کوئی حیثیت قائم نہ کر پائیں گے۔ پوری نظم احتجاج سے بھری پڑی ہے جس میں ماضی کی عظمت اور قدیم تہذیب کی حفاظت کا درس بدرجہ اتم موجود ہے۔ چند بند پیش نظر ہیں ۔

یوں تو ہنگاموں سے معمور ہے دنیا ساری
سینۂ ہند میں بھی کوئی شرر ہے کہ نہیں؟

دھیان مجھ کو بھی ہے یورپ کی تباہی کا مگر
تم کو اپنی بھی تباہی کی خبر ہے کہ نہیں؟

کتنا گل رنگ ہے انگلینڈ کی تہذیب کا جام
اس میں کچھ ہند کا بھی خون جگر ہے کہ نہیں ؟

رات کے ڈوبتے تاروں کا یہ ماتم کیسا
دیکھنا زیرِ افق رنگ سحر ہے کہ نہیں ؟

مذکورہ بالا نظموں کا مختصر جائزہ پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ موضوع کو بنیاد بنا کر سردار جعفری اور مخدوم کی شاعری کا تقابلی مطالعہ صحیح طرح سے ہو سکے کیونکہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ تمام ترقی پسند شعرا کے یہاں موضوع اور طرز اظہار میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔عقیل احمد صدیقی اپنی کتاب ''جدید اردو نظم ۔نظریہ وعمل'' میں اس خیال کی تائید کرتے ہیں:

> ''جہاں تک ترقی پسند موضوعات کا تعلق ہے تو اس میں تمام شاعروں کے درمیان یکسانیت پائی جاتی ہے ۔مزید یہ کہ شاعری میں موضوعات ، دوسرے لفظوں میں خیالات وجذبات اہم ضرور ہیں لیکن شاعری کا حقیقی واسطہ طرز اظہار سے ہے۔طرز اظہار اور اسلوب بیان میں بھی بیشتر ترقی پسند شاعری یکساں لفظیات کے سبب یکسانیت کی شکار ہے۔'' [۱]

عقیل احمد صدیقی کا یہ خیال کچھ حد تک درست معلوم ہوتا ہے لیکن مزید تحقیق کی کسوٹی پر پوری طرح کھرا نہیں اترتا۔تمام ترقی پسند شعرا کے یہاں جتنی یکسانیت ہے اتنی انفرادیت بھی ہے خواہ وہ موضوع کے اعتبار سے ہو یا طرز اظہار کے لحاظ سے۔ یہاں سردار اور مخدوم کی نظموں کا انتخاب کیا گیا ہے جن کا عنوان ایک ہے۔ظاہر ہے کہ عنوان ایک ہے تو موضوع بھی ایک ہی ہوگا لیکن ایسا نہیں ہے۔ان نظموں میں موضوع کے لحاظ سے مماثلت بہت کم ہے بعض نظمیں تو موضوع کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں۔

تقابلی جائزہ ایک نہایت ہی مشکل عمل ہے اور جب وہ دو شخصیتوں کے درمیان ہو تو مزید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔سب سے پہلے تو ذہنی طور پر تیار رہنا پڑتا ہے کہ یہ کام عمل میں لانے کے امکان ہیں کہ نہیں۔ پھر اس کے لیے کچھ شرطیں لازم ہیں۔پہلی تو یہ کہ جن کا تقابلی جائزہ لیا جائے ان میں کچھ مماثلت بھی ہونی چاہیئے ۔جب تک مماثلت ثابت نہیں ہوگی تب تک انفرادیت

۱۔ (جدید اردو نظم نظریہ وعمل (1936-1970) عقیل احمد صدیقی، 1990، ایجوکیشنل بک ہاؤس

کے راستے ہموار نہیں ہوں گے دوسری شرط یہ ہے کہ دونوں کا بغور مطالعہ کیا جائے اور اس شخص میں صحیح فیصلہ لینے کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔تیسری یہ کہ آپ اپنی بات کو مثالوں اور دلیلوں کے ذریعہ واضح کرے جس سے حقیقت تک رسائی ہونے میں آسانی ہوجائے۔چوتھی بات یہ کہ جو بات تحقیق کی کسوٹی پر کھری اترے اسے بغیر جھجک اور بغیر ذاتی بغض یا ناپسندیدگی کے پوری ایمانداری اور دیانت داری سے پیش کیا جائے۔اس طرح سے کسی بھی موضوع کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی اور تحقیق کا معیار بھی برقرار رہے گا۔

سردار جعفری کی نظم ''تعمیر نو'' اور مخدوم محی الدین کی نظم ''جہان نو'' میں کچھ حد تک مماثلت ہے وہ یہ ہے کہ دونوں شعرا فرسودہ رواج اور نظام سے ہٹ کر ایک نیا جہان قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں نیا نظام ہو۔دونوں کا خیال ایک ہے لیکن نظم کے حوالے سے جو بات کہی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ مخدوم کی نظموں میں ناآسودگی ،بغاوت،احتجاج اور انقلاب جگہ جگہ موجود ہے۔مفلسی اور کسمپرسی نے بکھرنے کے بجائے ایک منظّم فکر سے مالا مال کردیا۔مخدوم نے اپنی شاعری کے ذریعہ صدائے احتجاج بلند کیا۔بھوکوں، ناداروں،مفلسوں اور کمزوروں کے مسائل کو اپنی شعری کائنات میں جگہ دی جو ترقی پسند منشور کے عین مطابق تھا جو ایسے نظام کی طرف داری کرتا ہے جو مساوات اور برابری کی تعلیم پر عمل پیرا ہو۔اس نظام پر عمل پیرا جسے مخدوم نے ''جہان نو'' کہا ہے۔اس نظم میں مخدوم کا ''جہان نو'' منعکس نظر آتا ہے ؎

نغمے شرر فشاں ہوں اٹھا آتشیں رباب
مضراب بے خودی سے بجا ساز انقلاب

معمار عہد نو ہو ترا دست پر شباب
باطل کی گردنوں پہ چمک ذوالفقار بن

مخدوم ایک نیا جہاں قائم کرنے کے خواہش مند ہیں۔جہاں انسان،انسان کے کام آئے وہ ایک دوسرے کے دشمن نہ ہوں بلکہ انسانی دوستی کا جذبہ پیدا ہو۔سردار جعفری بھی اسی خیال سے متاثر ہیں۔ان کی نظم ''تعمیر نو'' میں سردار جعفری نے انقلاب روس کی جی کھول کر پذیرائی کی ہے۔سردار نے انقلاب روس میں بکھرے اور ٹھکرائے ہوئے مفلس اور درماندہ عوام کے لیے امید کی

کرن کا جلوہ دیکھا۔جس نے زندگی کونئی تجلی اورنورعطا کیا،جس نےعمل کی راہوں میں حوصلے کی مشعل روشن کی۔جس نےظلم کےنشیمن پر بجلیاں گرائیں۔اس انقلاب نے ان کےسینوں پرسرد قلم سے' انقلاب' لکھ دیا۔اس نے پرانی دنیاکے رسم ورواج جس میں ظلم واستبداد کا بول بالا تھا کوآن کی آن میں تہہ وبالا کردیا۔غلاموں کولذت آزادی سے آشنا کیااور بتایا کہ وقت کی باگ ڈورمحنت کش عوام کے ہاتھوں میں ہے۔اس طرح انقلاب روس میں سردارکودنیاکے حسین ترین مستقبل کا نور دکھائی دیتاہے ۔

انقلاب روس نے مشرق میں چھیڑا ہے رباب
ایشیاء کی روح میں ہے زندگی کا اضطراب
زندہ باد اے انقلاب
عارض لعل و بدخشاں پر کیسی آب و تاب
سرخ رو خون شہیدان وطن سے ہے گلاب
زندہ باد اے انقلاب

سردارجعفری اس نظم میں اس انقلاب کو زندہ باد کہہ رہے ہیں جس کے وہ ہمیشہ سے منتظر تھے۔منظرنگاری سے پوری نظم اس طرح متاثر ہے کہ جیسے واقعی ایک بڑا انقلاب آیاہواور جس سے مناظر قدرت بھی تبدیل ہوگئے ہوں۔ذرہ ذرہ آزادی کے جذبے سے بھرپور ہےاور کارخانے بھی ایک نیانغمہ گارہے ہیں ۔

ذرہ ذرہ سوز آزادی سے دے اٹھا ہے لو
کارخانے گارہے ہیں نغمۂ تعمیر نو
زندہ باداے انقلاب

سردار نے محنت کش عوام کی عظمت بیان کی ہے ساتھ ہی یہ بھی بتایاہے کہ آدمی کے دست میں ہی اس کی تقدیر ہے جسے وہ خود بناتا ہے۔وہ جس ہاتھ سے محنت کرتا ہے اسی ہاتھ سے تلوار بھی اٹھاسکتاہےاورظلم کے خلاف بغاوت بھی کرسکتاہے۔یہاں سردار کا احتجاجی رویہ قابل تحسین ہے ۔

اہل محنت کا نہال آرزو ہے بارود

آدمی کے دست قدرت میں ہیں فطرت کے ثمر

زندہ باد اے انقلاب

مخدوم کے یہاں بھی انسپریشن کی کمی نہیں ہے اگرچہ وہ رومان اور انقلاب کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں اس لئے ان کی انقلابی شاعری بھی رومانیت کے اثر سے خالی نہیں ہے۔مخدوم ہمیشہ سے ہی انقلاب کے خواہاں تھے وہ پرانے نظام کو درہم برہم کر دینا چاہتے ہیں اور اس کی جگہ نیا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے انقلاب کی ضرورت ہے۔لیکن یہ انقلاب کوئی عام انقلاب نہیں ہے۔مخدوم نے اسے محبوب کے حسین ترین پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔انقلاب کا ایسا رومانی تصور دوسرے شعرا کے یہاں مشکل سے ملے گا۔وہ ایسے انقلاب کی بات کرتے ہیں جس کا سبھی کو شدت سے انتظار ہے۔زمین و آسمان اس انقلاب کے لیے کب سے بے قرار ہیں اور سرراہ گزرنے والوں کا ہجوم اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب ان سے اور انتظار نہیں ہو رہا ہے ؎

اے جان نغمہ ، جہاں سوگوار کب سے ہے

تیرے لیے یہ زمین بے قرار کب سے ہے

ہجوم شوق سرے رہ گزار کب سے ہے

گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

اس نظم کا سارا انسپریشن صرف ایک مصرعہ ''گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے'' میں ڈھل گیا ہے۔بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

''وہ انقلاب کا انتظار بھی اس طرح کرتا ہے جیسے کوئی کسی خوش جمال محبوب کا انتظار کرتا ہے۔'' [1]

ایک بہت اہم بات جو سردار کو مخدوم سے الگ کرتی ہے وہ ہے سردار جعفری کی طویل نظمیں جیسے 'نئی دنیا کو سلام' ایشیا جاگ اٹھا وغیرہ۔نظم 'نئی دنیا کو سلام' فرنگی ظلم سے پیدا شدہ تاثرات کا نتیجہ ہے۔اس کے کردار، کردار نہیں بلکہ علامتیں ہیں جس میں ایک باغی مرد جاوید اور اس کی بیوی مریم کی

---

1 (اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی، 2007، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ص: 411)

کہانی ہے جو برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔سردارجعفری اس نظم کے ذریعے فرنگی ظلم کے خلاف ہندوستانیوں کی جدوجہد کومنظرعام پرلاتے ہیں اور بے حد خوبصورت علامتوں کے سہارے مجاہدین آزادی کواپنی جدوجہد آزادی کو جاری وساری رکھنے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ برطانوی حکومت سے ٹکر لینے کے جرم میں، جاوید کو پھانسی کی سزادی جاتی ہے۔ ادھرمریم حاملہ ہے اس لیے جاوید نے اپنے مرنے سے پہلے اپنے ہونے والے بچے کے لیے ایک خط لکھا ہے جس میں ہندوستان میں ایک نئی دنیا کی جھلک نظر آتی ہے، جہاں نئی آزادی کی فضا قائم ہوگی۔وہ بچہ جوابھی اس دنیامیں آیا بھی نہیں ہے ،وہ نئی دنیا کی علامت ہے، بشارت ہے، یہاں سردارجعفری علامتوں کے ذریعے ہندوستانیوں کو بیدارکرنے کی کوشش وسعی کررہے ہیں۔اورانہیں یہ امید بھی دلا رہے ہیں کہ آنے والاکل آج سے بہتر ہوگا۔اس نظم کے متعلق پروفیسرسیدمحمدعقیل رضوی فرماتے ہیں:

> ''نئی دنیاکوسلام'اس طرح ایک خالص جذباتی تمثیل نہیں بلکہ ایک آہنگ انقلاب بھی ہے جواس وقت کے ہندوستان میں عوام کوایک طرح کے مسلح انقلاب کے لیے تیارکرتی ہے جس کے لیے عوام ہرطرح کی قربانی دینے کے لیے تیار رہنا چاہئے اور یہ منزل چکبست ،اقبال اورتمام وطن پرستوں کی شاعری سے آگے کی منزل ہے۔'' [1]

اسی طرح ''ایشاجاگ اٹھا'' بھی سردارجعفری کی طویل نظم ہے لیکن یہ اتنی بھی طویل نہیں جتنی 'نئی دنیاکوسلام' ہے۔سردارنے سینٹرل جیل ناسک میں اسیری کے دوران یہ نظم تخلیق کی۔ پوری نظم میں سردارجعفری نے ایشیا کا تاریخی تجزیہ پیش کیا ہے۔سب سے پہلے ''حرف اول'' میں ہندوستان کوآزادی ملنے کی خوشی کا ذکرکیا ہے۔پھرایشیاکے مختلف کارناموں کوبھی پیش کیا گیا ہے۔ انگریزوں کی آمد،ان کی حکومت اوراستحصال کا ذکربھی کیا گیا ہے کہ کس طرح سے برطانوی حکومت کے دورمیں ہندوستان بھوک،افلاس،قحط اورسماجی وسیاسی استحصال سے دوچارتھااوراس سے عوام کس طرح متاثر ہوئے اس کا بڑے ہی انقلابی انداز میں ذکرکیا ہے۔اس کے بعد سوویت یونین کا

ا (سہیل سردارجعفری نمبر۔جلد۔2،شمارہ10-9،ستمبر،اکتوبر2014۔کولکاتا۔ص:182)

ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں جو کہ ان کی شاعری کا اہم جز ہے ،اسے ساری دنیا کی پریشانی ختم کرنے والا نظام بتاتے ہیں جو انہیں استحصال سے نجات دلا کر ظلم وستم بھی مٹائے گا۔اس طرح سوویت یونین کے ذریعہ عوام میں بیداری اور ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کا سبق دیا جارہا ہے۔مخدوم کے یہاں اس طرح کی طویل نظمیں نہیں ہیں ۔۔حالانکہ ان کے یہاں موضوع اور مواد کی کمی نہیں ہے لیکن انہوں نے وہی بات جو سردار جعفری کہتے ہیں اس کو بڑے ہی مختصر الفاظ میں اس طرح کہہ دیا ہے کہ بات سیدھے لوگوں تک پہنچ جاتی ہے۔

سردار کی بعض نظمیں اچھی خاصی طویل ہیں جو موضوع کے اعتبار سے بھی نظموں سے کافی مماثلت رکھتی ہیں۔مثلاً سردار کی ''تعمیر نو''اور مخدوم کی ''جہان نو'' سردار کی ''جواہر لال نہرو''اور مخدوم کی ''نہرو'' سردار جعفری کی ''سال نو''اور مخدوم کی ''نیا سال'' وغیرہ۔

سردار جعفری کی ''تعمیر نو''اور مخدوم کی ''جہان نو'' میں تقریباً وہی بات کہی جارہی ہے۔ مخدوم کو ایک نیا جہان قائم کرنے کے خواہش مند ہیں۔جہاں انسان ،انسان کے کام آئے۔وہی سردار جعفری بھی اسی خیال سے متفق ہیں لیکن وہ اس نظم میں انقلاب روس کی جی کھول کر پذیرائی کرتے ہیں۔سردار کو انقلاب میں روس میں دنیا کے حسین مستقبل کو نور دکھائی دیتا ہے۔یہاں دونوں شاعر ایک نئے جہان کی امید میں ہیں بس فرق یہ ہے کہ وہی بات سردار نے طویل نظم میں کہی اور وہی بات مخدوم کے محض دو بند پر منحصر ہے۔دوسری نظم ''نہرو'' پر تخلیق کی گئی ہے۔سردار جعفری نے ''جواہر لال نہرو کے نام''اور مخدوم محی الدین نے ''نہرو'' کے عنوان سے لکھی۔دونوں نے نہرو کی عظمت بیان کی ہے لیکن سردار کے یہاں طوالت ہے اور اسی بات کو مخدوم نے بڑے ہی کم الفاظ میں بیان کی ہے۔اسی طرح سردار جعفری کی ''سال نو''اور مخدوم کی ''نیا سال'' بھی اسی طرح ہے۔ ان کو یہ امید ہے کہ نیا سال نئی امیدیں،نئی خواہشیں لے کر آئے گا لیکن ان کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ یہ خواہشیں ابھی پوری نہیں ہوسکتیں۔ابھی ہمیں آزادی نہیں ملی ہے ہم اب بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہیں۔اس نظم میں بھی مخدوم نے کم الفاظ کا استعمال کیا ہے۔سردار کے یہاں طوالت ہے۔اب یہ کہنا درست ہوگا کہ سردار کے یہاں بے جا طوالت ہے یا مخدوم کے

یہاں بے اختصار۔خیر مخدوم نے اختصار تو کیا ہے مگر اس دوران انہوں نے اپنے پورے خیال کی وضاحت کی ہے۔عزیز احمد اپنی کتاب ترقی پسند ادب میں مخدوم کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''مخدوم محی الدین کی شاعری،تمام انقلابی شاعری کے مقابلے اپنے خلوص، جوش کردار اور انقلابی جدت کی وجہ سے ممتاز ہے۔خالص شاعری کی حیثیت سے بھی اس کے کھرے ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا۔اور یہ زبان،محاورے اور اوزان کی بے شمار غلطیوں کے باوجود نظمیں تھوڑی ہی ہیں۔لیکن وہ عشقیہ ہوں یا انقلابی ،ایک آتش فشاں اندورونی حرارت ایک سچا مخلص جذبہ ان کا محرک ہے۔'' [1]

اکثر ناقدین کا خیال ہے کہ ترقی پسند شعرا طرز اظہار اور لہجے میں بھی یکسانیت کے شکار ہیں۔ یہ خیال کچھ حد تک درست معلوم ہوتا ہے لیکن پورے طور پر صحیح نہیں ہے۔ترقی پسند تحریک ایک انقلابی تحریک ہے اور اس سے وابستہ شعروادب بھی انقلابی ہے۔اب انقلابی جذبات کے اظہار کے لیے بلند آہنگی لازم ہے اور اس بلند آہنگی کے باعث شعرا کے طرز اظہار اور لہجے میں کہیں کہیں کچھ سختی بھی آ گئی ہے۔لیکن یہ سختی پورے ترقی پسند شعرا کے یہاں نہیں ہے۔بعض شعرا تو سخت سے سخت موضوع کو بڑے نرم الفاظ اور نرم لب و لہجے میں پیش کرتے ہیں۔مثال کے طور پر فیض کو لے لیجئے ترقی پسند شعرا کی صف میں ان کا ایک منفرد انداز اور منفرد لب ولہجہ ہے ؎

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

سردار جعفری اور مخدوم کے یہاں بھی طرز اظہار اور لہجے میں کافی فرق ہے۔سردار کے یہاں لہجے میں سختی زیادہ ہے،ان کی پوری شاعری ہی بلند آہنگی کی ترجمان ہے ان کے بہ نسبت مخدوم کے یہاں یہ سخت مزاجی کم پائی جاتی ہے۔مثال کے طور پر سردار کی نظم 'تغیر' کو لے لیجئے۔اس نظم میں سردار نے ہر سمت ہو رہی تبدیلی کا ذکر کیا ہے جس کے باعث ہر دم، ہر وقت ہر چیز میں تبدیلی

---

[1] (ترقی پسند ادب ، عزیز احمد ، 1945 ، پرو پرائٹر ادارۂ اشاعت اردو حیدر آباد، ص: 137-136)

آ رہی ہے۔ جو چھاؤں ہے وہ ڈھل رہی ہے، صبح سے شام ہو رہی ہے اور ہر رات ختم ہو رہی ہے۔ یعنی قدرتی تبدیلی کی بات ہو رہی ہے جو کہ فطری عمل ہے۔ پانی سے بادل اٹھ رہے ہیں، موجوں سے حباب اٹھ رہا ہے۔ گرم پتھر سے پانی کے ابلتے چشمے پھوٹ رہے ہیں اور ان گرم چشموں سے حرارت بھرے نغمے نکل رہے ہیں۔ جیسے جیسے تبدیلی آ رہی ہے ویسے ویسے زندگی کی آسان راہیں سخت ہوتی جا رہی ہیں۔ جس طرح سے تصویر کے رنگ بدل رہے ہیں اور وہ تخریب سے تعمیر کی جانب سفر طے کر رہی ہے۔ یعنی زندگی کا ہر گوشہ لذتِ تغیر سے آشنا ہو رہا ہے ۔

ہر چیز بدل رہی ہے ہر دم
جو چھاؤں ہے ڈھل رہی ہے ہر دم

جو صبح ہے شام ہو رہی ہے
ہر رات تمام ہو رہی ہے

پانی سے سحاب اٹھ رہا ہے
موجوں سے حباب اٹھ رہا ہے

پتھر سے ابل رہے ہیں چشمے
چشموں سے نکل رہے ہیں نغمے

شاعر کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی میں تغیر کی اہمیت واضح کرے۔ بعد از شاعر نے تغیر کو قانون حیات سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تو قدرت کا قانون ہے کہ انقلاب بے حد ضروری ہے۔ اگر زندگی میں تغیر نہ ہو تو نظام قدرت درہم برہم ہو جائے گا، جو کافی نقصان دہ ہے۔ چنانچہ تغیر کی افادیت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

ہاں اصل ثبات ہے تغیر قانون حیات ہے تغیر

مخدوم بھی ہمیشہ سے تغیر کے خواہش مند تھے وہ پرانے نظام کو درہم برہم کر دینا چاہتے ہیں اور اس کی جگہ نیا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے انقلاب کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ انقلاب کوئی عام انقلاب نہیں ہے۔ مخدوم نے اسے محبوب کے حسین ترین پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

انقلاب کا ایسا رومانی تصور دوسرے شعرا کے یہاں مشکل سے ملے گا۔ وہ ایسے انقلاب کی بات کرتے ہیں جس کا انتظار سبھی کو بڑی شدت سے ہے۔ زمین و آسمان اس انقلاب کے لیے کب سے بے قرار ہیں اور سر راہ گزرنے والوں کا ہجوم اس قدر بڑھ گیا ہے ۔

اے جان نغمہ ، جہاں سوگوار کب سے ہے
تیرے لیے یہ زمین بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سرے رہ گزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

یہاں سردار اور مخدوم کے انقلاب میں کافی فرق ہے۔ سردار کے یہاں جو انقلاب اور تغیر کی بات کی جارہی ہے وہ فطری انقلاب ہے۔ مخدوم کے یہاں جو انقلاب ہے وہ رومان اور انقلاب کا خوبصورت امتزاج ہے۔ سردار کا لہجہ کہیں کہیں سخت ہوگیا ہے۔ وہ اس تغیر کی بات کررہے ہیں جو فطری تو ہے لیکن اس کے لیے بھی انسان کو کافی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ وہ بھی ایک نیا نظام چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے وہ انقلابی رویہ اختیار کرلیتے ہیں۔ اور ان کی شاعری میں جابجا چیخ، پکار اور نعرہ بازی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس مخدوم کے یہاں انقلاب کا رومانی انداز ملتا ہے اور لہجے میں کرختگی کی جگہ نرمی ہے۔ سردار کی ایک اور نظم ''بغاوت'' ہے جو ان کے نظریہ سیاست، سماج کے تئیں ان کے نظریات اور مذہبی خیالات کی تفصیلی وضاحت کی عمدہ مثال ہے۔ سردار نے اس نظم میں زندگی اور سماج سے متعلق ہر منفی اشیا، فکر، خیال اور علامت سے بغاوت کا اعلان کیا ہے ۔

بغاوت اپنی آزادی کی نعمت کھونے والوں سے
بغاوت عظمت رفتہ کے اوپر رونے والوں سے

بغاوت دور حاضر کی حکومت سے ریاست سے
بغاوت سامراجی نظم و قانون و سیاست سے

بغاوت حریت کے دیوتا کا آستانہ ہے
بغاوت عصر حاضر کے سپوتوں کا ترانہ ہے

سردار نے جھوٹی تہذیب وتمدن ،عظمت رفتہ پررونے والوں، بےحس حاکم، مفلسی ومذہبی علامتوں کے ساتھ ماضی کی پارینہ داستانوں اوردورحاضر کے سیاسی افکار سے اعلان بغاوت کیا ہے۔نظم ''بغاوت'' متعلق رفعت سروش کا خیال ہے:

> ''اس نظم میں پرانی تہذیب، سرمایہ داری، اساطیری انسانوں، موجود حکومت، مسخ شدہ مذہب، ہر چیز سے بغاوت کا اعلانیہ ہے۔بغاوت صرف ایک انسان سے نہیں ہے۔ترانۂ بغاوت کو وہ عصر حاضر کا ترانہ قرار دیتے ہیں۔'' [1]

سردار جعفری کا اپنا ایک الگ ہی رنگ ہے جو مخدوم سے کافی مختلف ہے۔ان کا اپنا اسلوب ہے جو سب سے جداگانہ ہے۔مخدوم کی انقلابی شاعری بھی رومانیت کے اثر سے خالی نہیں ہے۔

ترقی پسند شعرا کے یہاں عورت کا الگ ہی تصور ہے۔کلاسکی شاعری میں عورت محض عشق و محبت کا ایک سامان ہے۔اس کا وجود عشق و عاشقی تک ہی محدود تھا، کلاسکی شعرا نے ان کی جمالیات، ناز وادا، خوبصورت رویے کو شاعری کا موضوع بنایا تھا لیکن ترقی پسند شعرا کے یہاں پہلی بار عورت کا ایک منفرد تصور ہمارے سامنے نظر آتا ہے۔اب وہ گھر کی چاردیواری میں قید نہیں رہ گئی بلکہ مرد کے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کی حقدار ہے۔معروف نقاد شارب رُدولوی اپنے مضمون ''ترقی پسند نظم کی فکری بنیادیں'' میں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''ترقی پسند شاعری کا محبوب کا تصور کلاسکی شاعری کے محبوب کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ترقی پسند شاعری میں محبوب صرف رفیق عیش یا رفیق شب ہی نہیں، جدوجہد کا شریک اور جہاد زندگانی میں رفیق سفر ہے۔ترقی پسند نظم نے عورت کی ایک نئی تصویر پیش کی جس سے ادب بڑی حد تک ناواقف تھا۔'' [2]

مخدوم کے یہاں عورت کا تصور کلاسکی شاعری میں ابھرے عورت کے تصور سے قدرے

---

[1] (درد کا ساحل۔بہ یاد علی سردار جعفری مشمولہ۔ایوان اردو۔علی سردار جعفری نمبر۔ستمبر 2000 جلد 14 شمارہ۔5 نئی دہلی۔ص:36)

مختلف ہے۔ان کے یہاں دو نظمیں ''ساگر کے کنارے'' اور ''تلنگی'' میں انہوں نے بالکل نئے انداز میں عورت کے حسن کی تصویر کچھ اس طرح کھینچی ہے جیسے وہ ایک مصور ہوں۔نظم ''ساگر کے کنارے'' میں لڑکیوں کا ساگر کے کنارے پانی بھرنا،اوراس نازو انداز سے گگری کو سر پر لے کر چلنا،ایسا لگتا ہے دنیا کا سارا حسن آج ان میں سمٹ آیا ہے ۔

انگڑائیاں لیتا ہوا طوفان جوانی
ملتا ہوا آنکھیں اٹھا فتنوں کا جگانے

کچھ لڑکیاں آنچل کو سمیٹے ہوئے بر میں
گگری لئے سر پر چلیں پانی کے بہانے

چلتی ہیں اس انداز سے دامن کو سنبھالے
صدقے ہوئی شوخی تو بلائیں لیں ادا نے

دوسری نظم ''تلنگن'' میں انہوں نے تلنگن لڑکیوں کی ہنسی ٹھٹھولی اور قہقہوں کا ذکر بڑے ہی شاندار انداز میں کیا ہے جو کھیت کے مینڈوں پہ بل کھاتی ہو یہ چلتی ہیں۔اپنے نرم اور شیریں قہقہوں کو اس طرح برساتی ہیں گویا پھول کی بارش ہورہی ہو۔وہ لڑکیاں بڑی نٹ کھٹ اور شریر ہیں لیکن ہمارے ہندوستانی دیہات کی تہذیب کی مثال ہیں۔ہندوستانی دیہات کی بھی ایک تہذیب ہے، یہاں کی لڑکیاں خواہ شرارتی اور بے باک ضرور ہیں لیکن کسی غیر مرد کی موجودگی میں وہ اپنے دائرے میں رہتی ہیں اور تہذیب سے پیش آتی ہیں۔جب ان چنچل لڑکیوں کو غیر مرد کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنا گانا بند کردیتی ہیں ۔

پھرنے والی کھیت کے مینڈوں پہ بل کھاتی ہوئی
نرم و شیریں قہقہوں کے پھول برساتی ہوئی

کنگنوں سے کھیلتی ، اَوروں سے شرماتی ہوئی
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو ، گائے جا

ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

مخدوم کے یہاں ایک طرح سے روایتی انداز ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے برعکس مجاز کے یہاں عورت کا تصور ایک نئے پیکر میں ڈھل کر سامنے آتا ہے۔ان کی نظم ''نوجوان خاتون سے'' میں عورتوں کو صرف ان کی ذمہ داریوں کا نہیں بلکہ ان کی اہمیت کا بھی احساس دلایا ہے۔انہوں نے پہلی بار عورت کو پردے اور گھر کی چار دیواری سے باہر نکالا ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ جنگ آزادی میں بھی برابر کا شریک کیا ہے۔انہوں نے سماج کی کشمکش،محبت کی راہ میں حائل دشواریوں کو دیکھ کر اپنی تصوراتی عورت کو شعور کی روشنی بخشی ہے اور اسے مسائل زمانہ سے دوچار ہونے کے مواقع اور دعوت دے رہے ہیں۔اس کی دنیا کی وسعت کو قصر و محل سے بڑھا کر ارض و سما تک پہنچا دیتے ہیں ۔

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا

ترا زیر نگیں گھر ہو ،محل ہو ، قصر ہو کچھ ہو
میں یہ کہتا ہوں تو ارض و سما لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے کا ٹیکہ مرد کی قسمت کا تارا تھا
اگر تو ساز بیداری اٹھا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

ترقی پسند شعرا نے اپنے محبوب کو بھی ایک خاص محبوب بتایا ہے جو روایتی محبوب کی طرح عام نہیں ہے۔وہ صرف عشق و محبت تک محدود نہیں ہے بعض اوقات وہ اپنے محبوب کو بغاوت اور انقلاب کی تلقین کرتے ہیں۔علی جواد زیدی اپنی نظم ''شرائط'' میں دلہن کے لیے کچھ شرطیں رکھی ہیں ۔

بجا کے کھیل رہا ہوں شباب سے اپنے
بجا کہ دن میری شادی کے بھی ہیں آئے ہوئے

خطا معاف کہ جچتی نہیں نگاہوں میں
یہ دیویاں پس چلمن نظر جھکائے ہوئے

مجھے تو ہم دم و ہمراز چاہئے ایسی
جو دست ناز میں خنجر بھی ہو چھپائے ہوئے

نکل پڑے سر میداں اڑا کے آنچل کو
بغاوتوں کا مقدس نشاں بنائے ہوئے

اٹھا کے ہاتھ کہے انقلاب زندہ باد
لہو سے مثل دلہن مہندیاں رچائے ہوئے

سردار جعفری کے یہاں بھی عورت کا احتجاجی رویہ پیش کیا گیا ہے۔ان کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' میں جاوید اور مریم کی گفتگو کے ذریعے عورت کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسری تصویر میں جاوید کو حسن ومحبت کے ترانے گاتے ہوئے پیش کیا گیا ہے جس میں جاوید عورت کو محبت کی منزل قرار دیتا ہے۔اس پر مریم یہ کہتی ہے کہ عورت محبت کی منزل تو ہے لیکن عورت کے اور بھی کئی روپ ہیں ۔

یہ مانا محبت کی منزل ہے عورت
تڑپتا مچلتا ہوا دل ہے عورت
کبھی جام بن کر چھلکتی ہے عورت
کبھی اشک بن کر چمکتی ہے عورت

وہ بس چند لمحوں کی ہم دم نہیں ہے
کہ عورت فقط شہد و شبنم نہیں ہے

تبسم نہیں صرف ، تلوار بھی ہے
وہ نغمہ نہیں صرف جھنکار بھی ہے

محبت کی مسند پہ حسن و جوانی
شجاعت کے میداں میں جھانسی کی رانی

نیا رنگ اور روپ دیتی ہے عورت
نئی شکل میں ڈھال لیتی ہے عورت

یہاں سردارجعفری مخدوم سے ایک قدم آگے نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں عورت کا جو تصور ہے وہ مخدوم کے بالکل مختلف ہے۔لیکن سردارجعفری کی شاعری میں ایک بہت بڑی خامی ہے جہاں مخدوم بازی لے جاتے ہیں۔وہ ہے دہراؤ(Repeatation)۔سردارجعفری کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں ایک ہی موضوع یا ایک ہی فکر کو باربار دہرایا گیا ہے۔جس کو پڑھنے سے بعض اوقات اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔بعض نظمیں اشترا کی نظریات سے بھری پڑی ہیں،بعض نظمیں بغاوت کا نعرہ بلند کررہی ہیں۔کہیں یلغار ہے تو کہیں سامراجی لڑائی۔انہوں نے موضوعات کا انتخاب بہت ہی عمدہ کیا ہے لیکن موضوعات کی تکرار نے ان کی نظموں کی اہمیت کو کم کردیا۔ہر بار اسی موضوع کا مطالعہ کرنے سے یہ لگتا ہے کہ اس میں نیا پن نہیں ہے اور یہ روایتی انداز میں لکھا گیا ہے۔

سردارجعفری کے یہاں اشترا کی نظریے کی بھرمار ہے۔ان کی نظمیں ''انقلاب روس''،''تعمیر نو'' ''استالن کتھا''،''اور''لینن'' تقریباً ایک ہی موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔اس میں روسی انقلاب، مزدوروں کا احتجاج، استالن اور لینن کے جانباز کارنامے وغیرہ کا ذکر ہے۔چاروں نظمیں اشترا کی نظام کی نقیب ہیں۔سردار کی دو نظمیں ''ارتقااورانقلاب''''اور تغیر'' بھی تقریباً ایک ہی موضوع سے مناسبت رکھتی ہے۔اس میں وہی انقلاب،تبدیلی،پرانے نظام کا خاتمہ اوراس کی جگہ نئے نظام کی خواہش،ظلم واستبداد کا خاتمہ اورآزادی کی امیدیں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔''سامراجی لڑائی''،''بغاوت''، اور''یلغار'' یہ بھی سردارجعفری کی انقلابی نظمیں ہیں۔سامراجی کے لیے آواز بلند کرنا ،بغاوت کے نعرے لگانا،ایک نئے سامراج کا خواب دیکھنااورآزادی کے جذبے کو عام کرناان نظموں کا خاص مقصد ہے۔اس طرح سے سردار کے یہاں مقصدی شاعری بڑی تعداد میں پائی جاتی ہے۔اتنا ہی نہیں ''فاشسٹ دشمن سپاہیوں کا گیت''اورسوویت یونین اور جنگ باز'' دونوں نظموں میں ایک ہی فکراور ایک ہی موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔اس میں سردار نے اپنی احتجاجی اورانقلابی فکر کو بڑے ہی منظّم طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کسی چیز کی حد سے سے زیادہ زیادتی ناقابل

برداشت ہوتی ہے خواہ وہ محبت ہو،نفرت ہو،حسد ہو یا پھر کچھ اور،اس کا مزہ پوری طرح سے کرکرا ہو جاتا ہے۔سردار کی نظم ''جیل کی رات'' اور''نیند'' میں وہی خیال ہیں اور فکر کی بھی تکرار ہے۔ایک نظم کا مطالعہ کرنے کے بعد دوسری نظم کا پورا منظر،موضوع اور وزن سب کچھ سمجھ میں آ جاتا ہے۔

سردار کے یہاں اس طرح کا دہراؤ ہے جب کہ مخدوم کے یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ سردار کی بہ نسبت مخدوم نے بہت کم لکھا ہے۔ان کا شعری سرمایہ کافی مختصر ہے لیکن مخدوم نے جو بھی لکھا ہے اس میں کہیں دہراؤ نہیں ہے۔ ہر ایک نظم نئے موضوعات اور نئی فکر کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اور یہی نیا پن ان کی نظموں کو خاص بناتا ہے جو سردار کے بالکل مختلف ہے۔سنجیدہ نقاد آل احمد سرور مخدوم محی الدین کی اس خصوصیت سے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''ان کے یہاں بڑی غنائیت پائی جاتی ہے۔ان کا فکر آخر تک جوان رہی۔انہوں نے اپنے کو دہرایا نہیں۔وہ جدید میلانات کا خاموش اثر برابر قبول کرتے رہے۔'' [1]

---

[1] (مخدوم محی الدین،مشمولہ،نیا آدم،مخدوم محی الدین نمبر، جلد 9 جنوری 1970، حیدرآباد ص:182)

نتائج اور حاصل مطالعہ

نتائج اور حاصل مطالعہ

سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی مزاحمتی واحتجاجی نظموں کا مطالعہ اور تقابلی جائزہ لینے کے بعد چند نتائج برآمد ہوتے ہیں۔سب سے پہلے تو دونوں شعرا کے یہاں موضوع کے لحاظ سے یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ان دونوں کی کئی نظموں کے عنوان بھی ایک ہی ہیں۔مثال کے طور پر''جوانی''، ''استالن''،''بنگال''،''اقبال''،''تلنگانہ''،''شاعر''،''غالب''،''نیند''،''نیا سال''،''جواہرلال نہرو''،'' وغیرہ چونکہ سردار جعفری اور مخدوم کا زمانہ ایک ہی ہے اس لیے اس دور کے مسائل بھی وہی ہیں اس لیے ان کی نظموں کے موضوع میں مماثلت ہے۔

سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی نظموں میں جس طرح موضوع کے لحاظ سے مماثلت ہے اسی طرح انفرادیت بھی ہے۔ان دونوں شعرا کے یہاں بہت سی نظمیں ایسی بھی ہیں جس کے عنوان تو ایک ہیں لیکن اس میں دونوں شعرا کے فکر وخیال الگ الگ ہیں۔کبھی مخدوم کے یہاں رومانیت دیکھی جاسکتی ہے تو کبھی سردار کے یہاں۔کبھی مخدوم کے یہاں اسی موضوع پر احتجاج بھی نظر آتا ہے تو کبھی سردار کے یہاں بھی یہی کیفیت ملتی ہے۔کبھی مخدوم کے یہاں ایک موضوع پر زور دیا گیا ہے تو کبھی سردار کے یہاں دوسرے موضوع پر۔اس طرح سے دونوں کی نظموں میں انفرادیت نظر آتی ہے۔حالانکہ اکثر ناقدین کا خیال ہے کہ تمام ترقی پسند شعرا کے یہاں موضوع اور طرز اظہار میں یکسانیت پائی جاتی ہے لیکن تحقیق وتنقید کی کسوٹی پر یہ خیال پوری طرح کھرا نہیں اترتا۔

دوسری بات جوان شعرا کے یہاں منفرد ہے وہ ہے طویل نظمیں۔سردار جعفری کے ''نئی دنیا کو سلام'' اور''پتھر کی دیوار''وغیرہ جیسی طویل نظمیں ہیں۔''نئی دنیا کو سلام''فرنگی ظلم سے پیدا شدہ تاثرات کا نتیجہ ہے۔اس کے کردار، کردار نہیں بلکہ علامتیں ہیں۔جن میں ایک باغی مرد جاوید اور اس کی بیوی ،مریم کی کہانی ہے جو برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔سردار جعفری اس نظم کے ذریعہ فرنگی ظلم کے خلاف ہندوستانیوں کی جدوجہد کو منظر عام پر لاتے ہیں۔اوراس طرح وہ علامتوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کو بیدار کرنے کی کوشش وسعی کرتے ہیں۔''ایشیا جاگ اٹھا'' بھی سردار کی طویل نظم ہے جسے

سردار نے سینٹرل جیل ناسک میں دوران اسیری تخلیق کیا تھا۔مخدوم کے یہاں اس طرح کی طویل نظمیں نہیں ہیں۔

مخدوم اور سردار کی دوسری نظموں کا موازنہ کرنے پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک ہی موضوع پر لکھی گئی نظموں میں سردار کے یہاں طوالت ہے اور مخدوم کے یہاں اختصار۔مثال کے طور پر سردار کی نظم ''تعمیر نو'' اور مخدوم کی ''جہان نو'' سردار کی جواہر لال نہرو'' اور مخدوم کی ''نہرو'' سردار کی ''سال نو'' اور مخدوم کی نظم ''نیا سال'' وغیرہ ایک ہی موضوع سے وابستہ ہے لیکن سردار کے یہاں بے جا طوالت ہے اور مخدوم کے یہاں اختصار۔خیر مخدوم نے اختصار اختیار تو کیا ہے مگر اس دوران انہوں نے اپنے پورے خیال کی کی وضاحت کی ہے اور بے جا طوالت کے ساتھ، بے جا الفاظ اور بے جا فکر سے بھی دامن بچایا ہے۔

اکثر ناقدین کا خیال ہے کہ ترقی پسند شعرا طرز اظہار اور لہجے میں یکسانیت کے شکار ہیں ۔یہ خیال بھی کچھ حد تک درست معلوم ہوتا ہے پر مکمل طور پر اس کی تائید نہیں کی جا سکتی۔ترقی پسند تحریک ایک انقلابی تحریک ہے اور اس سے وابستہ شعر وادب بھی انقلابی ہے۔اب انقلابی جذبات کے اظہار کے لیے بلند آہنگی لازم ہے اور اس بلند آہنگی کے باعث شعرا کے طرز اظہار اور لہجے میں سختی بھی آ گئی ہے۔لیکن یہ سختی پورے ترقی پسند شعرا کے یہاں نہیں ہے۔بعض شعرا تو سخت سے سخت موضوع کو بڑے نرم الفاظ اور نرم لب و لہجے میں پیش کرتے ہیں۔مثال کے طور پر فیض کو لے لیجئے۔ترقی پسند شعرا کی صف میں وہ منفرد لہجہ اور منفرد انداز بیان کے سبب اپنی الگ شناخت قائم کرتے ہیں۔سردار کے یہاں لہجے میں سختی زیادہ ہے، ان کی پوری شاعری ہی بلند آہنگی کی ترجمان ہے۔اس کے برعکس مخدوم کے یہاں یہ سخت مزاجی کم پائی جاتی ہے۔سردار کے یہاں انقلاب کی اپنی الگ شان ہے۔وہ بلند آہنگی،گھن گرج اور نعرہ بازی سے انقلاب کے منتظر ہیں اس کے برعکس مخدوم انقلاب کا انتظار خوش جمال محبوبہ کی طرح کرتے ہیں۔

ترقی پسند شعرا کے یہاں عورت کا ایک الگ تصور ہے۔کلاسیکی شاعری میں عورت محض عشق و عاشقی تک محدود ہے لیکن ترقی پسند شعرا کے یہاں وہ گھر کی چار دیواری میں قید نہیں رہ گئی بلکہ مرد کے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کی حقدار ہے۔مجاز اور علی جواد زیدی وغیرہ نے عورت کو پردے اور گھر کی چہار دیواری سے باہر نکالا ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ جنگ آزادی میں بھی برابر کا شریک کیا ہے۔لیکن مخدوم کے یہاں

عورت کا یہ روپ دیکھنے کونہیں ملتا۔ان کے یہاں عورت حسن کی دیوی ہے،تہذیب کا مجسمہ ہے جو بے باک تو ہے لیکن تہذیب کے دائرے میں پیش آتی ہیں۔اس کے برعکس سردار جعفری کے یہاں عورت کا احتجاجی روپ پیش کیا گیا ہے۔اپنی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' میں انہوں نے عورت کی عظمت پر روشنی ڈالی ہے۔عورت محض محبت کی منزل نہیں ہے اس کے اور بھی کئی روپ ہیں۔اگر وہ چاہے تو تلوار بھی اٹھا سکتی ہے اور میدان جنگ میں بھی اتر سکتی ہے۔شجاعت کے میدان میں جھانسی کی رانی کی مثال دے کر انہوں نے عورت کا احتجاجی روپ پیش کیا ہے۔

سردار جعفری کی شاعری میں ایک بات اور خاص ہے کہ سردار کے یہاں بعض جگہ دہراؤ (Repeatation) ہے۔سردار جعفری کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں ایک ہی موضوع یا ایک ہی فکر کو بار بار دہرایا گیا ہے۔جس کا مطالعہ کرنے سے بعض اوقات اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ بعض نظمیں اشتراکی نظریات سے بھری پڑی ہیں،بعض نظمیں بغاوت کا نعرہ بلند کر رہی ہیں۔کہیں یلغار ہے تو کہیں سامراجی لڑائی۔انہوں نے موضوعات کا انتخاب بہت عمدہ کیا ہے لیکن موضوعات کی تکرار نے ان کی نظموں کی اہمیت کو کم کر دیا ہے۔ ہر بار اسی موضوع کا مطالعہ کرنے سے یہ لگتا ہے کہ اس میں نیا پن ہی نہیں ہے اور یہ روایتی انداز میں لکھا گیا ہے۔

سردار کی نظمیں ''انقلاب روس''،''تعمیر نو''،''استالن کتھا''،''لینن'' وغیرہ تقریباً ایک ہی موضوع سے مناسبت رکھتی ہیں۔اس میں روسی انقلاب،مزدوروں کا احتجاج،استالن اور لینن کے جانباز کارنامے وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔چاروں نظمیں اشتراکی نظام کی نقیب ہیں۔اسی طرح سے دوسری نظمیں بھی ہیں جن میں سامراج کے لیے آواز بلند کرنا،بغاوت کے نعرے لگانا،ایک نئے سامراج کا خواب دیکھنا اور آزادی کے جذبے کو عام کرنا ان نظموں کا خاص مقصد ہے۔اس طرح ان کے یہاں مقصدی شاعری بڑی تعداد میں پائی جاتی ہے۔مخدوم کے یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔سردار کے مقابلے میں مخدوم نے بہت کم لکھا ہے۔ان کا شعری سرمایہ کافی مختصر ہے لیکن مخدوم نے جو بھی لکھا ہے اس میں کہیں دہراؤ نہیں ہے۔ ہر ایک نظم نئے موضوعات اور نئی طرز فکر کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اور یہی نیا پن ان کی نظموں کو خاص بناتا ہے جو سردار کے بالکل مختلف ہے۔

کتابیات

کتابیات

نمبر شمار	مصنف/مرتب	نام کتاب	مطبع/ناشر	سنہ اشاعت
1۔	(الف) آغا ظفر حسنین	مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	2006
2۔	ارتضٰی کریم	اردو ادب: احتجاج اور مزاحمت کے رویے	اردو اکادمی، لکھنؤ	2004
3۔	اختر بستوی	سیکولرزم اور اردو شاعری	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	1996
4۔	اختر حسین رائے پوری	ادب اور انقلاب	ادارۂ اشاعت اردو، حیدر آباد	1943
5۔	اسلم پرویز	بہادر شاہ ظفر	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	1986
6۔	اشفاق حسین	اردو شاعری میں سوشلسٹ رجحانات	اسرار کریمی پریس، الہ آباد	1986
7۔	الطاف حسین حالی	مسدس حالی	رام نرائن لال ارن کمار، الہ آباد	2002
8۔	الطاف حسین حالی	دیوان حالی	اردو اکادمی، دہلی	2006
9۔	انوباندھ اپدھیائے مترجم۔ اختر فاروقی	گاندھی جی کے مختلف روپ	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2011
10۔	ایوب واقف	علی سردار جعفری شخصیت اور شاعری	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	1984
11۔	(پ) پنڈت کنہیالال	جنگ آزادی 1857 تاریخ بغاوت ہند (مسمہ بہ) محاربہ عظیم	بک کارپوریشن، دہلی	2008
12۔	پی۔ سی۔ جوشی	انقلاب 1857	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	1998
13۔	(ت) تبسم کاشمیری	اردو ادب کی تاریخ ابتداء سے 1857 تک	ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، دہلی	2009

14۔ (ج) جمیل جالبی تاریخ ادب اردو، جلد دوم ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی 2013

15۔ (ح) حامدی کاشمیری انتخاب غزلیات قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 2003

16۔ (خ) خلیق انجم مرزا محمد رفیع سودا قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 2003

17۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 2007

18۔ (د) داؤد اشرف مخدوم ایک مطالعہ انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش 1967

19۔ (ر) رشید حسن خاں زٹل نامہ انجمن ترقی اردو دہلی 2003

20۔ راج بہادر گوڑ ادبی جائزے دنیا پبلی کیشن، دہلی 1990

21۔ رام لعل نابھوی چکبست ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1992

22۔ (س) سجاد ظہیر روشنائی پرائم ٹائم پبلی کیشنز، لاہور 2006

23۔ سلیمان اطہر جاوید تنقیدی شعر نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد 1971

24۔ سلامت اللہ تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 1998

25۔ سید عابد حسین قومی تہذیب کا مسئلہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 1998

26۔ سید محمد عقیل رضوی نئی فکریں خیاباں پبلشر، الہ آباد 1953

27۔ سید محمد عقیل رضوی ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ ادارۂ نیا سفر، الہ آباد 2009

28۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب ہماری شاعری ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی 2008

29۔ (ش) شاہد ماہلی فیض احمد فیض: عکس اور جہتیں معیار پبلی کیشنز، دہلی 2011

30۔ شیخ حسام الدین	انقلاب 1857: تصویر کا دوسرا رخ	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2006
31۔ (ط) طاہرہ پروین	ورق تمام ہوا	انجمن تہذیب نو پبلی کیشنز، الہ آباد	2010
32۔ طاہرہ پروین	نظمیں پڑھتے ہیں	رجحان پبلی کیشنز، الہ آباد	2012
33۔ (ع) عبادت بریلوی	روایت کی اہمیت	انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان	1953
34۔ عزیز احمد	ترقی پسند ادب	ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد	1945
35۔ عقیل احمد صدیقی	جدید اردو نظم: نظریہ و عمل	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	1990
36۔ علی احمد فاطمی	کلیات سردار جعفری	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2004
37۔ علی جاوید	افہام و تفہیم	رائٹرس گلڈ انڈیا لمیٹیڈ نئی دہلی	2004
38۔ علی سردار جعفری	ترقی پسند ادب	انجمن ترقی اردو علی گڑھ	1957
39۔ علی سردار جعفری	لکھنؤ کی پانچ راتیں	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2013
40۔ (غ) غلام ربانی تاباں	تاریخ تحریک آزادی ہند جلد دوم	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2001
41۔ (ف) فاروق ارگلی	کلیات مخدوم محی الدین	فرید بکڈ پو (پرائیوٹ) لمیٹیڈ دہلی	2007
42۔ فرمان فتحپوری	اردو شاعری کا فنی ارتقا	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	2014
43۔ فرہنگ آصفیہ	جلد چہارم	نیشنل اکادمی۔ دہلی	1974
44۔ (ق) قاضی محمد عدیل عباسی	تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2012

45۔ قاضی محمد عدیل عباسی | تاریخ تحریک آزادی ہند جلد سوم | قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی | 2001

46۔ (ک) کالی داس گپتا | علی سردار جعفری اپنی بہنوں کی نظر میں | ساکار پبلیشرز پرائیوٹ لمٹیڈ بمبئی | 1990

47۔ کلیم الدین احمد | انگریزی اردو لغت جلد پنجم | قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی | 1998

48۔ (گ) گوپی چند نارنگ | ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری | قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی | 2003

49۔ (م) مرزا ظفر الحسن | عمر گزشتہ کی کتاب: فیض احمد فیض اور مخدوم کی زندگی اور تخلیقات | ادارۂ یادگار غالب، کراچی غالب | 1978

50۔ مجیب اشرف | قدیم ہندوستان کی سیکولر روایات | نئی آواز، جامعہ نگر، دہلی | 1988

51۔ مجیب اشرف | جدید ہند کے سیکولر معمار | مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی | 1989

52۔ محمد عبداللہ خاں خویشگی | فرہنگ عامرہ | کتابی دنیا، دہلی | 2011

53۔ محمد حسن | اردو ادب میں رومانوی تحریک | عاکف بکڈ پو۔ دہلی | 1999

54۔ محمد حسین آزاد | آب حیات | ا تر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ | 2003

55۔ مخدوم محی الدین | سرخ سویرا | اشاعت گھر، حیدر آباد | 1944

56۔ منظر اعظمی | اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ | اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ | 2009

57۔ (ن) نثار احمد فاروقی | میر تقی میر | قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی | 2004

58۔ (ن) نعیم احمد | شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ | ادبی اکادمی، علی گڑھ | 1979

59۔ نوالحسن نقوی | فن تنقید اور اردو تنقید نگاری | ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ | 2007

60۔	نوالحسن نقوی	اقبال: شاعر ومفکر	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	2015
61۔	(و) وزیر آغا	اردو شاعری کا مزاج	جدید ناشرین، لاہور	1965
1۔	De Bonald	Lateratue and socify	oxford Press London	1962
2۔	Dr Abdul Haq	The Standard English Urdu Dictonary	Anjuman Taraqqi Urdu (Hind) New Delhi	2005
3۔	Dr.SureshKumar& Dr.Ramnath Sahai	oxford English-English Hindi Dictonary	oxford University Press New delhi	2008
4۔	Harper Collins	Collins Cobuild English Dictonary	Inda Pvt.Lmt New Delhi	1991

رسائل وجرائد

نمبر شمار	رسالے کا نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1۔	آج کل۔سردار جعفری نمبر	دہلی	اکتوبر-2001
2۔	ادیب	جامعہ اردو علی گڑھ	جلد6۔شمارہ2 -1982
3۔	ارتقاء۔مخدوم محی الدین نمبر	ارتقا مطبوعات کراچی	شمارہ48۔جون-2009
4۔	ایوان اردو۔علی سردار جعفری نمبر	دہلی	جلد14۔شمارہ5 ستمبر-2000
5۔	ایوان اردو	اردو اکادمی دہلی	نومبر-2015
6۔	ذہن جدید	دہلی	جلد16۔شمارہ47۔مارچ تا مئی-2007
7۔	ذہن جدید۔مخدوم محی الدین نمبر	دہلی	جلد17۔شمارہ49 ستمبر تا نومبر-2007
8۔	سہیل۔علی سردار جعفری نمبر	کولکاتا	جلد2۔شمارہ10/9 ستمبر تا اکتوبر-2014
9۔	شاعر	ممبئی	جلد47۔شمارہ۔4/5۔1976
10۔	عالمی اردو ادب	عالمی اردو ادب دہلی	نومبر-2011
11۔	عصری ادب	نئی دہلی	شمارہ29/30-1977
12۔	غالب نامہ۔شیخ غلام ہمدانی مصحفی نمبر	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	جلد26۔شمارہ1۔جنوری-2005

13۔	غالب نامہ۔ ہمارا ادبی اور تہذیبی ورثہ	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	جلد30۔شمارہ2۔جولائی-2008
14۔	فکروتحقیق	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	اکتوبرتاستمبر-2001
15۔	فکروتحقیق۔مخدوم محی الدین نمبر	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	جلد11۔شمارہ2 اپریل سے جون-2008
16۔	فکروتحقیق۔فیض احمد فیض نمبر	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	اپریل تاجون-2011
17۔	فکرونظر۔غالب نمبر	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	مارچ-2000
18۔	کتاب	لکھنؤ	مارچ-1966
19۔	کتاب نما۔علی سردار جعفری نمبر	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی	2011
20۔	گفتگو۔ترقی پسند ادب نمبر	بمبئی	1980
21۔	نیا آدم۔مخدوم محی الدین نمبر	حیدرآباد	جلد9۔جنوری-1970
22۔	نقوش۔۱۰۲	لاہور	مئی-1965
23۔	نوائے ادب۔مخدوم محی الدین نمبر	بمبئی	جنوری تامارچ-2004
24۔	نیادور	لکھنؤ	مارچ-2002
25۔	نیادور	لکھنؤ	ستمبر،اکتوبر-2012